توصیف ایزد

ذرا کیمبرج تک

UrduDost Library
UrduDost.com

ذرا کیمبرج تک

توصیف ایزد
tauseef_aized@yahoo.com

کلاسیک
42- دی مال، لاہور

UrduDost Library UrduDost.com

آغا امیر حسین

کلاسیک
ناشر و تاجر
چوک ریگل۔ ۴۲ دی مال لاہور ۵۴۰۰۰

فون:37312977 فیکس:37323963
E-mail:classicpublisher@yahoo.com
E-mail:classicpublisher@hotmail.com
www.classicpublishers.com

جملہ حقوق محفوظ O 2011ء O قیمت: روپے

طابع:
سید ندیم حسین آغا
سپوتنک پرنٹرز
13-C فین روڈ لاہور
موبائل:0300-4442227
فون: 92-42-37355957
ای میل: nadeemagha8@hotmail.com

UrduDost Library UrduDost.com

اپنی تحریر کو کسی سے منسوب کرنیکا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ سوائے 'منسوب الیہٗ' ساری دنیا آپ کی دشمن بن جائے۔ یہ گزارشات والدِ گرامی کے نام منسوب نہ کیں تو قبلہ قبرستان سے ہمراہ قافلۂ بدارواح رات کے پچھلے پہر خواب میں وارد ہوں گے اور صرف گوشمالی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ زدوکوب بھی کریں گے۔ والدہ محترمہ کو انتساب میں نظرانداز کیا تو وہ اسے سراسر ہماری زوجہ کی کارستانی سمجھیں گی اور کچھ غلط بھی نہیں سمجھیں گی۔ شریک حیات کو شاملِ انتساب نہ کیا تو یہ تحریر ساری عمر چُھپانا پڑے گی۔ اور راز افشا ہونے کی صورت میں معافی کے بعد تلافی یعنی برسوں شاپنگ کروانا پڑے گی۔ بچوں کا نام شامل نہ کر کے ہم اپنے سوئم اور چہلم سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ اساتذہ کرام کو فہرستِ انتساب میں داخل نہ کیا تو وہ انتقاماً اپنے شاگردوں کو نہ پڑھانے کے اصولی مؤقف پر مزید سختی سے عمل پیرا ہو جائیں گے۔ دوستوں کا نام شامل نہ کیا تو وہ ہمیں حلقہ دوستاں سے خارج کر دیں گے اور ہمیں اُن کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ایک نئی کتاب لکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی جو اُن کی نیک نامی، ہماری ہنسی اور ناشر کی آمدنی کا سبب بنے گی۔ تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو اپنے ان تمام پیاروں کے نام کر دیا جائے جنہوں نے اس عاجز کی راہ کے کانٹے چنتے ہوئے اپنے ہاتھ زخمی کروا لئے۔

توصیف ایزد

UrduDost Library UrduDost.com

ترتیب

پیش لفظ..................5
لندن نظارہ..................8
گیسٹ ہاوس..................40
کیمبرج شہر..................58
کیمبرج یونیورسٹی..................89
کیمبرج کے کالج..................108
نوبل انعام یافتگان..................161
میوزیم اور آرٹ گیلریاں..................174
کیمبرج سے تعلیم حاصل کرنے والی پاکستانی شخصیات..................184

UrduDost Library
UrduDost.com

پیش لفظ

یہ کتاب کیوں لکھی۔ اس بارے میں ہم نے ، کتاب لکھنے کے بعد، خوب غور وخوض کیا۔ ایک ہی محرک سمجھ آیا۔ اور وہ کیمبرج یونیورسٹی میں ہمارے میزبان پروفیسر اور نگرانِ تحقیق کی نااہلی ہے۔ اگر وہ ہمارے اوپر کام کا اتنا بوجھ لاد دیتے کہ ہمیں شب وروز کا پتہ ہی نہ چلتا تو ہم یقیناً اس قابل نہ ہوتے کہ کتاب لکھ سکتے۔ ہوا کچھ یوں کہ ہمارا خیال تھا کہ کیمبرج کے قیام کے دوران ہمیں اپنا مضمون پڑھنے کے علاوہ، انگریزی سیکھنے کا موقع بھی مل جائے گا لیکن ہمارے میزبان پروفیسر کا تعلق سکھ مذہب سے تھا۔ اگر بات صرف مذہب تک محدود ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ستم یہ ہوا کہ سردار صاحب کی جنم بھومی انگلستان تھی اور انہیں ہر لحظہ اپنی زبان وثقافت سے کٹے رہنے کی کسک محسوس ہوتی رہتی۔ ہمیں ملتے ہی انہیں اپنی پیدائش سے رکی ہوئی طبع کو رواں کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اور انہوں نے پنجابی زبان کا لامحدود استعمال شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وطن واپسی پر احباب کو شک گزرا کہ ہم کیمبرج سے نہیں امرتسر سے واپس آئے ہیں۔ ہر روز صبح سویرے سردار صاحب ایک آدھ گھنٹہ اپنی ثقافتی پیاس بجھاتے اور پھر سارا دن وہ اُسی لسانی سرشاری اور ہم فراغت سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ معلوم نہیں سردار صاحب ہمارے قیامِ کیمبرج کے بعد کام نہ کرنے کے لئے کیا کرتے ہوں گے۔ ہمیں چونکہ فراغت ہی فراغت تھی تو کیا کرتے۔ آپ سوچیں گے کہ فرصت کے لمحات میں کوئی اور پُر لطف کام کیوں نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ فراغت میں سب سے بہترین کام فارغ رہنا ہی ہوتا ہے۔ عرض یہ ہے کہ ہمیں وطن واپس آنے کے بعد جو فرصت میسر آنا تھی، ہم نے اس کا علاج ڈھونڈا۔ کتاب لکھنے کے بعد اسکی اشاعت اور پھر دوستوں کو اس

UrduDost Library UrduDost.com

کتاب کے مطالعہ کی ترغیب دینے اور منت سماجت کرنے میں ہمیں مستقبل کی فرصت کا مشغلہ نظر آیا۔ پس کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔

یہ کتاب کیمبرج میں کی گئی غلط کاریوں کی نامکمل داستان ہے۔ ہوسکتا ہے کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تحریر کسی کو تعلیم و تحقیق پر اکسانے کے لئے لکھی گئی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر گز نہیں ہے۔ کیونکہ کیمبرج یونیورسٹی کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں جتنا کام کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہاں پر پیدا ہونے والا علم انسانوں کی خدمت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ گویا جنہوں نے یہ علم پیدا کیا ہے وہ انسانوں کے خادم ہیں اور ہم جیسے لوگ جنہوں نے یہ علم استعمال کیا ہے وہ مخدوم ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مخدوموں کو یہ تحریک دے دیں کہ وہ خادم بن جائیں اور اپنے ارفع مقامِ مخدومی سے گر جائیں۔ جو مقام ہم نے بمشکل دس صدیوں میں حاصل کیا ہے، اس کی اہمیت اور وقعت سے وہی لوگ واقف ہیں جنہوں نے یہ منزل پانے کے لئے صدیوں کا فاصلہ طے کیا ہے۔ ایسے ارفع مقام کو ترک کر دینے کی تحریک دینا بلا شبہ بہت بڑی نامعقولیت ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے کچھ صفحات پڑھتے ہوئے آپ کو کیمبرج کے چند لوگوں کا طرزِ زندگی اخلاقیات سے گرا ہوا لگے۔ ہمیں بھی کئی مرتبہ یہ تاثر محسوس ہوتا ہے لیکن جس واقعے یا صفحے پر یہ گمان ہوتا ہے، ہم اسے دوبارہ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ مذکورہ طرزِ عمل واقعی اخلاقیات سے گرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خدشہ ہے کہ آپ ہم سے بہتر اردو جانتے ہوں گے اور ہماری تحریر میں زبان کی غلطیوں کیوجہ سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوں جائیں گے۔ یہ صورتِ حال آپ کے لئے پریشانی اور ہمارے لئے مسرت کا باعث ہوگی کیونکہ ہم اردو روزمرہ و محاورہ سے ناواقف ہیں۔ اور پنجابی زبان کا اردو میں لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتے ہیں۔ اس بدچلنی سے جو زبان معرضِ وجود میں آتی ہے، وہ اردو ہوسکتی ہے نہ پنجابی۔ ان دونوں کے درمیان میں شائد کچھ ہو، سندھی کہہ لیں۔ جب اردو زبان میں پنجابی کے الفاظ ملائیں جائیں تو اسے پنجاب میں گلابی اردو اور کراچی میں پنجابی اردو کہتے ہیں۔ اہلِ زبان ایسی اردو کے استعمال کے سخت خلاف ہیں۔ لیکن اگر پنجابی زبان کے الفاظ کا تناسب زیادہ ہو جائے۔ تو یہ اردو میں پنجابی کی نہیں، پنجابی میں اردو کی ملاوٹ ہوتی ہے

UrduDost Library UrduDost.com

جس پر اہلِ پنجاب ٹھٹھے کرتے ہیں اور ہرگز سیخ پا نہیں ہوتے۔اسی لئے ہماری پوری کوشش ہے کہ پنجابی میں اردو کی ملاوٹ کر کے اہلِ زبان کی زبان سے بچ جائیں۔اگر آپ زبان کے علاوہ اس کتاب میں مہیا کی گئی معلومات کو بھی ناقص سمجھیں۔تو اس صورتِ حال میں مشورہ یہ ہے کہ آپ اس کتاب کے اپنے نسخے پر جلد مٹ جانے والی روشنائی سے، اپنے علم کے مطابق، اغلاط درست کر لیں۔کیونکہ اپنی علمی صحت برقرار رکھنا آپ کا حق ہے۔تاہم ہماری غلطیاں اور ان کی تصحیح ہرگز دوسروں کو نہ بتائیں کیونکہ یہ کم علمی کی اصلاح نہیں، پروپیگنڈا ہوگا۔

توصیف ایزد

UrduDost Library UrduDost.com

لندن نظارہ

کیمبرج کا نام سنتے ہی نجانے کیوں ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اداسی، حسد، رشک، اپنی علمی کم مائیگی، آنکھوں میں چمک، بدن میں اضطراب۔۔۔۔اور نجانے کیا کچھ۔احباب ان ساری کیفیات کو ہذیان سے تعبیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کیفیت پیدائشی اور لا علاج ہے۔ ہمارا اصرار ہے کہ یہ روگ پیدائشی ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم نے بڑی تگ و دو سے اور نہایت عرق ریزی سے پالا ہے اور یہ کہ مطالعے اور غور وخوض سے جو آلائشیں جنم لیتی ہیں اور نمو پاتی ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے۔ دوستوں کا یہ خیال بھی بڑی حد تک درست ہے کہ درسگاہوں اور کتابوں کی باتیں درحقیقت عملی زندگی سے فرار کی نشانی ہے۔ جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فرار عملی زندگی کے علاوہ دوستوں سے بھی ہے جس بنا پر ہم اسے مفید ہی نہیں بلکہ پسندیدہ بھی تصور کرتے ہیں۔ وجہ جو بھی ہو، ہم برسوں یہ خواب دیکھتے رہے کہ تحصیل علم کی غرض سے کیمبرج جائیں گے۔ سچ کہنا، اگر چہ، فساد کو دعوت دینا ہے لیکن پھر بھی یہ حماقت کررہے ہیں کہ ہمیں چند ایک موضوعات، جن کا ذکر آپ سے نہیں کیا جاسکتا، کے علاوہ پڑھنے لکھنے سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ تو پھر کیمبرج کس لئے جانا چاہتے تھے؟ بس دوسروں کو کتابوں اور تجربہ گاہوں میں سر کھپاتے دیکھیں گے۔ مشہورِ زمانہ قدیم عمارات اور کالج وغیرہ گھومیں گے، دریائے کیم کے کنارے بیٹھ کے دھوپ سے لطف اندوز ہوں گے اور ساتھ ہی گوریوں کے حسن کی تمازت محسوس کریں گے۔ اور واپس آکر بر محل، بے محل حقیقی وخیالی داستانیں سنا کر داد اور حسد سمیٹیں گے۔ برسوں کیمبرج جانے کے لئے تڑپتے رہے۔ کئی برس پہلے جب ہم نے اپنی سرکاری اور گھریلو ذمہ داریوں سے فرار ہونے کے

UrduDost Library UrduDost.com

لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تو کیمبرج سے رجوع کیا۔ ہمارا پختہ خیال تھا کہ ہم نے دنیا کے تمام گھمبیر اور لاینحل مسائل حل کر دیتے ہیں، تو کیوں نہ کیمبرج کو بھی ہماری نیک نامی کی بدولت کچھ فائدہ ہو جائے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہمیں کیمبرج سے جواب موصول ہونے میں تاخیر ہوئی اور اسی اثنا میں جاپانیوں نے ہماری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے یونیورسٹی میں داخلے کے علاوہ خطیر مشاہرے کی پیشکش کر دی۔ ہم نے فوراً جاپان جانے کی حامی بھر لی تاکہ کیمبرج کا جواب موصول نہ ہونے کی صورت میں کہیں جاپان بھی ہماری صلاحیتوں سے محروم نہ ہو جائے اور نتیجتاً ہم جاپان اور کیمبرج دونوں سے محروم ہو جائیں۔ ابھی ہم جاپان پدھارنے کے لئے سامان باندھ ہی رہے تھے کہ کیمبرج والوں کو خبر ہوئی اور انہوں نے آناً فاناً ہمیں دعوت نامہ بھجوا دیا۔ ہم چونکہ جاپان جانے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے تو وہیں چلے گئے۔ ہمیں کیمبرج نہ جانے کا بے حد قلق رہا اور یقین کی حد تک گمان ہے کہ کیمبرج کو بھی اس واقعے کا بے حد افسوس ہوا ہوگا، اگرچہ اس نے ذرا بھی اس کا اظہار نہ کیا۔ کچھ انسانوں کی طرح کیمبرج یونیورسٹی بھی اظہارِ جذبات میں کنجوس واقع ہوئی۔ جاپان میں دورانِ تعلیم، ہم ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے تو کیمبرج اور آکسفورڈ بھی گھوم آئے۔ جس سے اشتیاق میں مذید اضافہ ہو گیا۔ جاپان سے وطن واپس آئے تو پھر ہمیں سیاحت عرف تعلیم و تحقیق کے لئے آسٹریلیا جانے کا موقع مل گیا۔ وہاں گئے، قیام پذیر رہے، واپس آئے مگر کیمبرج کی یاد دل سے محو نہ ہوئی۔ نوجوانی کا عشق ایسا ہی ہوتا ہے۔ وطن واپس آتے ہی پھر کیمبرج سے روابط بحال ہو گئے۔ غالباً اس مرتبہ اسے ماضی کی بدمزگی یاد تھی۔ چنانچہ کچھ زیادہ تگ و دو کئے بغیر ہی معاملات طے پا گئے اور ہم کیمبرج جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

لاہور بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پہنچے۔ اہلِ خانہ ہمراہ آئے۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ خدا حافظ کہا۔ اور ہم ائر پورٹ کے اندرونی حصے کی طرف گامزن ہوئے۔ اندر جا کر دیکھا کہ بدنظمی اپنے عروج پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار مسافر ہونگے اور کوئی دو، تین جہاز روانگی کے لئے تیار کھڑے تھے۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ محض دو، تین پروازوں کے لگ بھگ ایک ہزار مسافروں کو

UrduDost Library UrduDost.com

بھگتنا اسقدر مشکل کام ہے۔ مسافروں نے کس سے رابطہ کرنا ہے۔ بورڈنگ پاس کہاں سے ملے گا، سامان کہاں سے جہاز میں لادا جائے گا اور کیا اسی پرواز میں جائے گا، جس میں ہم جا رہے ہیں یا ہم مغرب کی طرف جائیں گے اور سامان مشرق کی طرف۔ کچھ خبر نہیں۔ لاؤنج کا فرش نہایت خوبصورت ٹائلوں سے بنایا گیا ہے لیکن جا بجا کاغذ بکھرے پڑے ہیں۔ عملے کے بے شمار لوگ ہاتھ باندھے صفائی کرنے والوں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ جہاں ایک قطار ہونی چاہیئے، مسافروں نے اپنے وجدان سے کام لیتے ہوئے دو بنا رکھی ہیں۔ ہم نے بڑی لجاجت سے عملے کے ایک فرد سے اعلیٰ نظم و ضبط کی وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ شکر کریں کہ آپ بروز منگل تشریف نہیں لائے ورنہ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرماتے کہ نظم و ضبط کیا ہوتا ہے کیونکہ اس دن پانچ بین الاقوامی پروازیں روانہ ہوتی ہیں۔ گویا صرف ہمارے خیال میں ہی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ فی الحقیقت سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ یہ ارشاد سننے کے بعد ہم دل ہی دل میں سخت نادم ہوئے اور اپنی گوشمالی بھی کی۔ ہم ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ سب کچھ تو ٹھیک ہو رہا ہے۔ مزید ارشاد فرمایا، ائرپورٹ کی عمارت کا ڈیزائن درست نہیں ہے اور لاؤنج کی چوڑائی کم ہے۔ لیکن یہ تو نیا ائرپورٹ بنا ہے۔ اربوں، کھربوں کی لاگت آئی ہوگی اور پاکستان میں جدید ترین تصور کیا جاتا ہے۔ ہم کسمسائے۔ فرمانے لگے، یہ سب تو ایسا ہی ہے جیسے آپ کہہ رہے ہیں مگر آپ خود دیکھ لیجیے جگہ کم ہے۔ بات مطلقاً غلط بھی نہ تھی۔ خیر اب تو عمارت بنے بھی کئی سال بیت چکے ہیں۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ اور اگر ہم عین تعمیر کے وقت یہاں آ دھمکتے پھر بھی یہی کچھ ہوتا۔ چھوڑیئے، ہم آگے بڑھے۔ پی۔ آئی۔ اے کے لندن پرواز ڈیسک پر خوبرو نوجوان آفیسر نے شائستگی سے خوش آمدید کہا۔ سامان کا وزن کیا تو مقررہ حد سے کافی کم تھا۔ ہم نے درخواست کی کہ ہمیں کھڑکی والی نشست دی جائے۔ تاکہ ہم لندن کا ہوائی نظارہ کر سکیں۔ آفیسر کافی دیر تک کمپیوٹر پر کام کرتا رہا۔ اسکے کام کرنے کے انداز سے ہمیں کمرہ امتحان میں ایسے طلباء یاد آئے جنہیں پرچہ امتحان ملنے کے بعد کچھ سمجھ نہیں آتا اور وہ بلا وجہ پرچہ امتحان اور جوابی کاپی کھنگالتے رہتے ہیں اور بالآخر جوابی کاپی خالی چھوڑ کر ممتحن کو صلواتیں دیتے ہوئے کمرہ امتحان سے فرار

UrduDost Library UrduDost.com

ہوجاتے ہیں۔کافی تگ ودو کے بعد،آفیسر نے نہائت خوشدلی سے ہمیں کھڑکی والی نشست مرحمت کردی۔ہمیں اس عنائت پرنہائت ممنون ہوئے۔بورڈنگ پاس مل گیا۔جہاز میں جانے والا سامان میکانکی زنجیر کے ذریعے اندر پہنچا دیا گیا۔ہم نے از راہِ احتیاط اپنے سامان کو جاتے ہوئے جی بھر کر دیکھا۔کیا خبر ہماری اور ہمارے سامان کی دوبارہ اس جہانِ فانی میں ملاقات ہو،نہ ہو۔اسی گومگو میں ہم امیگریشن کی طرف بڑھے۔ہمیں برقی سکین سے گزارا گیا۔جی بھر کر تلاشی لی گئی،پاسپورٹ بغور دیکھا گیا،برطانیہ کے ویزے کو مَل مَل کر پاسپورٹ سے اکھاڑنے کی بھرپور جدوجہد کی گئی۔ہم نے درخواست کی کہ اس بے زبان کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیوں کیا جارہا ہے تو معلوم ہوا کہ اگر یہ اصلی ویزہ ہے تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔عرض کیا،ہم نے خود برطانوی ہائی کمیشن سے حاصل کیا ہے،جعلی کیسے ہوسکتا ہے۔جواب ملا،سب یہی کہتے ہیں۔ہم نے چپ سادھنے میں ہی عافیت جانی۔ویزے اور پاسپورٹ کی جانچ کرنے والے آفیسر نے اپنے پاس کھڑے ایک ساتھی سے چہ مگوئی کی،لگتا ہے ویزہ اصلی ہے۔حیف ہے برطانوی حکومت پر،ابھی بھی اصلی ویزے جاری کرتے ہیں۔ہم نے زِچ ہوکر کہا۔ہمیں برطانیہ والوں نے خود بلایا ہے اور ہم تعلیم و تحقیق کے لئے جارہے ہیں۔اگر ہمیں اصلی ویزہ نہیں ملے گا تو اور کس کو ملے گا۔جواب ملا،جتنے لوگ برطانیہ میں ٹیکسی چلاتے ہیں یا ہوٹلوں میں کام کررہے ہیں،وہ تمام پڑھنے ہی گئے تھے۔ہمیں اس جواب کی ہرگز توقع نہ تھی۔ہم نے سر کھجایا اور عرض کیا۔آپ جو بھی سمجھیں،ویزہ بہرحال اصلی ہے۔بالآخر یہ مقام بھی طے ہوگیا۔اب آخری مرحلے پر ہمارا ہینڈ بیگ ٹٹولہ گیا۔شاید اس میں ہی کوئی کام کی چیز نکل آئے۔جی جناب۔یہ سامان تو بالکل نہیں جاسکتا۔سخت ممانعت ہے۔ہمیں حیرت ہوئی،کہ ہم نے تو آج تک خریدے ہوئے سگرٹ اور سپاری والے پان تک کو ہاتھ نہیں لگایا۔ہمارے سامان میں سے بارودی اسلحہ،پستول یا ہیرون کیسے برآمد ہوگئی۔معلوم ہوا کہ ہمارے سامان میں ایک عدد شیونگ فوم،پرفیوم،ٹوتھ پیسٹ اور شیونگ بلیڈ موجود ہیں۔آپ یہ چیزیں لے کر جہاز میں سوار نہیں ہوسکتے۔گذارش کی،کیا جہاز ہپی افراد کے لئے مخصوص ہے۔کیونکہ یہ اشیا تو ہر غیر ہپی فرد کے پاس ہوتی ہیں۔ان سے کسی قسم کی دہشت گردی بھی نہیں ہوسکتی۔

UrduDost Library UrduDost.com

اگر یقین نہ آئے تو جہاز کے کپتان کی تلاشی لے لیں۔اس کے پاس بھی اسی نوع کی چیزیں ضرور ہوں گی۔ کہنے لگے،آپ اپنا مقابلہ جہاز کے کپتان سے کیسے کر سکتے ہیں۔ کپتان جو چاہے کرسکتا ہے،آپ اکانومی کلاس کے ایک معمولی مسافر ہیں۔آپ کو اگر سارا سفر پانی کا گھونٹ تک نہ دیا جائے اور آپ کے ساتھ بیٹھے مسافر کو ہر آدھ گھنٹے بعد فریش جوس پیش کر دیا جائے تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔اس بات پر ہمیں احساس ہوا کہ بات تلخ مگر سچ ہے۔ہم نے بات کا رخ تبدیل کر کے اپنی شیونگ کٹ کی صفائی پیش کی۔تو معلوم ہوا کہ سفری قواعد کے مطابق آپ ۱۲۵ ملی لیٹر سے زائد کوئی چیز مائع حالت میں جہاز کے اندر نہیں لے کر جا سکتے۔اور ہماری شیونگ فوم پر ۲۵۰ مل لیٹر کندہ ہے۔کسقدر غیر معمولی جرم کے ہم مرتکب ہوئے ہیں۔ہم نے عرض کیا اگر چہ فوم کی بوتل پر ۲۵۰ ملی لیٹر لکھا ہوا ہے مگر یہ استعمال شدہ ہے۔اور اس میں موجود فوم کسی حالت میں ۱۲۵ ملی لیٹر سے زائد نہیں ہوگا۔اس دلیل پر وہ چکرائے اور ہم سمجھے کہ میدان مار لیا۔گویا ہوئے،تو آپ استعمال شدہ فوم لے کر جا رہے ہیں، پہلی دفعہ ایسے کنجوس مسافر کو انٹرنیشنل فلائٹ پر جاتے دیکھ رہے ہیں۔عرض کیا۔یہ کنجوسی نہیں، کفایت شعاری ہے اور ویسے بھی اگر ہم اسے یہیں چھوڑ جائیں اور کوئی دوسرا اسے استعمال کر لے تو صحت کے اصولوں کے تحت درست نہ ہوگا۔کوئی جلدی بیماری لاحق ہوسکتی ہے۔اس کے علاوہ بھی اس استعمال شدہ فوم کو بین الاقوامی سفر پر لے جانے کے لئے ہمارے پاس بے شمار دلائل موجود ہیں۔اجازت ہو تو پیش کئے دیتے ہیں۔ کہنے لگے، کج بحثی چھوڑ یئے۔اس بوتل پر ۲۵۰ ملی لیٹر لکھا ہوا ہے۔ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ یہ استعمال شدہ ہے یا غیر استعمال شدہ۔بس یہ نہیں جائے گا۔اسے ایک طرف کیجیئے۔ہم نے اس بات کو چیلنج سمجھا اور کہا کہ ڈیوٹی انچارج سے ملوائیں۔معاملہ گھمبیر ہے اور آپ کے ساتھ طے نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے پاس ہی موجود انچارج ڈیوٹی آفیسر کو فوراً مطلع کر دیا۔ہم نے اپنی بپتا سنائی اور ساتھ ہی رعب جمانے اور رحم طلبی کے لئے اپنی نوکری اور گریڈ کا حوالہ دیا۔آفیسر نے فرمایا،سرکاری اہل کار ہونے کے وجہ سے آپ کو یہی زیبا ہے کہ استعمال شدہ شیونگ فوم ساتھ لے جائیں۔یوں یہ معرکہ تمام ہوا اور ہم سرفراز ہوئے۔

UrduDost Library UrduDost.com

پی۔آئی۔اے کی پرواز میں خدشات سمیت سوار ہوئے۔معلوم نہیں، ائیر لائن والوں کا رویہ کیسا ہوگا۔ وقت کی پابندی ہوگی یا ہماری ذاتی اورقومی زندگی کے تمام معاملات کی طرح تاخیر ہی ہوتی رہے گی۔اگر چہ ہم اس سے قبل متعدد بار پی۔آئی۔اے پر اندرون و بیرون ملک پرواز کر چکے ہیں لیکن دوست احباب ہر دفعہ قومی ائر لائن کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ ہم آنکھوں دیکھا حال بھول کر خدشات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پرواز عین وقت پر روانگی کے لئے تیار تھی۔اپنا بھاری بھرکم سفری بیگ اٹھائے ہم جہاز کے اندر پہنچے۔مسکراتی ہوئی ائر ہوسٹس نے کہا، جناب پیچھے تشریف لے جائیے۔ چلتے چلتے ایک کیبن عبور کیا، دوسری ائر ہوسٹس نے مسکرا کر پھر کہا۔ پیچھے۔ دوسرا کیبن بھی ختم ہوگیا۔آخری کیبن سامنے تھا۔ چلتے گئے۔معلوم ہوا۔ہمیں سب سے آخری نشست دی گئی ہے۔محسوس ہوا کہ عملے کو شاید خبر ہوگئی ہے کہ ہماری پرواز کی ادائیگی خود ہم نے نہیں، بلکہ سکالرشپ ایجنسی نے کی ہے۔سو جو بھی نشست دی جائے گی، قابلِ قبول ہوگی۔ بہت جزبز ہوئے۔مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ پرواز کھچا کچھ بھری ہوئی تھی۔سو وہیں چپکے بیٹھ گئے۔عملہ خوش اخلاق، خوش لباس اورخوبرو۔ذرا سا بُلائیں۔ بھاگے چلے آتے ہیں۔ جہاز، جدید ترین اگر چہ نہیں مگر جدید ضرور ہے۔لاہور سے اسلام آباد اور پشاور کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے، پاکستان کی فضائی حد عبور کر گیا۔تھوڑی دیر بعد پرواز کے سفری نقشے پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ ہم کابل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کھڑکی سے باہر نیچے کی طرف دیکھا تو تا حدِ نظر خشک پہاڑ اور سنگلاخ چٹانیں نظر آئیں۔کہیں کوئی درخت نہیں، سبزہ نہیں۔ پانی موجود ہے کہ نہیں، معلوم نہیں۔ انسان یہاں کیسے زندگی گذارتے ہوں گے۔کٹھن، شائد انتہائی کٹھن۔اسی لئے مردِ کوہستانی عزم واستقلال کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔پورا افغانستان گذر گیا۔ ہماری سبزہ دیکھنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ پرواز وسطی ایشائی ریاستوں کی فضائی حدود میں داخل ہوگئی۔اتنی دیر میں فضائی میزبان مسافروں کے سامنے کھانا چننے لگے۔کھانا روایتی پاکستانی انداز میں تیار کیا گیا تھا۔کھانا رکھنے کے لئے ہر مسافر کے سامنے ایک ٹرے موجود ہوتی ہے جو اگلی نشست کے عقب میں پیوست ہوتی ہے۔ایک تو یہ ٹرے کم جگہ ہونے کے باعث قدرے چھوٹی ہوتی ہے اور دوسرے ٹرے اور مسافر

UrduDost Library UrduDost.com

کے درمیان جگہ بھی کم ہوتی ہے۔ اس بنا پر دورانِ پرواز کھانا کھانا ایک آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ ہم کشادگی سے رہنے کے عادی ہیں۔ اتنی کم جگہ میں کھانا کھانے کے لئے ہمیں جاپان میں قیام کے دوران حاصل ہونے والی تربیت یاد آئی۔ ہمارے اندر سے صدا آئی کہ یہ جگہ تو کیا، ہم اس سے آدھی جگہ میں بھی سہولت کے ساتھ کھانا تناول کر سکتے ہیں۔ پھر خیال آیا، چلیے ہم تو جاپانی تربیت کی وجہ سے آرام سے کھانا کھالیں گے لیکن پرواز میں موجود باقی سارے لوگ تو جاپان نہیں گئے ہوں گے۔ وہ کیسے کھائیں گے۔ تو جناب سلیقہ مندی تو ہر انسان میں ہوتی ہے۔ اسے بروئے کار البتہ کوئی کوئی لاتا ہے۔ جو لے آتا ہے وہ سلیقہ منداور دوسرے پھوہڑ۔۔ کھانا کھایا، جوس پیا اور چائے کی چسکیاں بھی لیں۔ قدرت کا شکر ادا کیا۔ پرواز میں ہر نشست کے سامنے ٹی۔وی نصب ہے۔ جس میں طرح، طرح کے معلوماتی اور تفریحی پروگرام چل رہے ہیں۔ بس اپنی پسند کا چینل آن کیجیے اور حظ اٹھائیے۔ کوئی ڈرامہ دیکھ رہا ہے تو دوسرا فلم یا پھر میچ۔ ہم نے سارے چینل کھنگال لئے، کچھ پسند نہیں آیا۔ فضائی میزبان کو بلایا۔ آپ کا پروگراموں کا انتخاب بہت محدود ہے۔ ہمیں تو کوئی کام کی چیز نظر نہیں آرہی ہے۔ مودب جواب ملا۔ آپ کیا پسند کرتے ہیں۔ ہمیں بتائیے شائد ہم آپ کیلئے ڈھونڈ نکالیں۔ اب بال ہمارے کورٹ میں آگیا۔ ہم، ہم۔۔۔ ہم پسند کرتے ہیں۔۔۔ ہوں۔۔ بہت غور وخوض کیا۔ ہم کیا پسند کرتے ہیں اور اس وقت کیا دیکھنے کے متمنی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مکرر پوچھا گیا۔ آپ کیا دیکھیں گے۔ ارے صاحب، ہم دیکھیں گے۔۔۔۔ ہم دیکھیں گے۔۔۔۔ ہوں۔۔۔ ہوں۔ چلیئے ہم خود ہی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اگر خود ہی ڈھونڈ سکتے ہیں تو پھر ہمارا دماغ کیوں چاٹ رہے ہیں۔ میزبان نے دل ہی دل میں کہا۔ رخِ زیبا پر مسکراہٹ لائے اور کہا۔ ٹھیک ہے۔ میزبان کی جان چھُٹی۔ اور ہم نے سوچنا شروع کیا۔ کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ہمیں کیا دیکھنا ہے۔ اگر ہمیں خود ہی علم نہیں تو پرواز کے محدود انتخاب کی بات کیونکر کی جا سکتی ہے۔ ہاں تو پھر ایسے کرتے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔ کیا کریں۔۔۔ چھوڑیئے کس جھنجھٹ میں ہیں۔ چلیئے فلائٹ ڈیٹا دیکھتے ہیں۔ یہ کوئی مخربِ اخلاق چیز نہیں ہے۔ اور ویسے بھی دورانِ پرواز مخربِ اخلاق فلموں سے پرہیز ہی بہتر ہے۔ آدمی زمین پر نہ آسمان پر۔ آخر تقویٰ بھی

کوئی چیز ہے۔اور ویسے بھی ایسی چیزیں دیکھنے میں جلدی کیا ہے۔آخر ہم برطانیہ جارہے ہیں۔ وہاں جو چاہیں، کریں گے۔ وہاں تو آزادی ہی آزادی ہے۔آزادی بھی ایک عجیب تصور ہے۔ نہایت وسیع وعریض مفہوم ہے اس کا۔ یہ جونوجوان لڑکے،لڑکیاں بس دو چار سُوٹے لگانے، فلمیں دیکھنے، راتوں کو بلا مقصد گھومنے پھرنے، فون پر رانگ کال کرنے اور سننے، ماں باپ کی جیبیں کاٹنے، ریستورانوں میں کسی سے کھانا کھانے، بلا وجہ ٹھنڈی آہیں بھرنے اور ناکامی عشق کا ذمہ دار ظالم سماج کو ٹھہرانے کے بہانے، والدین اور دیگر اعزا کو کوسنے کو آزادی سمجھتے ہیں، انکا مفہومِ آزادی بالکل نامکمل، ادھورا، اور محدود ہے۔آزادی کیا ہے اور یہ کس حد تک وسیع اور فرحت بخش ہے، یہ ہم برطانیہ پہنچ کر خود محسوس کریں گے اور شائد آپ کو بھی بتا دیں۔سرِ دست فلائیٹ ڈیٹا دیکھتے ہیں۔تو جناب، ہم اسوقت افغانستان عبور کر کے وسط ایشیائی ریاستوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہماری پرواز تقریباً تینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔تینتیس ہزار کا مطلب ہوا اندازاً دس ہزار میٹر۔۔۔اوہ، یہ تو زمین سے دس کلومیٹر اوپر ہے۔۔۔۔ہیبت کی ایک لہر ہمارے بدن میں دوڑ گئی۔ اسقدر اونچائی۔ کہیں ہم نیچے گر ہی نہ جائیں۔ جلدی جلدی استغفار پڑھا۔ اتنا اونچا جانے کی کیا ضرورت ہے۔ذرا نیچے ہونا چاہیئے، نیچے ہونے کے دو فائدے ہیں۔ایک تو ہم زمین پر موجود چیزیں دیکھ سکتے ہیں، گویا لندن جانے کے بہانے راستے میں موجود بہت سارے ممالک خود اپنی گنہگار نظروں سے دیکھ سکتے ہیں، اور دوسرا اہم فائدہ یہ کہ اگر خدانخواستہ پرواز میں کوئی خرابی ہوتی ہے یا کوئی حادثہ درپیش ہوتا ہے تو نیچے زمین پر گرنے کی صورت میں چوٹ بھی کم لگے گی۔ ہاں تو اتنے سارے فوائد کے باوجود کپتان کا کیا شوق ہے کہ اوپر ہی اوپر جاتا جارہا ہے۔ کیا وہ آسمان چھونا چاہ رہا ہے۔ اتنے میں اوسان بحال ہوئے تو عقل نے انگڑائی لی۔ بھئی کپتان پرواز کے بارے میں کم ازکم ہم سے تو زیادہ ہی جانتا ہوگا۔۔۔شائد۔ لیکن پرواز کے علاوہ باقی معاملاتِ ارضی وسماوی کو ہم کپتان کیا، بہت سے دوسروں سے خوب جانتے ہیں۔تو۔۔۔ تو۔۔۔پرواز کے عملے کے دوسرے لوگ ہی کپتان کو سمجھا دیں۔ ہوسکتا ہے وہ آپس میں خوش گپیوں میں مشغول ہوں۔ دورانِ پرواز فضائی میزبان اور 'میزبانیاں' بھی تو مقدور بھر کُھل کھیلتے

UrduDost Library UrduDost.com

ہیں۔ حالانکہ ’میز بانیوں‘ کو یہی کام مہمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ان کا ڈیوٹی ٹائم ہے۔ اور فرائضِ منصبی کا تقاضا یہی ہے کہ مہمانوں کا خیال رکھا جائے اور انکی بھرپور دلجوئی اور مدارات کی جائے۔ پروان کے بعد میز بان اور ’میز بانیوں‘ کے پاس وافر وقت ہوتا ہے، جو چاہے اور جتنا چاہے کریں۔ لیکن مہمانوں کے وقت میں صرف انہی کا سوچیں۔ خیر ہم نے کال بٹن دبایا۔ جھٹ میں جواں سال ’میز بانی‘ لپکی۔ دلآویز مسکراہٹ سے استفسار کیا۔ جی کیا چاہیئے۔ عرض کیا۔ چاہئے تو کچھ نہیں۔ پرواز اسوقت نوسو کلومیٹر کی رفتار سے زمین سے دس کلومیٹر اونچی جارہی ہے۔ کپتان سے عرض کیجیے۔ اتنا اونچا اڑنا اچھا نہیں ہے۔ ذرا دھیرے اور نیچے ہو جایئے۔ ’جی، کیا فرما رہے ہیں آپ‘۔ ’میز بانی‘ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ’پرواز بالکل معمول کے مطابق جا رہی ہے۔ پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں‘۔ جی اچھا۔ آپ سے سن کر تسلی ہوگئی ہے۔ اب ہمارے اوسان قدرے بحال ہوئے تو اپنے پائلٹ دوست کی بات یاد آئی۔ جہاز جس قدر بلند ہو اسی قدر محفوظ سمجھا جاتا ہے کیونکہ خدانخواستہ کسی مسئلے کی صورت میں زمین پر گرنے سے پہلے پائلٹ کو کچھ وقت مل جاتا ہے جس میں وہ اسے دوبارہ سنبھالنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اونچائی زندگی ہے اور نیچے ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ لو اتنی سی بات تھی۔ ہم بھول گئے۔ لیکن کوئی بات نہیں، ہم دوسرے مسافروں سے بہتر ہیں۔ کم از کم غور وخوض تو کر رہے ہیں۔ دوسرے تو بس فلمیں، میچ اور رقص وسرور میں غرقاں ہیں۔ کیا کوئی قوم ایسی سرگرمیوں میں مصروف بلکہ ملوث ہوکر باقی رہ سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بقا کے لئے ہم جیسے عالی دماغ چاہئیں جو ہمہ وقت متعلقہ، غیر متعلقہ امور پر دماغ سوزی کریں۔ عامی اور دانشور میں یہی فرق ہوتا ہے۔ ہم نے آنکھیں بند کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔

فضائی میز بان کی آواز پر آنکھیں کھولیں۔ اردگرد دیکھا تو سب مسافروں کو جوس اور کولڈ ڈرنکس پیش کئے جا رہے تھے۔ وقت دیکھا تو پتہ چلا، صرف پندرہ بیس منٹ گزرے ہیں۔ شائد فی الحال سونا ممکن نہیں۔ اورنج جوس لیا۔ ساتھ بیٹھے مسافر کی طرف دیکھا۔ جناب تلاوتِ کلام پاک فرما رہے ہیں اور کلامِ حکیم بھی ان کے پاس موجود ہے۔ ہمیں بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ ذرا غور کیا تو جناب شلوار قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ یہ کیا۔ تھوڑی دیر پہلے تو انہوں نے شرٹ

UrduDost Library UrduDost.com

پتلون زیبِ تن کررکھی تھی اوراب کیا لباس تبدیل کرلیا ہے۔نہیں۔۔۔شائد ہم غلطی پر ہیں۔پہلے بھی شلوار قمیص ہی ہوگی۔آخر قومی لباس میں لندن جانے میں پابندی تو نہیں ہے۔ہم نے اخبار طلب کیا۔میز بان نے پوچھا۔انگریزی یا اردو۔عرض کیا۔دونوں اور اگر کسی اور زبان میں موجود ہے تو وہ بھی مرحمت فرمائیے۔کم از کم تصویروں کی تو کوئی زبان نہیں ہوتی۔وہی دیکھ لیں گے۔ قدرے روکھے لہجے میں بولے، پہلے ایک پڑھ لیجئے پھر دوسرا لے لیجئے گا۔دیگر مسافر بھی طلب کرتے ہیں۔خوب، اگر ایک ہی مل سکتا ہے تو پھر اردو اخبار دے دیجئے۔جب بور ہونے کا موڈ ہوگا۔انگریزی اخبار مانگ لیں گے۔اردو اخبار پڑھنا شروع کیا۔ساری خبریں وہی جو ہم پچھلے روز ٹی۔وی۔پر دیکھ چکے ہیں۔بے مزہ۔مضامین اور کالم دیکھے تو وہی گھسے پٹے موضوعات۔ سیاست۔حکومت۔عوام۔مسائل کا انبار۔۔۔دوبارہ میز بان کو شائستگی سے بلایا۔کہیں بار بار بلانے پر برا نہ مان جائے۔جی فرمائیے۔گذارش کی، یہ تو وہی اخبار ہے جو ہم نے پرواز پر سوار ہونے سے قبل ایک نظر دیکھ لیا تھا۔کوئی نئی چیز نہیں اس میں۔میز بان خفیف جھنجھلاہٹ سے بولا۔ یہ پرواز ہے۔کوئی اخباری دفتر نہیں ہے جہاں آپ کو نئی نئی کہانیاں اور اخبار مل سکیں۔جو ہمارے پاس تھا سو دے دیا۔بات تو درست ہے مگر ہم یہ پڑھ چکے ہیں۔اب کیا کریں۔جناب جو جی چاہے کریں ہم کیا مشورہ دے سکتے ہیں۔تو اسکا مطلب ہوا کہ اب بوریت کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔اچھا ٹی۔وی۔چینل میں کوئی کام کی چیز ڈھونڈتے ہیں۔سارے مینیوز کنگھالے۔جی ہاں۔اس بار ہمیں کچھ کام کی چیزیں مل ہی گئیں۔پرانے سدا بہار گیت اور غزلیں۔واہ۔اب لطف آئے گا۔ہیڈ فون سر پر چڑھایا۔اور لا تعداد بہترین پرانے گیت، غزلیات اور نجانے کیا کچھ۔سر دھنتے رہے، کبھی مغنی اور مغنیہ کو اور کبھی شاعر کو داد دی۔طبیعت بشاش ہوگئی۔فلائیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ ہم اس وقت سابقہ سپر پاور روس کے دارلحکومت ماسکو کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ارے واہ، بڑی سپر پاور ہوا کرتی تھی۔اس وقت ہمارے پاوں تلے ہے۔ابھی اس خیال سے لطف اندوز ہونا شروع ہی ہوئے تھے کہ جہاز کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ پہلے دوسرے جھٹکے پر تو ہم نہایت اطمینان سے براجمان رہے۔کچھ بھی نہیں ہے بس شائد ائر پاکٹ

UrduDost Library UrduDost.com

آ گئی ہے۔ابھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ابھی اسی حالت میں تھے کہ ایک زوردار جھٹکے سے یوں لگا کہ پرواز کا توازن قائم نہیں رہا۔خواتین کی چیخوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ایک دو جھٹکے مزید لگے۔ہر طرف استغفار کی آوازیں،کلمہ شریف کا ورد شروع ہو گیا۔معلوم ہوا کہ سب لوگ خدا کو یاد کر رہے ہیں یا پھر چیخ و پکار۔ایک ہم ہیں،دونوں کام نہیں کر رہے۔اس لئے نہیں کہ ہمیں ڈر نہیں لگ رہا تھا۔اس لئے کہ چیخ و پکار کرنے یا خدا کو یاد کرنے کے لئے آپ کے اوسان زیادہ نہیں تو کسی حد تک بحال ضرور ہونے چاہئیں اور ہم اس حالت سے آگے جا چکے ہیں۔ایک ایسی حالت جہاں مَیں نہیں ہوتا۔تُو ہی تُو ہوتا ہے۔اتنے میں کپتان کی آواز آئی۔گھبرایئے نہیں۔ہم ائر پاکٹ میں سے گزر رہے ہیں۔پرواز معمول کے مطابق جاری ہے۔اور جلد سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔اور واقعی چند لمحات میں پرواز پرسکون ہو گئی۔اب ہمیں محسوس ہوا کہ ہم حالتِ غش سے برآمد ہو رہے ہیں۔اوسان بحال ہوئے۔پانی پیا۔اردگرد دیکھا۔اور غور و خوض کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں جھٹکے لگنا شروع ہوئے تھے۔معاً خیال آیا۔ہم تو سپر پاور کو پاوں تلے سمجھ رہے تھے۔اب کیا ہوا۔۔۔ہوں۔۔۔کوئی بات نہیں۔ندامت مردجری کو زیبا نہیں۔عالمی طاقتوں کے معاملات میں اونچ نیچ آنی جانی چیز ہے۔

جہاز مسلسل کئی گھنٹے روس پر محوِ پرواز رہا۔کیا ملک ہے۔ختم ہی نہیں ہونے میں آ رہا۔اتنا وسیع و عریض ملک ہے پھر بھی نجانے کیوں دوسرے ممالک پر چڑھائی کرتے رہتے ہیں۔پہلے اپنے طول و عرض کو تو آباد کر لیں۔اتنی جگہ ہمارے پاس ہو تو۔۔۔۔تو۔۔۔ہم کوئی کام بھی نہیں کریں گے۔بس بے آباد رقبہ بیچ کر عیاشی کریں۔پتہ نہیں روسیوں اور ایسے ہی دوسروں کو زندگی گزارنے کا ڈھنگ کب آئے گا۔کچھ ہم سے ہی سیکھ لیں۔پرواز میں موجود تمام گیت،غزلیات، سولو پرفارمنس،آرکسٹرا سب کچھ ہم نے بھگتا لیا۔خدا خدا کر کے روس ختم ہوا اور ہم مشرقی یورپ جا گھسے۔مشرقی یورپ بھی ایک دلچسپ خطہ ہے۔اسکی ثقافت یورپ جیسی اور معیشت ایشیا بلکہ جنوبی ایشیا سے مشابہ ہے۔لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں یہ ممالک پسماندہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ایک چیز حیران کن ہے۔کہ ان ممالک کے لاتعداد باشندے اپنے ہاں اچھی خاصی زندگی

UrduDost Library UrduDost.com

چھوڑ کر مغربی یورپ میں گھسنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جو کامیاب ہوجاتے ہیں ان میں سے بہت سارے بغیر چھت اور خوراک کے راتوں کو فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ کچھ ہپیوں جیسا حلیہ بنا لیتے ہیں۔ کئی ایک زیر زمین ریلوے سٹیشنوں کے سامنے اور دوسری بھیڑ والی جگہوں پر گٹار بجا کر چند سکے اکٹھے کر کے گزر بسر کرتے ہیں۔ لیکن ہوتے دھن کے پکے ہیں۔ واپس اپنے مما لک کم ہی جاتے ہیں۔ مشرقی یورپی مما لک رقبے کے لحاظ سے چھوٹے ہیں۔ پرواز تھوڑے وقت میں ہی انہیں عبور کر کے جرمنی پہنچ گئی۔ جرمنی۔۔۔ عظیم جرمنی۔ ایک ایسا ملک جسکا ماضی، حال، مستقبل سب درخشندہ ہے۔ جس کے باشندے اپنے آپ کو جرمن کہلوانے پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ علم، فنون، کھیل، سائنس، آرٹ۔ ہر میدان میں جرمنی ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل کے یورپ میں جومنی قائدانہ کردار ادا کرے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جرمنی نے جس طرح عالمی حالات کے تحت اپنی سمت متعین کی ہے، وہ ایک مثال ہے۔ دیوارِ برلن کے انہدام سے مشرقی اور مغربی جرمنی ایک ہو کر عظیم طاقت بن چکے ہیں۔ ابھی ہم جرمنی کے بارے میں غور وفکر کر ہی رہے تھے کہ فضائی میز بانوں نے دوسری مرتبہ کھانا پیش کرنا شروع کر دیا۔ وہی روایتی پاکستانی انداز کا کھانا۔ اس بار ہم نے اپنا آخری دیسی کھانا سمجھ کر کھایا۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں انگریزی کھانے ہی کھانا پڑیں گے۔ دورانِ طعام ہماری نظر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر پر پڑی تو وہ نہایت انہماک سے شرٹ پتلون پہنے کھانا تناول کر رہے تھے۔ اس بار غلطی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہم نے خود انہیں شلوار قمیص پہنے تلاوت کرتے دیکھا تھا۔ تب بھی ہمیں شبہ تھا کہ آغازِ سفر میں پتلون پہن رکھی تھی۔ لیکن اب تو یقین تھا کہ انہوں نے لباس تبدیل کیا۔ ہم تو انہیں شلوار قمیص پہنے قومی نمائندہ سمجھ رہے تھے۔ مگر انہوں نے تو لندن کی ہوا لگنے سے پہلے ہی پھر پتلون چڑھا لی۔ ہم نے اپنی تمام قوتِ ڈھٹائی مجتمع کر کے پوچھ ہی لیا۔ غالباً آپ نے دورانِ سفر دو مرتبہ لباس تبدیل کیا ہے۔ مسکرا کر فرمانے لگے، نہیں۔ تین دفعہ۔ جی تین دفعہ۔ کم ہی مردوں میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ خواتین کے برابر لباس تبدیل کرتے رہیں۔ لیکن آپ تو خواتین کو بھی مات کر گئے۔ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ کہنے لگے۔ وجہ بس یہ ہے کہ ایک دفعہ لباس تبدیل کرنے کے لئے آپ کو اپنا

UrduDost Library UrduDost.com

ہینڈ بیگ سامان والی شیلف سے نکالنا پڑتا ہے۔ پھر نیا لباس لے کر آپ جہاز کے ٹائلٹ میں جاتے ہیں۔ جو اکثر خالی نہیں ہوتا۔ آپ وہاں انتظار کرتے ہیں۔ اسی انتظار کے دوران کسی ائر ہوسٹس سے گپ شپ بھی ہوسکتی ہے۔ پھر آپ ٹائلٹ میں لباس تبدیل کرتے ہیں۔ ہاتھ منہ بھی دھو لیتے ہیں۔ نئی خوشبو بھی لگا لیتے ہیں۔ واپس آتے ہیں۔ پرانا لباس واپس ہینڈ بیگ میں رکھتے ہیں اور اسے واپس سامان کی شیلف میں چڑھا دیتے ہیں۔ ٹائلٹ آتے جاتے کسی خوبرو سے مڈبھیڑ بھی ہوسکتی ہے۔ بات چیت شروع ہو جائے تو لطف دوبالا ہوسکتا ہے۔ اور جب آپ نیا لباس پہن کر واپس اپنی نشست پر بیٹھتے ہیں تو اس وقت تک کافی وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اور یہی اس سارے کام کا مقصود ہے۔ تو آپ صرف وقت بتانے کے لئے اتنا تردد کرتے ہیں۔ تو اور کیا سفر میں وقت ہی گزارنا ہوتا ہے اور کیا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن وقت گزارنے کے تو اس سے بہتر طریقے ممکن ہیں۔ اور کیا میں ائر ہوسٹسوں کے ساتھ مل کر مسافروں کو مشروبات پیش کرنا شروع کردوں، وہ گویا ہوئے۔ خیال برا نہیں، ہم نے خوشدلی سے کہا۔ پوچھنے لگے۔ آپ سفر میں کیسے وقت گزارتے ہیں؟ جی وقت گزارنے کے لئے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ آج آپ نے مطالعہ کیا ہے۔ جی ہاں۔ تو آپ کیا مجھ سے پہلے لندن پہنچ جائیں گے۔ یہ جواب سن کر ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہم نے فلائٹ ڈیٹا پر نظر دوڑائی۔ پرواز برطانوی فضائی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ ہمیں منزل کے قریب ہونے کی خوشی کا احساس ہونے لگا۔ پرواز آہستہ آہستہ نیچے آرہی تھی۔ رفتار میں بھی کمی ہونا شروع ہوئی۔ کھڑکی کا فلیپ اوپر کیا۔ تاکہ زمین کا نظارہ کیا جاسکے۔ فضا ہر طرف سفید تھی۔ بادل تیر رہے تھے اور نیچے نظر آنا ممکن نہ تھا۔ کافی دیر اسی حالت میں رہے۔ اتنے میں کپتان نے اعلان کیا کہ ہم لندن ہیتھرو ائر پورٹ سے بیس منٹ کے فاصلے پر ہیں۔ براہِ کرم اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیجیئے۔ ہم نے بیلٹ باندھی۔ اتنی دیر میں جہاز سفید بادلوں کی موٹی تہہ میں تیرنا شروع ہوچکا تھا۔ ہم نے اپنی عینک سنبھالی اور انتظار کرنے لگے تاکہ جونہی جہاز بادلوں سے نیچے آئے۔ ہم اپنی آنکھوں سے لندن کا نظارہ کرسکیں۔ تھوڑی دیر میں جہاز بادلوں کو چیرتا ہوا لندن کی ہوائی حدود میں محو پرواز تھا۔ ہم نے نیچے دیکھا۔ نہایت سلیقے اور ترتیب کے ساتھ بنی عمارات اور گھر نظر

UrduDost Library UrduDost.com

آ رہے تھے۔ وہی خیرہ کن طرزِ تعمیر جو تصویروں میں دیکھا تھا۔ عمارات اور گھروں کے بیچوں بیچ سڑکیں ہیں۔ کہیں بالکل سیدھی، کہیں خم دار۔ گاڑیاں قطاروں میں رواں دواں ہیں۔ جہاں کہیں جگہ میسر ہے۔ وہیں سبزہ موجود ہے۔ کھیل کے میدان بہت ہی خوبصورت اور بھلے دکھائی دے رہے ہیں۔ گالف کے سرسبز میدان تو جنت کے گل زاروں کا عکس لگتے ہیں۔ فٹ بال، رگبی، کرکٹ گراؤنڈ نہائت خوب صورت ہیں۔ لیکن عجیب چیز ہے کہ تمام میدان خالی ہیں۔ ہمیں کہیں کھیلتے ہوئے نوجوان نظر نہیں آ رہے۔ دراصل تمام ترقی یافتہ ممالک میں پبلک گراونڈ، سٹیڈیم اور دوسرے کھیل کے میدان کھیلنے سے پہلے ریزرو کروانا پڑتے ہیں۔ اور آپ کو بتانا پڑتا ہے کہ آپ کتنا وقت کھیلیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر قواعد وضوابط بھی ہوتے ہیں جو مختلف جگہوں کے لئے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور پھر کھیلنے والے بچے، نوجوان اور دیگر افراد بھی اپنا شیڈول دیکھ کر ہی کھیلنے کے وقت کا تعین کرتے ہیں۔۔۔ لیکن کیا فائدہ ایسے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کا۔ مزہ تو ہمارے ہاں آتا ہے۔ کھلاڑی اور نوجوان کھیلنے کے لئے ہمہ وقت دستیاب اور تیار ہوتے ہیں۔ جونہی چند نوجوانوں کا موڈ ہوتا ہے، وہ کسی بھی جگہ بلا جھجک کھیلنا شروع کر سکتے۔ خود ہم نے بہت دفعہ مین روڈ پر وکٹیں گاڑ کر کرکٹ کھیلی ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہی اہتمام کرنا ہے جیسے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ ہم اپنی نصابی کتابیں پڑھ لیں۔ پس ہم دلائل کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو آزادیِ عمل کی معراج ہمیں حاصل ہے وہاں تک مغربی اقوام پتہ نہیں کب تک پہنچیں گی اور پھر یہ کہ پہنچیں گی بھی یا نہیں، یقین سے کہنا مشکل ہے۔ برطانوی گھر اور دیگر عمارات ایک خاص طرزِ تعمیر رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں سے بالکل مختلف ہے۔ عام طور پر عمارات پرانی ہیں۔ اور اگر کوئی نئی عمارت بنائی جاتی ہے تو اسی پرانی طرز پر ہی بنائی جاتی ہے۔ تاہم لندن شہر میں اب بہت ساری عمارات ہیں جو جدید طرز پر بنائی گئی ہیں۔ ان میں کثیر المنزلہ عمارات بھی شامل ہیں۔ روائتی برطانوی طرزِ تعمیر میں کثیر المنزلہ عمارات کا تصور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن آبادی میں اضافے، جگہ کی کمی اور دوسرے عوامل کے پیشِ نظر اب کثیر المنزلہ عمارات بھی بنائی جاتی ہیں۔ اور حد تو یہ ہے کہ ٹوکیو، شنگھائی اور شکاگو کی طرح اب لندن میں بھی کئی لوگ فلیٹوں میں رہتے

UrduDost Library UrduDost.com

ہیں۔ ہم چونکہ طبعاً روایت پسند بلکہ قدامت پسند واقع ہوئے ہیں، اس لئے ہمیں نئی سے زیادہ پرانی عمارات سے لگاؤ ہے۔ اور فلیٹوں کی زندگی پسند نہیں۔ اس لئے ہم برطانوی عوام کو بھرپور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے روائتی طرزِ تعمیر پر ہی توجہ رکھیں تا کہ ہم جیسے لوگ ان پرانی اور کسی قدر بوسیدہ عمارات کے ذریعے ماضی میں جھانکتے رہیں اور حال سے مکمل طور پر غافل رہیں۔ یہی ہماری دنیاوی واُخروی زندگی میں فلاح کا باعث ہے۔

جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کپتان نے ائر لائن کی طرف سے تمام مسافروں کے لندن میں پرلطف قیام کی خواہش کے ساتھ خدا حافظ کہا۔ ہیتھرو ائر پورٹ کے مختلف ٹرمینلز پر طرح طرح کی فضائی کمپنیوں کے بے شمار جہاز کھڑے تھے۔ نیلے، پیلے، سرخ رنگ کے جہاز اور ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ ڈیزائن بنے ہوئے۔ دنیا کی شائد ہی کوئی معروف ائر لائن ہوگی جس کی لندن کے لئے پرواز نہ ہو۔ یورپی، امریکی، چینی، جاپانی، افریقی، عربی۔۔۔غرضیکہ طرح طرح کے جہاز، آپ کو یہاں دیکھنے کے لئے ملیں گے۔ ہر جہاز کے اپنے ہی رنگ اور دلآویزی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آپ قوسِ قزح دیکھ رہے ہوں۔ ہمارا جہاز اپنی مقررہ برتھ پر رکا۔ اور باہر جانے کے لئے ٹنل کو اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ جہاز کے رکتے ہی، ہمارے مسافر بھائیوں نے جلدی جلدی نشستوں کے اوپر موجود شیلفوں میں سے اپنا اپنا سامان نکالا اور سیٹوں کے درمیان بنے ہوئے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ جہاز کے رکنے اور اس کا دروازہ کھلنے میں کچھ وقت درکار ہوتا ہے جس میں سب سے اہم کام جہاز کے ساتھ ٹنل لگانے کا ہوتا ہے۔ لیکن مسافر اس قدر پرجوش تھے کہ وہ نشستوں پر بیٹھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یا شائد انہیں احساس تھا کہ اگر ذرا سی بھی تاخیر ہوئی تو واپس وہیں بھجوا دیا جائے گا جہاں سے وہ آئے ہیں۔ خدا خدا کر کے جہاز کا دروازہ کھلا اور مسافروں نے باہر نکلنا شروع کیا۔ ہم چونکہ جہاز کی وی۔آئی۔پی یعنی آخری نشست پر براجمان تھے تو ہم نے توقف کرنے میں ہی عافیت جانی۔ قریباً پانچ منٹ کے بعد، ہم نے بھی اپنا سفری بیگ اٹھایا اور باہر نکلنے کے لئے چلنا شروع کر دیا۔ فضائی 'میزبانیوں' نے ہمیں مصنوعی مسکراہٹ، جسے ہم ادائے کافرانہ سمجھتے ہیں، کے ساتھ رخصت کیا۔ ہمیں بہت اداسی ہوئی، ان کی

جان چھٹی۔ ہر کلچر میں الوداع کہنے کا اپنا انداز ہے۔ ہم نے کئی بار تھائی ائر ویز پر سفر کیا ہے۔ وہاں مسافروں کو الوداع کہنے کے لئے ائر ہوسٹسیں، چہرے پر مسکراہٹ سجا کر آپ کے سامنے دونوں ہاتھ معافی طلب کرنے کے انداز میں جوڑ لیتی ہیں۔ پہلی دفعہ جب ہم نے یہ منظر دیکھا تو حیران ہوئے کہ کہاں حسنِ بے پرواہ اور کہاں معذرت خواہی۔ عجب دلفریب ادائیں ہیں دل لُوٹنے والوں کی۔ دلفگاروں کو چرکے پہ چرکہ لگاتی ہیں۔ یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے کلچر میں ہاتھ جوڑنا معافی کے لئے اور بدھ مذہب کے پیروکاروں میں استقبال، الوداع، تعظیم اور تکریم کے لئے ہے۔ یہ جان کر مزا کرکرا ہوگیا اور ہم نے تصور کیا کہ ہاتھ جوڑنے کا اصل مطلب وہی ہے جو ہم سمجھتے آئے ہے۔ باقی سب تاویلات ہیں۔

ہم نے جہاز سے باہر انگلینڈ کی سرزمین پر ایسے ہی قدم رکھا جیسے مغلیہ عہد میں انگریزوں نے بحری جہاز لنگر انداز ہونے کے بعد ہندوستاں کی مٹی پر رکھا ہوگا۔ انگریزوں کا اُس وقت اور ہمارا اب یہ خیال تھا کہ ہم نے دنیا کی دولت حاصل کرلی ہے۔ قدم زمیں پر رکھتے ہی، ہماری تکان دور ہوگئی اور ہم انگلینڈ دیکھنے اور اُس سے پہلے امیگریشن کے دوستانہ مرحلے کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگے۔ ٹنل میں پاوں رکھتے ہی ایک عدد گورے کا رخِ انور دیکھا۔ طبیعت بشاش ہوگئی۔ اسقدر سرخ وسفید تو ہمارے ہاں وہ حسینائیں بھی نہیں ہوتی جنہیں ہم حورانِ خُلد سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ اگر ان کے ہاں صنفِ 'سخت' کی یہ حالت ہے تو صنفِ نازک کا کیا حال ہوگا۔ بشاش طبیعت، پُر کیف ہوگئی۔ ابھی ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ سامنے دو کالے کلوٹے دیوہیکل حبشی نظر آئے۔ جل تُو، جلال تُو۔ آئی بلا ٹال تُو۔ یہ کس لئے یہاں کھڑے ہیں۔ کیا ہم چورا چکے ہیں یا ہم سے کوئی سنگین جرم سرزد ہوگیا ہے اور سزا کے لئے ایسے وحشیوں کو بلایا گیا ہے۔ ہم نے ان دونوں کی پرواہ کئے بغیر، شریفانہ بلکہ زنانہ انداز میں نظریں نیچے کیں اور پاس سے گزر گئے۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ وہ تو بعد میں ہمیں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دونوں کسی کو پکڑنے یا سزا دینے کے لئے نہیں آئے ہوئے تھے۔ کیونکہ ابھی تو ہم نے برطانیہ میں کوئی خطا یا جرم کرنا تھا۔ سزا تو بعد میں ہونا تھی۔ ابھی یہ کیوں استقبال کررہے ہیں۔

UrduDost Library UrduDost.com

دراصل وہ دونوں تمام مسافروں کو تنبیہ کرنے کھڑے تھے کہ اگر کسی نے کوئی برا کام کیا تو ایسے ایسے دیوہیکل حبشی ہمارے پاس موجود ہیں جن کو اگر آپ کے پاس صرف آدھا گھنٹہ بٹھا ہی دیا جائے تو آپ بلا ناغہ استغفار کی سات تسبیحات کیا کریں گے۔ اور واپس اپنے ملک جاتے جاتے عمرہ بھی کریں گے۔

ٹنل کی ڈھلوان سے گزرتے ہوئے ہم نے راہداری۔۔۔ انگلینڈ کی راہداری۔۔۔ میں قدم رکھا۔ چلنا شروع کیا۔ سامنے سائن بورڈ آویزاں تھے۔ امیگریشن کے لئے سیدھا چلتے جائیے۔ تھوڑی دور تک گئے۔ تو حرکت کرتے ہوئے ایسکیلیٹر نظر آئے۔ ہم نے اپنا بیگ ایسکیلیٹر پر رکھا اور خود ساکن کھڑے ہو گئے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے خود چلنے کی۔ جب راہداری چل رہی ہے۔ آخر سُستی بھی تو انسانی خاصہ ہے اور اسی کی بنیاد پر ہم انتہائی اونچے انسانی مقام پر فائز ہیں۔ ایک ایسکیلیٹر ختم ہوا تو ہم نے پاوں بچایا کہ کہیں الجھ کر گر ہی نہ پڑیں۔ الجھ کر گرنا ہی ہے تو زلفِ یار سب سے کارآمد چیز ہے۔ اور وہ بھی گوریوں کی۔ کیا بات ہے۔ لندن میں مزے ہوں گے۔ ہم نے کہاں زندگی ضائع کر دی لیکن اب انشااللہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے۔ اور وہ سب کچھ کریں گے جو ہمیں بہت پہلے کر گزرنا چاہیے تھا۔ انہی خیالات میں مست ہم ایک ایسکیلیٹر سے دوسرے اور پھر تیسرے سے ہوتے ہوئے امیگریشن حال میں پہنچے۔ یہاں تو جم غفیر ہے۔ دیسی، کالے، پیلے، گورے۔۔۔ ہر ایک کو اپنے اپنے پاسپورٹ کے مطابق مختلف قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا۔ قطار آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ قریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے تھے۔ دراصل ہم قطار کے آخری سرے پر تھے۔ جمائیاں لے کر وقت گزارنے لگے کہ امیگریشن کے عملے کو ہم پر ترس آ گیا۔ ایک صاحب آئے۔ کہنے لگے۔ قطار لمبی ہے۔ ہم ایک دوسرا کاونٹر کھول رہے ہیں۔ آپ ادھر آ جائیے۔ ہم نے شکر ادا کیا۔ دوسرے کاونٹر پر ہم قطار میں سب سے آگے تھے۔ جلدی جلدی اپنا پاسپورٹ گوری امیگریشن آفیسر کے حوالے کیا تاکہ وہ برطانیہ میں داخلے کی مُہر ثبت کر دے۔ ہم مزید انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ لندن دیکھنے کی خواہش ہمیں بے چین کئے دیتی تھی۔ امیگریشن آفیسر نے ہم سے انٹری کارڈ طلب کیا۔۔۔ یہ کیا۔ وہ کارڈ تو ائر

UrduDost Library UrduDost.com

لائن کے عملے نے ہمیں پرواز کے آخری آدھے گھنٹے میں دیا تھا۔لیکن ہم نے اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ہم تو لندن کے خیرہ کن حُسن کے تصور سے محظوظ ہو رہے تھے۔کوئی پرابلم نہیں۔ہم اب مکمل کر لیتے ہیں۔فوراً کارڈ ڈھونڈا اور لکھنے لگے۔لیکن۔۔لیکن۔۔ہمارے پاس تو قلم ہی نہیں ہے۔ہم نے امیگریشن آفیسر سے قلم مانگا۔غالباً اسے ہماری یہ حرکت بھلی نہ لگی۔بولے، پیچھے ایک کاونٹر ہے۔وہاں جائیے اور کارڈ مکمل کیجئے۔اور قلم بھی اپنا استعمال کیجئے۔۔۔ہمارے پاس ہوتا تو آپ سے کیوں مانگتے۔ویسے آپ ہمیں ایسا بھی نہ سمجھئے۔ہمارے پاس قلم ہے لیکن ہے بیگ میں۔اور وہ ہمیں ڈھونڈنا پڑے گا۔اِس کام میں تردد کرنا پڑے گا۔اور تردد ہم نے زندگی کے کسی مرحلے میں نہیں کیا۔تو آج محض ایک کارڈ پُر کرنے کے لئے ایسے ازلی، ابدی قانون کی کیسے قربانی دی جا سکتی ہے۔ہرگز نہیں۔آپ قلم نہیں دینا چاہتے تو نہ دیجئے۔ہم ساتھ والے کاونٹر پر موجود خوبرو گوری امیگریشن آفیسر سے لے لیتے ہیں۔گوری نے بلا توقف قلم ہمارے حوالے کیا اور ساتھ ایک مسکراہٹ بھی۔ہم نے قلم لیا۔کارڈ پُر کیا۔واپس گورے آفیسر کے پاس پہنچ گئے۔اس نے ویزے کا بغور جائزہ لیا اور پھر کمپیوٹر پر نجانے کیا کرنا شروع کر دیا۔کافی دیر کے بعد ایک فارم پر ہمارے کچھ کوائف لکھے اور ہمیں واپس دیتے ہوئے کہنے لگے۔آپ کا ٹی۔بی ایکسرے ہوگا۔ہم ہکا بکا رہ گئے۔کیا ہم مسلسل کھانستے ہوئے پائے گئے ہیں۔یا ہماری صحت آپ کو اسقدر دگرگوں لگ رہی ہے کہ ٹی۔بی کا گمان ہو رہا ہے۔سپاٹ لہجے میں کہنے لگے۔یہ امیگریشن قانون کا تقاضہ ہے۔آپ بغلی کمرے میں جائیے اور اپنا ایکسرے کروانے کے بعد فلاں کاونٹر پر تشریف لے جائیے۔اب وہاں جائے بغیر تو کوئی چارہ نہیں۔ہم پہلے بھی دو مرتبہ لندن آ چکے تھے۔پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔کیا کوئی نئے قوانین بنا دیے گئے ہیں۔ہم نیا یکسرے کروانے کے لئے جاتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔معلوم نہیں۔ہاں یاد آیا۔اس سے پہلے ہم دو بار لندن آئے تھے۔آئے مگر ہم ٹوکیو سے تھے۔کیا یہ وجہ ہے۔ہم نے فوراً اِس خیال فاسد کو جھٹکا۔نہیں، شائد نئے قوانین بنا دیے گئے ہیں۔ہم ایکسرے کروانے کے لئے لیبارٹری نما کمرے میں داخل ہوئے۔وہاں چند اور لوگ بھی موجود تھے۔زیادہ تر پاکستانی طالب علم اور طالبات تھیں۔جو پہلی دفعہ لندن

UrduDost Library UrduDost.com

آئی تھیں۔سب لوگ نجانے کیوں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ہماری باری آئی۔ ہم نے جھٹ سے پھر وہی سوال داغ دیا۔آخر ہمارا ٹی۔بی۔ ایکسرے کیوں کروایا جاری رہا ہے۔کاونٹر پر موجود ادھیڑ عمر گوری کہنے لگی۔ یہ آپ کے ویزے کے اجرأ کی لازمی شرط تھی۔آپ نے ویزا کی درخواست دینے سے قبل یہ ایکسرے کروانا تھا اور آج وہ ایکسرے آپ کے پاس ہونا چاہیے تھا۔لیکن ہمیں تو کسی نے یہ بات نہیں بتائی۔لاہور میں موجود برٹش کونسل نے اور نہ ہی اسلام آباد میں برطانوی ہائی کمیشن نے۔ خاتون کہنے لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی اس ایکسرے رپورٹ کے بغیر آپ کو ویزہ کیسے مل گیا۔ ہمارے لئے تو یہ ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ پھر خود ہی خاتون نے تبصرہ کیا۔ ہر کوئی غلطی کرسکتا ہے۔ برطانوی ہائی کمیشن سے چُوک ہوگئی ہے۔آپ اپنی باری کا انتظار کیجیے۔ابھی آپ کا ایکسرے کئے دیتے ہیں۔ہم تو سمجھتے تھے کہ گورے غلطی کے لفظ سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں لیکن یہ کیا۔غلطی اور ایسی فاش غلطی۔ہم ایسے ہی آج تک اپنی لاتعداد غلطیوں پر دل ہی دل میں نادم ہوتے رہتے ہیں۔آج کے بعد جب بھی ہم دانستہ یا نادانستہ غلطی کریں گے تو گوروں کی سنت سمجھ کر کریں گے اور اُس پر پھولے نہیں سمائیں گے۔۔۔ہم چپکے سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔۔۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ہمیں اپنے سامان کا خیال آیا۔ یقیناً ہمارا بیگ میکانکی زنجیر کے ذریعے مسافروں کے لاؤنج میں پہنچ چکا ہوگا۔ بشرطیکہ وہ سامان اسی جہاز میں لادا گیا ہوا جس میں ہم سوار ہوکر آئے ہیں۔ اور ہمیں امیگریشن کے مرحلے میں جس قدر تاخیر ہوچکی ہے۔ ہمارا بیگ لاونج میں بے یار و مددگار پڑا ہو گا۔یا پھر کوئی بھی دردمند اور مخلص شخصیت نے اسکی سرپرستی کا ارادہ کرلیا ہوگا۔اور اب تک ہمارا سامان اُس شخصیت کی میزبانی کے مزے لُوٹ رہا ہوگا۔ہم نے بدحواسی کے عالم میں ٹی۔بی کرنے والی۔۔۔ٹی۔بی کا ایکسرے کرنے والی گوری کو بیگ کے بارے میں اپنی پریشانی سے مطلع کیا۔ہماری بےکلی کے جواب میں اُس نے کمالِ سکون سے کہا۔ یہاں جتنے لوگ ایکسرے رپورٹ کے لئے آئے ہوئے ہیں۔سب کا سامان مسافروں کے لاؤنج میں ہی ہوگا۔تو کیا وہ محفوظ ہوگا، ہم نے استفسار کیا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔گوری نے نہایت لاتعلقی سے ارشاد فرمایا۔اور

UrduDost Library UrduDost.com

اگر کوئی اُسے اٹھا کر لے گیا، ہم نے مزید پریشانی کا اظہار کیا۔ کہنے لگی۔ ایسی صورت میں مجھے آپ سے ہمدردی ہوگی۔۔۔اُف خدایا۔ اب کیا کریں۔ کہنے لگی۔ انتظار کیجئے۔ آپ کی باری پر آپ کا ایکسرے کر دیا جائے گا۔ پھر آپ فری ہوں گے۔ مسافر لاونج جا کر دیکھ لیجئے گا۔ ہم اس کمال مہربانی پر سٹپٹا کر رہ گئے۔ اتنی دیر میں ہمیں ایک الگ کمرے میں لے جایا گیا۔ ایکسرے مشین کے پاس جا کر کہا۔ اپنی شرٹ اتاریے اور مشین کے ساتھ اپنی چھاتی چپکا کر ایک لمبا سانس لیجیے۔۔۔جی۔۔۔ یہ کام تو ہم نے آنے والے دنوں میں کرنا ہے۔ آپ یہیں کروانا چاہتے ہیں اور وہ بھی ایک مشین کے ساتھ۔ عجب ناانصافی ہے۔ پھر ہم نے سوچا۔ بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ دراصل یہ ہمیں گُر سکھا رہے ہیں۔۔۔ ہیں یہ کیا۔ یہ ہمیں اسقدر بے ہنر سمجھتے ہیں۔۔ ارے نہیں صاحب۔ بے ہنر نہیں سمجھتے۔ بس مشق کروا رہے ہیں۔ ہم نے گہرا سانس لیا۔ اور گوری نے کہا۔ ویری گڈ۔ آپ واپس کاونٹر پر چلے جائیے۔ واپس آئے۔ چند منٹوں میں ایک کاغذ پر دستخط کئے گئے اور ہمیں وہ پرچہ تھما دیا گیا۔ ہم واپس امیگریشن کاونٹر پہنچے اور دوبارہ قطار میں شامل ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ پندرہ، بیس منٹ بعد ہماری باری آئی۔ اپنا پاسپورٹ اور ایکسرے رپورٹ والا پرچہ امیگریشن آفیسر کے حوالے کیا۔ آفیسر نے کاغذات پکڑے۔ اپنے سامنے رکھے اور اپنی نشست سے اٹھ کر کہیں چل دیئے۔ جاتے جاتے ہمیں، انتظار کرنے کا کہہ گئے۔ ہم پھر حیرت کی تصویر بنے سارا منظر دیکھتے رہے۔ اب نجانے کیا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے یہ صاحب اپنے کسی اعلیٰ افسر کو بلوانے گئے ہیں۔ ہمارا استقبال کرنے کے لئے۔۔۔ ہمیں طرح طرح کے خیال ستانے لگے۔ ہماری کیفیت اس وقت ایسی ہی تھی جیسی میٹرک کا امتحان دینے کے بعد رزلٹ آنے سے پہلے کسی ہم جیسے لائق طالب علم کی ہوتی ہے۔۔۔ پاس ہو جائیں گے انشااللہ۔ نہیں، فرسٹ ڈویژن تو کہیں گئی ہی نہیں۔ بڑی محنت کی تھی ہم نے۔ فرسٹ ڈویژن کیا چیز ہے۔ پوزیشن آئے گی ہماری۔۔۔ وہ بھی پہلی پورے سکول میں۔ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔ امی، ابو بہت خوش ہوں گے۔ سارے دوست حسد سے جل جائیں گے۔۔۔ ہوں۔ ہوں۔ ہاں۔۔۔ مگر میتھ کا امتحان کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوا۔ اور انگریزی تو ہے ہی

UrduDost Library UrduDost.com

پرائی زبان، ہمیں کیسے آسکتی ہے۔۔۔کہیں فیل ہی نہ ہو جائیں۔ ابو گھر سے نکال دیں گے۔ ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔۔۔ابھی اِسی ادھیڑ بُن میں تھے کہ سامنے ٹائلٹ سے امیگرشن آفیسر برآمد ہوئے اورنہایت سکون سے چلتے ہوئے اپنی نشست پر براجمان ہوگئے۔کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔آفیسر نے ہمارے کاغذات اٹھائے اور جائزہ لینے کے بعد داخلے کی مُہر ثبت کر دی۔ ہمارے بدن میں مسرت کی اک لہر دوڑ گئی۔ ایسے پُرمسرت لمحات زندگی میں شاذ ہی آتے ہیں۔امیگریشن سے داخلے کی اجازت ملنے کی خوشی ایسے ہی ہوتی ہے جیسے بوقتِ نکاح دولہا کی 'ہاں' کہتے ہوئے۔

ہم نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا۔تیزی سے چلتے ہوئے مسافروں کے لاؤنج میں پہنچے۔ برقی سائن بورڈ پر اپنی فلائٹ کے سامان کی ڈلیوری کے لیے مخصوص میکانکی زنجیر کا نمبر دیکھا اور بھاگ کر وہاں پہنچے۔ پتہ نہیں سامان یہاں موجود بھی ہے کہ نہیں۔ اِدھر، اُدھر ڈھونڈا۔سب مسافر اپنا سامان سمیٹ کر روانہ ہو چکے تھے۔اللہ کرے اپنا اپنا سامان ہی لے کر گئے ہوں۔کہیں ساتھ ہمارا سامان بھی ازراہِ مروت نہ لے گئے ہوں۔تھوڑی تلاش کے بعد ہمیں اپنا سوٹ کیس نظر آ گیا۔ ہماری جان میں جان آئی۔ ارے ایسے ہی ہم خدشات کا شکار ہو رہے تھے۔ یہ انٹرنیشنل فلائٹ کے معاملات اتنے خراب بھی نہیں ہوتے کہ ہمارا سوٹ کیس قطر، کویت پہنچ جائے یا یہاں سے کوئی اچک کر لے جائے۔سو طرح کے سیکیورٹی چیک ہوتے ہیں۔ہم کوئی پِچُھو کی ملیاں تھوڑی جا رہے ہیں کہ ایسی چیزیں وقوع پذیر ہو جائیں۔ ہم نے اپنا سوٹ کیس ٹرالی پر رکھا اور پُراعتماد انداز میں چلنے لگے۔ابھی کسٹم کا مرحلہ باقی ہے۔سامنے سائن بورڈز پڑھے۔ایک طرف لکھا ہوا تھا۔کسٹم چیکنگ اور دوسری طرف گرین چینل، ساتھ ہی وضاحت کی گئی تھی کہ گرین چینل کے ذریعے آپ بغیر چیکنگ کے جا سکتے ہیں۔ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کس راستے کے ذریعے جانا چاہیے۔ ہم نے تھوڑے غور وخوض کے بعد گرین چینل کا انتخاب کیا اور بغیر کسی رکاوٹ کے کسٹم کا مرحلہ طے کرتے ہوئے استقبالیہ لاؤنج میں آ نکلے۔ہمیں کسٹم کی کاروائی کرنا چاہیے تھی یا نہیں، کچھ خبر نہیں۔کسٹم حکام کو ہمیں چیک کرنا چاہئے تھا یا نہیں۔ یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔

UrduDost Library UrduDost.com

ہم جہاں پہنچ چکے تھے وہاں سے اب واپسی کی کوئی راہ نہیں تھی اور ہم واپس مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ استقبالیہ لاؤنج میں بیسیوں لوگ مختلف کتبے اٹھائے کھڑے تھے جن پر آنے والے لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ یہ کتبہ بردار مختلف مسافروں کو ریسیو کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہمارا نام کسی کتبے پر موجود نہ تھا۔ اس اہتمام کی ضرورت تو ایسے لوگوں کو ہوتی ہے جو لندن سے مطلقاً انجان ہوں اور ہم تو خیر یہاں کے گلی، کوچوں سے خوب واقف ہیں۔ اتنا ہی جتنا لندن کے پیدائشی واقف ہیں۔ ہمیں ایسے کسی اہتمام کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ ہم خود ہی اپنی راہ بنائیں گے۔ ہیتھروائر پورٹ سے ہم نے اپنا مَنی کارڈ لینا تھا جو ہماری آمد پر ہمارے اسپانسر نے بھیجا ہوا تھا۔ ہم نے متعلقہ جگہ رابطہ کیا۔ شیشے کے پیچھے ایک دیسی چہرے والے صاحب تشریف فرما تھے۔ ہم نے انگریزی میں اپنا تعارف کروایا۔ متعلقہ کاغذات دکھائے اور مَنی کارڈ طلب کیا۔ صاحب نے ہمارا فیملی نام پوچھا اور پاسپورٹ مانگا۔ ہم نے پاسپورٹ اسکے حوالے کرتے ہوئے، عرض کیا 'ایزد'۔ دیسی صاحب نے پاسپورٹ تھامتے ہوئے اردو میں کہا۔ پاکستان میں تو ایزد نام کبھی نہیں سنا۔ ان کی رواں اردو سن کر اندازہ ہوا کہ ہم تو اپنوں کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہوتا تو ہے مگر کم کم۔ صاحب نے ضروری کاروائی کی اور مَنی کارڈ ہمارے حوالے کر دیا۔ اب لندن ہے، ہم ہیں اور ہمارے پاس مَنی کارڈ ہے۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے خود کلامی کی۔

سامان والی ٹرالی دھکیلتے ہوئے ہم زیر زمین ٹرین سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ معلوماتی دفتر سے پوچھا۔ 'کنگز کراس' کونسی ٹرین جاتی ہے۔ جواب ملا۔ ہر ٹرین وہاں سے گزرتی ہے۔ کسی میں بھی سوار ہو سکتے ہیں۔ ہم نے پکاڈلی لائن کا انتخاب کیا۔ ساڑھے چار پاؤنڈ کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آ دھمکے۔ چند منٹ انتظار کیا ہو گا۔ کہ ٹرین آ پہنچی۔ اپنا سامان ٹرین میں دھکیلا اور خود خالی سیٹ تلاش کرنے لگے۔ ٹرین کے ڈبے میں سیٹیں لمبائی کے رخ بنی ہوئی ہیں اور درمیانی جگہ کھڑے ہو کر سفر کرنے والوں کے لئے ہے۔ ہمیں سیٹ مل گئی۔ لیکن اس کے سامنے سامان نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ جب ٹرین بھرے گی تو مسافر درمیانی راستے میں بھی کھڑے ہوں

UrduDost Library UrduDost.com

گے۔ہم نے اپنا سامان ٹرین کے ایک کونے میں رکھا اور خود اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ سامان پر بھی نظر رکھنے لگے۔ سامان پر نظر رکھنا اس لئے ضروری تھا کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم خاندانِ مغلیہ والی غلطی کریں۔ چوکنا نہ رہنے کی وجہ سے ان کی سلطنت گئی تھی اور اب ہمارا سوٹ کیس بھی جا سکتا تھا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ زیرِ زمین ٹرین نے سرکنا شروع کیا۔ اور ہم مسافروں کا جائزہ لینے لگے۔ٹرین میں گورے، گوریاں، بچے، بوڑھے۔ ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ ہیتھرو ائر پورٹ سے بہت سارے غیر ملکی بھی سوار ہو گئے۔ جن میں کالے، پیلے، سانولے، گورے سبھی شامل تھے۔ غیر ملکیوں اور بالخصوص پسماندہ ممالک سے پہلی مرتبہ آنے والے مسافر فوراً ہی پہچانے جا سکتے ہیں۔ وہ گھبرائے ہوئے، پریشان بلکہ بوکھلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ہم نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی لیکن لگ یوں رہا تھا کہ ہم بوکھلاہٹ پر نہیں، بوکھلاہٹ ہم پر قابو پا رہی ہے۔ٹرین تھوڑی دیر میں زیرِ زمین سرنگ سے نکل کر زمین پر آ گئی اور ہم گردونواح کا جائزہ لینے لگے۔ کہیں پر روایتی طرزِ تعمیر کے مکانات ہیں تو کہیں کھیت و کھلیان۔ٹرین رفتہ رفتہ گنجان آبادی والے شہری علاقے کی طرف گامزن تھی۔ اور قریباً پندرہ، بیس منٹ کے بعد ہم لندن شہر پہنچ چکے تھے۔لندن کو چھ زونز میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان چھ زونز کو اسطرح ترتیب دیا گیا ہے جیسے چھ ایسے دائرے ہوں جن کا مرکز ایک اور قُطر مختلف ہوں۔ مرکزی لندن کو زون ایک اور انتہائی بیرونی علاقے کو زون چھ قرار دیا گیا ہے۔ ہیتھرو ائر پورٹ زون چھ میں واقع ہے۔ ہماری ٹرین زون چھ سے زون ایک کی طرف رواں تھی۔ ہر زون کے تبدیل ہونے کے بعد بھیڑ اور گہما گہمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جونہی ٹرین گنجان آبادی میں داخل ہوئی، دوبارہ زیرِ زمین سرنگ میں چلی گئی۔ جس سے زیرِ زمین ریلوے نظام دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظام انیسویں صدی میں بنایا گیا تھا اور ابھی تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ آپ چشمِ تصور سے انیسویں صدی کو ملاحظہ کیجئے اور پھر لندن کے زیرِ زمین نظام کا مشاہدہ کیجئے۔ آپ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ برسبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ آج آپ دنیا میں جتنی بھی جدید سے جدید سہولیات اور نظاموں سے بہرہ ور ہوتے ہیں، ان سب کے پیچھے جدید ترین کمپیوٹر ٹیکنالوجی کارفرما ہوتی

UrduDost Library UrduDost.com

ہے۔اورآجکل کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے بغیر کوئی بھی نظام کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔اِس تناظر میں غور فرمائیے کہ انیسویں صدی میں تو کمپیوٹر موجود ہی نہیں تھے تو اس وقت زیرزمین ریلوے نظام تعمیر کرنا اور پھر اسے اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ چلانا کسی معجزے سے کم نہیں۔لندن شہر کی زیادہ تر آبادی زیرزمین ریلوے کے ذریعے ہی شہر میں ایک سے دوسری جگہ آتی جاتی ہے اور بالعموم انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ زیرِزمین ریلوے نظام سبک رفتار، کم خرچ،محفوظ اور آرام دہ تصور کیا جاتا ہے۔یہاں یہ بات بھی لائقِ تذکرہ ہے کہ لندن جیسے ترقی یافتہ شہروں کا پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام اسقدر اعلیٰ ہے کہ آپ اپنی گاڑی کی بجائے اس نظام کو استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔اپنی گاڑی میں ٹریفک جام اور پارکنگ عام طور پر مسائل پیدا کرتے ہیں۔جن کی وجہ سے عموماً شہر کے اندر کسی بھی مقام پر زیرِزمین ریلوے نظام کے ذریعے آپ اپنی گاڑی کی نسبت جلدی پہنچ جاتے ہیں۔اور دوسری چیز یہ ہے کہ پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرنا سماجی اعتبار سے کمتر نہیں سمجھا جاتا جبکہ ہمارے ہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ حالیہ سالوں میں ماحولیات اور توانائی کے حوالے سے پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کی بے حد حوصلہ افزائی کی جارہی ہے کیونکہ ذاتی گاڑیاں توانائی کا زیادہ استعمال کرتی ہیں اور نتیجتاً ماحول کو زیادہ آلودہ کرنے کا باعث ہیں۔شومئی قسمت، ہم نے آزادی کے بعد نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزار دیا ہے اور آج تک پورے ملک میں ایک بھی زیر زمین ریلوے ٹریک تعمیر نہیں کر سکے۔لیکن آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ قومی معاملات پر کڑھنا حساسیت کی علامت ہے اور حساسیت ہمیں ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے اس لئے اس سے جس قدر اجتناب ممکن ہو، کیا جانا چاہیئے۔لندن کے زیرِزمین ریلوے نظام کا اپنے ملک میں موجود نظام کے ساتھ موازنہ کرنے سے ہمیں جو احساسِ کمتری ہو رہا تھا، ہم نے اس کا حل ڈھونڈ نکالا۔گوروں کی بدقسمتی ہے کہ ہم جاپان میں کئی سال قیام پذیر رہے ہیں اور ٹوکیو کے پبلک ٹرانسپورٹ کے نظام اور بالخصوص زیرِزمین ریلوے نظام کا بھرپور مشاہدہ کر چکے ہیں۔اب ہمیں گوروں کی پس ماندگی پر ترس آنے لگا۔یوں لگ رہا تھا کہ لندن کا زیرزمین ریلوے نظام ٹوکیو کے نظام سے اسی قدر پس ماندہ ہے جتنا ہمارا لندن کے مقابلے میں ہے۔جاپان میں بڑے

UrduDost Library UrduDost.com

شہروں کے درمیان بُلٹ ٹرینیں چلتی ہیں اور بلٹ ٹرینون کی اسقدر بہتات ہے کہ اگر آپ ٹوکیو ٹرین سٹیشن جائیں تو آپ کو بلٹ ٹرینیں ایسے نظر آتی ہیں جیسے لاہور کے بادامی باغ اڈے سے دوسرے شہروں کو جانے والی بسیں۔ آج کل جاپان میں عام طور پر جو بُلٹ ٹرین استعمال ہوتی ہے اس کی رفتار تین سو کلو میٹر سے زائد ہے۔ مستقبل قریب میں ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی جارہی ہے جس میں ٹرین پہیوں کے گھومنے سے نہیں چلے گی بلکہ اس کے لئے مقناطیسی قوت بروئے کار لائی جائے گی۔ اُس ٹرین میں پہیے نہیں ہوں گے بلکہ یہ زمین سے تھوڑا سا اوپر ہوا میں معلق ہوگی۔ مستقبل کی اس ٹرین کی رفتار پانچ سو کلو میٹر فی گھنٹہ ہوگی۔ جاپان میں ٹوکیو اور اوسا کا کے درمیان بلٹ ٹرین پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں چلائی گئی تھی۔ پھر تصور کیجیئے کہ ایک ملک جسے دوسری جنگِ عظیم میں شدید شکست ہوئی ہو۔ بمباری سے جس کے شہر تباہ و برباد ہوئے ہوں اور جس پر دو عدد ایٹم بم گرائے گے ہوں۔ جس کا تمام نظامِ زندگی مفلوج کر دیا گیا ہو۔ جس کے پاس قدرتی معدنی ذرائع ناپید ہوں۔ جہاں دنیا میں سب سے زیادہ زلزلے آتے ہوں۔ حتیٰ کہ جس کے آئین تک کو گروی رکھ دیا گیا ہو۔ اُس قوم نے حربی تاریخ کی سب سے بڑی شکست کے صرف بیس برس بعد بُلٹ ٹرین جیسی انتہائی اعلیٰ ٹیکنالوجی تیار کر لی ہو۔ کیا یہ انسانی تاریخ کا ایک درخشندہ باب نہیں۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ میں آج بھی بلٹ ٹرین موجود نہیں۔ کیا یہ گوروں کے لئے لمحہ فکریہ نہیں ہے کہ عصرِ حاضر میں کیا ہو رہا ہے اور وہ کہاں کھڑے ہیں۔ جاپان اور برطانیہ کے ریلوے نظام کے اس موازنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں پاکستانی نظام ریلوے کا رونا بھول گیا اور گوروں پہ ہنسی آنا شروع ہوگئی۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جب ہماری کرکٹ ٹیم کسی بین الاقوامی ٹورنامنٹ میں شروع ہی میں کسی معمولی ٹیم سے ہار کر ٹورنامنٹ سے باہر ہوجاتی ہے تو ہم نہایت پریشان ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے کھلاڑیوں کے لتے لیتے ہیں، پھر کرکٹ بورڈ کو صلواتیں سناتے ہیں اور آخر میں حکومتِ وقت کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر مطمئن ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اطمینان مگر پھر بھی نہیں ہوتا۔ تو اطمینان بھلا کب ہوتا ہے۔ تب ہوتا ہے جب ہمارے پڑوسی ملک کی ٹیم کسی سے شکست کھاتی ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

زیر زمین ٹرین مختلف سٹیشنوں سے گزرتی ہوئی، زون ایک میں موجود کنگز کراس سٹیشن پر پہنچ گئی۔ ہم نے اپنا سامان ٹرین سے اتارا اور کیمبرج کے لئے روانہ ہونے والی ٹرین کی تلاش شروع کردی۔ اپنے بیگ سنبھالے اور زیرِ زمین پلیٹ فارم سے ایلی ویٹر کے ذریعے گراونڈ لیول پر پہنچ گئے۔ لندن شہر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے اپنی اپنی مگن میں گم ہیں۔ کوئی کسی کام کاج کے لئے بھاگا جا رہا ہے تو کوئی آرام سے بیٹھا بر گر کھا رہا ہے۔ ہم کافی دیر کھڑے مختلف مناظر دیکھتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم کوئی انگریزی فلم دیکھ رہے ہیں۔۔۔ مگر فیملی کے ساتھ۔۔۔ برقی سائن بورڈوں کی بھرمار ہے جن پر طرح طرح کی پبلسٹی جاری ہے۔ ٹریفک ایک سلیقے سے جاری ہے۔ کافی رش ہونے کے باوجود ہمیں کوئی دھکم پیل نظر نہیں آ رہی ہے۔ مرد جینز اور کوٹ پتلون میں ملبوس ہیں تو خواتین نے ٹراوزر یا سکرٹ پہن رکھے ہیں۔ پرفیوم کی خوشبو اڑاتی گوریاں آپ کے پاس سے گزرتی ہیں اور اگر آپ باہنر ہیں اور طریقے سے کسی گوری سے ٹکرانے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں تو وہ نہایت شستہ لہجے میں ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ آپ کو سوری کہتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ بشرطیکہ اسے یہ پتہ نہ چل سکے کہ آپ نے دانستہ ایسا کیا ہے اور اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ زہر آلود نظروں کے ساتھ آپ کی طرف دیکھے گی اور ہوسکتا ہے جاتے جاتے پولیس کو بھی بتا جائے۔ ایسی صورت میں آپ کے مستقبل کا دارومدار پولیس پر ہوگا۔ جو آپ سے سگریٹ لے کر خوش ہوگی نہ آپ کچھ دے دلا کر معاملہ رفع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

ہم نے گراونڈ لیول پر موجود ریلوے سٹیشن کے انفارمیشن ڈیسک سے کیمبرج کی ٹرین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے رابطہ کیا۔ جواب ملا۔ سامنے موجود الیکٹرانک بورڈ پر تمام ٹرینوں کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ اُس سے استفادہ کیجئے۔ سامنے موجود دیوہیکل بورڈ پر لندن سے دوسرے شہروں کو جانے والی تمام ٹرینوں کی معلومات درج تھیں۔ کیمبرج جانے والی ٹرین کی روانگی میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ ٹکٹ کے لئے ریزرویشن لاونج پہنچے تو وہاں موجود مسافروں کی ایک لمبی قطار ہمارے استقبال کے لئے موجود تھی۔ اس قطار کی موجودگی

UrduDost Library UrduDost.com

میں تو ہم اگلی ٹرین نہیں پکڑ سکتے۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ہمیں سیلف سروس ٹکٹ مشینیں نظر آ گئیں۔ فوراً وہاں پہنچے اور ٹکٹ لینے کے لئے مشین استعمال کرنا شروع کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان مشینوں پر آپ صرف کارڈ کے ذریعے ٹکٹ خرید سکتے ہیں۔ نقد رقم سے نہیں۔ بہت سٹپٹائے۔ پھر جاپان یاد آیا۔ جہاں شاذ ہی کوئی مسافر سٹاف سے ٹکٹ خریدتا ہے۔ ہر قسم کی سہولت مشینوں پر ہر وقت موجود ہے۔ اب قطار میں انتظار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہاں ہمیں قریباً آدھا گھنٹہ رکنا پڑا۔ اور کیمبرج کی ٹرین چھوٹ گئی۔ لیکن فوراً ہی اگلی ٹرین کا ٹائم بورڈ پر آنا شروع ہو گیا۔ ہم نے ٹکٹ خریدا اور سٹاف سے ٹرین کا پلیٹ فارم معلوم کرنے لگے۔ جاپان کی نسبت ملبورن اور لندن میں زبان کے حوالے سے بہت زیادہ مزا آتا ہے۔ آپ جو چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ جس سے جو چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔ جاپان میں پہلے آپ کو انگریزی تلاش کرنا پڑتی ہے پھر آپ درکار معلومات حاصل کر سکتے ہیں یا آپ کو جاپانی زبان آتی ہو جو کہ ایک مشکل کام ہے۔ لندن میں لیکن ایک دوسرے طرز کی مشکل درپیش ہوئی۔ وہ یہ کہ کیمبرج کی ٹرین کس پلیٹ فارم سے روانہ ہوگی، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ ہم نے سٹیشن سٹاف سے پوچھا، کہنے لگے معلوم نہیں۔ ہم نے بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم تو یہیں کھڑے ہیں۔ آپ پتہ کریں اور ہمیں بھی اطلاع کریں۔ سٹاف بے چارا، اپنی ڈیوٹی کے ہاتھوں مجبور۔ کافی تگ ودو کے بعد ہمیں پلیٹ فارم نمبر کا معلوم ہوا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے ٹیلی فون بوتھ ڈھونڈنا شروع کیا۔ پاکستان سے روانگی سے قبل ہم نے کیمبرج یونیورسٹی کی ویب سائٹ کے ذریعے اپنے لئے ایک رہائش کا انتظام کیا تھا اور ایک گورے کے گھر میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ اُس گورے کے ساتھ طے یہ ہوا تھا کہ جب ہم لندن سے ٹرین میں سوار ہونے لگیں گے تو اُس کو بذریعہ فون اپنی آمد کے بارے میں مطلع کر دیں گے اور وہ ہمیں کیمبرج سٹیشن پر لینے آجائے گا۔ تو، ٹیلی فون کرنا ناگزیر تھا۔ ہم نے پلیٹ فارم پر موجود سٹاف سے بوتھ کے بارے میں دریافت کیا۔ پتہ چلا۔ اس پلیٹ فارم پر بوتھ موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے پلیٹ فارم پر جانے کے لئے وقت ناکافی ہے۔ جب سے پوری دنیا میں موبائل فون عام ہوئے ہیں۔ پبلک ٹیلی فون بوتھ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان بوتھوں سے فون کرنے والے لوگوں کی

UrduDost Library UrduDost.com

تعداد بے حد کم ہو چکی ہے۔ اب یہی ممکن ہے کہ یہاں سے ٹرین میں سوار ہوا جائے اور کیمبرج پہنچ کر گورے کو اطلاع کی جائے۔ ہم نے اپنا سامان ٹرین میں رکھا اور شیشے کے ساتھ والی نشست سنبھال کر بیٹھ گئے۔ کیمبرج، لندن سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ ٹرین کے ذریعے یہ فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ والی نشستوں پر دو گوریاں رونق افروز ہوگئیں۔ ٹرین نے دھیرے دھیرے سرکنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لندن شہر کے گنجان علاقوں کو عبور کر کے وہ نواحی دیہات کی طرف رواں تھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔ سرسبز و شاداب کھیت، جا بجا موجود قدرتی ڈھلوانیں اور اُن پر اگائی ہوئی فصلیں، چراگاہوں میں موجود بہترین گھوڑے اور بھیڑیں اور ڈھلتے ہوئے سورج کی پھیلتی ہوئی سرخی نے مل کر ایسا سماں باندھا کہ ہم اس کی دلفریبی میں کھو گئے۔ ہمارے ہاں بھی دیہات اور ایسے مناظر ہر جگہ موجود ہیں مگر صفائی، سلیقہ اور ترتیب جیسی چیزیں ناپید ہیں۔ نواحِ لندن میں اور سارے برطانیہ میں آپ کسی گاؤں یا بستی گھوم لیں، آپ کو ہر چیز صفائی اور سلیقے سے ترتیب دی ہوئی ملے گی۔ ہم نے اپنے ساتھ بیٹھی گوریوں کی طرف دیکھا۔ ایک کے ہاتھ میں میگزین تھا اور دوسری کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم واقعی کیمبرج جیسی دانش گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ کم از کم ان گوریوں کا ذوقِ مطالعہ اور انہماک یہی ظاہر کر رہا تھا۔ ٹرین میں موجود زیادہ افراد گورے ہی تھے۔ برطانیہ میں غیر ملکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد قیام پذیر ہے۔ بعض جگہوں میں ان غیر ملکی باشندوں کی پوری بستیاں آباد ہیں۔ جہاں صرف ایک خاص رنگ و نسل کے لوگ ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ برصغیر سے تعلق رکھنے والے افراد بھی لاکھوں کی تعداد میں قیام پذیر ہیں۔ بلکہ اب تو ایسے پاکستانی اور ہندوستانی افراد اور گھرانے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جو تین یا چار نسلوں سے یہیں آباد ہیں۔ عام طور پر وہ لوگ جو خود پاکستان، ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہوئے ہیں، وہ اپنے دیس کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کی دوسری نسل میں یہ رابطہ کمزور ہو چکا ہوتا ہے اور تیسری نسل میں تو اپنے، پرائے اور پرائے اپنے ہو چکے ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں آپ جس قدر بڑے شہروں سے دور جاتے ہیں، دیسی باشندوں کی تعداد اتنا ہی کم ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ بڑے

UrduDost Library UrduDost.com

شہروں میں نوکری اور کاروبار کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمارے دیسی بھائی زیادہ تر انہی علاقوں میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ گورے اس سے مختلف طبیعت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ دیہاتی علاقوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بالعموم سہل پسند اور اپنی ذات میں مگن ہوتے ہیں۔ آدھا راستہ گزر چکا تھا۔ دونوں گوریاں پڑھنے میں محو تھیں۔ یہ ٹرین ہے یا کوئی کالج کی لائبریری جہاں مکمل سکوت چھایا ہوا ہے۔ ایسا خوبصورت سفر تو خوش گپیوں میں کٹنا چاہیے۔ ہم نے آہ بھری۔ آخر اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔ گپ شپ اور پھر سیاحوں کے ساتھ گپ شپ ہی تو حاصلِ زندگی ہے۔۔۔ اور ہے کیا زندگی میں۔۔۔ لگتا ہے کہ یہ گوریاں اپنے اپنے امتحان میں فیل ہونے کے بعد سپلیمنٹری امتحان کی تیاری کر رہی ہیں۔ اسی لئے تو پڑھائی میں اسقدر غرق ہیں۔ ہم نے کس قدر عمدہ زندگی گزاری ہے۔ سالانہ امتحان کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ اُس میں فیل ہونے کے بعد ہم نے کبھی سپلیمنٹری امتحان کو بھی سر پر سوار نہیں ہونے دیا۔ ایک سپلیمنٹری امتحان گزرا تو کئی اور ایسے ہی امتحان مِل جائیں گے۔ 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ پرے سے پرے پراں اور بھی ہیں'۔۔۔ ہم نے ٹرین میں چہل قدمی شروع کر دی۔ ٹرین کی بوگیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں اور بآسانی دوسری بوگیوں میں جایا جا سکتا تھا۔ ہم ساتھ والی بوگی میں گھس گئے۔ ایک نہایت سرخ وسفید بچہ ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد گیم جیتنے کی خوشی میں نعرے بلند کر رہا تھا۔ پاس ہی بیٹھی اسکی گوری ماں فیشن میگ کا مطالعہ بلکہ معائنہ کر رہی تھی۔ ہم نے بھی طریقے سے اس کے میگزین پر نظر ڈالی تا کہ اس کا مطالعاتی ذوق ملاحظہ کیا جا سکے۔ لیکن وہاں لفظوں کی بجائے تصاویر موجود تھیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ایک تصویر ایک ہزار الفاظ پر بھاری ہوتی ہے۔ ہمیں یوں لگا، غلط ہی کہتے ہیں۔ ایک ہزار نہیں ایک لاکھ الفاظ پر بھاری ہوتی ہے۔ ایسی ایسی ہوش رُبا تصاویر جنہیں دیکھ کر کان کی لوویں سرخ ہو جائیں۔ گوری کے حسنِ انتخاب کی داد دی اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔ ایک گورا بیٹھا کوئی ضخیم ناول پڑھ رہا ہے۔ ایک نوجوان جوڑا بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز گفت وشنید کر رہا ہے۔ اور ساتھ ہی جام پہ جام چڑھائے جا رہا ہے۔ ایک بوڑھی عورت اپنی چہرے پہ زمانے کے اونچ نیچ کے سلوٹیں سجائے

UrduDost Library UrduDost.com

ہوئے، ہمیں دیکھ کر خوشدلی سے بولی۔کیا تم خالی سیٹ ڈھونڈ رہے ہو۔ہم نے جواب دیا،نہیں ہم سفر کی تکان دور کرنے کے لئے مٹر گشت کر رہے ہیں۔وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ بہت اچھا۔ہم واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ٹرین، ہیٹ فیلڈ اور ہچن کے سٹیشنوں پر تھوڑی دیر رکتی ہوئی، رائسٹن پہنچ چکی تھی۔ ہمارے ساتھ بیٹھی دونوں گوریاں بدستور پڑھائی میں مصروف تھیں۔نجانے ابھی مزید کتنی دیر لگے گی کیمبرج پہنچنے میں،ہم بڑبڑائے۔اس دفعہ تیر نشانے پر لگا۔سامنے بیٹھی گوری بولی۔دس سے پندرہ منٹ میں ہم کیمبرج سٹیشن پر ہوں گے۔کیا تم پہلی دفعہ کیمبرج جا رہے ہو۔جی نہیں۔دراصل میں ٹرین کے ذریعے پہلی مرتبہ جا رہا ہوں۔اچھا،کیا تم کیمبرج یونیورسٹی جاؤ گے۔جی ہاں۔تو اور وہاں کیا ہے۔ہاں سب سے مشہور تو یونیورسٹی ہی ہے۔تم کیا پڑھتے ہو۔میں پڑھتا تو کچھ خاص نہیں، بس آوارہ گردی میرا شوق ہے۔اچھا شوق ہے۔اسی میں سپیشلائز کر لو۔کوشش تو یہی ہے۔ابھی گفتگو میں لطف پیدا ہی ہونے لگا تھا کہ اعلان ہوا،ہم کیمبرج ریلوے سٹیشن پہنچنے والے ہیں۔اترنے والے مسافر تیار ہو جائیں۔ہم نے اپنا بوریہ بستر سنبھالا۔اتنی دیر میں ٹرین پلیٹ فارم پر رینگ رہی تھی۔رکتے ہی ہم نے اپنا سامان نیچے اتارا اور ٹرین کو خدا حافظ کہہ دیا۔

سٹیشن پر اترنے والے تمام مسافر خارجی راستے کے ذریعے باہر نکل رہے تھے۔ہم نے باہر جانے کی بجائے فون بوتھ تلاش کیا اور ساٹھ پنس کے سکے اس میں ڈال کر مارک پالمر کو فون کیا۔مارک ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ ہم نے قیام پذیر ہونا تھا۔دو چار گھنٹیاں بجنے کے بعد ایک گورا،اپنے خالص انگریزی لہجے کے ساتھ لائن پر موجود تھا۔ہم نے اپنے آنے کی اطلاع کی۔ اُس نے خوش آمدید کہا اور ہمیں سٹیشن سے گھر لے جانے کے لئے نکل پڑا۔ٹکٹ مشین میں اپنا ٹکٹ ڈالا۔مشین کے دروازے کھلے اور ہم سٹیشن کے بیرونی حصے میں پہنچ گئے۔ مارک کا انتظار کرتے ہوئے ہمیں خیال آیا۔کہ یہیں کسی سٹور سے کم از کم رات کے کھانے کے لئے کچھ اشیاء خرید لی جائیں۔اتفاق سے ساتھ ہی ایک سٹور تھا۔ہم نے انڈے، بریڈ، تیار ملائشین چاول، دہی اور ڈرنکس وغیرہ خریدے اور مارک کا انتظار کرنے لگے۔سٹیشن کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہمارے علاوہ

UrduDost Library UrduDost.com

مختلف لوگ انتظار میں کھڑے تھے۔ ہر دو، چار منٹ کے بعد عام اور ڈبل ڈیکر بسیں اور ٹیکسیاں فراٹے بھرتے ہوئے مسافروں کو لاتیں اور واپسی پر انتظار میں کھڑے لوگوں کو لے جاتیں۔ ساتھ ہی ایک سائیکل اسٹینڈ تھا جہاں بیسیوں سائیکل کھڑے تھے۔ہمیں لاہور اور فیصل آباد کے ریلوے سٹیشن یاد آئے جن کے ساتھ بڑے بڑے سائیکل اسٹینڈ ہوا کرتے تھے۔ ہم اکثر گھر سے اپنی موٹر سائیکل پر سٹیشن پہنچا کرتے۔موٹر سائیکل اس اسٹینڈ پر کھڑی کرتے اور خود ٹرین پر سوار ہوکر اپنی منزل کے طرف چلے جاتے اور بعض اوقات تو ہفتہ بھر بعد واپس لوٹتے۔تو پھر سائیکل اسٹینڈ سے موٹر سائیکل لیتے اور گھر آ دھمکتے۔کیمبرج ریلوے اسٹیشن پر کھڑی سائیکلیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ہوا میں خنکی تھی۔ اگست کے مہینے میں ہمیں سردی کا احساس شروع ہو چکا تھا۔ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ہم گردونواح سے محظوظ ہوتے ہوئے مارک کا انتظار کررہے تھے۔ پندرہ، بیس منٹ کے بعد ایک دراز قد، ادھیر عمر، نیم خمیدہ گورا، گیلس پہنے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ چہرے پر داڑھی جس کے زیادہ بال کالے اور تھوڑے سفید، آنکھوں پر گول عدسوں والی عینک چڑھائے ہوئے بڑے عمدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔کیا تمہارا نام توصیف ہے۔ ہم نے فوراً ہاں کہا۔ جواب میں کہنے لگا۔ میرا نام مارک پالمر ہے۔میں نے اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی ہوئی ہے۔آؤ وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلتے ہیں۔ ہم نے سکون کا سانس لیا۔ایک بیگ خود سنبھالا۔ دوسرا مارک کے حوالے کیا اور پارکنگ میں پہنچ گئے۔ سامان گاڑی کی ڈِگی میں رکھا اور خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ کَس لیا۔ مارک نے گاڑی چلانا شروع کردی۔تمہارا سفر کیسا رہا۔ بہت اچھا۔اوہ، میں یہ تو پوچھنا بھول ہی گیا کہ تم کہاں سے آرہے ہو۔ہمیں یاد آیا کہ ہماری مارک کے ساتھ صرف ای۔میل کے ذریعے بات ہوئی تھی۔ جس میں ہم یہ ذکر کرنا بھول گئے تھے کہ ہم پاکستان سے آرہے ہیں۔ ہم نے جھٹ سے جواب دیا۔ پاکستان سے۔ مارک نے حیرانی سے پوچھا۔ پاکستان سے۔اس کا مطلب ہے آپ ایک طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے ہیں۔ جی ہاں، قریباً بارہ گھنٹے لگ گئے ہیں۔ ہوں۔۔۔آپ تو یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے۔ ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔آپ کو گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔ ہمارا گھر یہاں سے چھ سات میل دور ہوگا۔ دراصل کیمبرج ریلوے اسٹیشن شہر سے قدرے باہر ہے۔اور ہمارا گھر

UrduDost Library UrduDost.com

ملٹن میں ہے جو کیمبرج سے ملحقہ گاؤں ہے۔۔۔گاؤں ہے۔ ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہاں یہ ایک گاؤں ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔تم یقیناً اسے پسند کرو گے۔ مارک نجانے کن سڑکوں سے ہوتا ہوا گاڑی بھگائے جارہا تھا۔ پھر کہنے لگا۔قدیم زمانے میں کیمبرج بھی ایک گاؤں تھا لیکن اب یہ ایک شہر بن چکا ہے اوراس نے ساتھ والے کئی گاؤں ہڑپ کر لئے ہیں جواب کیمبرج کا ہی حصہ بن چکے ہیں۔ یہ علاقہ جس سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اس کا نام چیسٹرٹن ہے۔ یہ بھی ایک گاؤں ہی تھا۔اب یہ کیمبرج کا حصہ ہے۔لیکن خوش قسمتی سے ملٹن، جہاں میں رہتا ہوں، اب بھی ایک گاؤں ہے۔ یہ کیمبرج کے شمال میں ہے اور کیمبرج اور ملٹن کے درمیان سے موٹر وے گزرتی ہے جس کے ذریعے آپ لندن اور بیڈفورڈ جا سکتے ہیں۔اتنی دیر میں ہم موٹر وے کے اوپر موجود فلائی اوور پر پہنچ چکے تھے۔اس موٹر وے کے دوسری طرف ملٹن ہے۔ مارک دوبارہ بولا۔ملٹن سے کیمبرج جانے کے لئے ہر دس منٹ بعد بس سروس دستیاب ہے۔ اس لئے تمہارے لئے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم خاموشی سے مارک کی گفتگو سنتے رہے۔ملٹن میں داخل ہونے کے دو چار منٹ بعد مارک نے گاڑی دائیں طرف موڑی۔ کہنے لگا۔اس روڈ کا نام فین روڈ ہے۔تھوڑی دور جا کر آبادی ختم ہوگئی اور ہماری گاڑی ایک نسبتاً ویرانے میں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اونچی باڑ لگی ہوئی تھی۔ ہم کھلے آسمان تلے تھے۔ چاند کی روشنی سے پورا علاقہ روشن تھا۔ہم نے قدرے گھبراہٹ سے استفسار کیا۔ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اپنے گھر۔ مارک بولا۔دراصل میرا گھر ملٹن گاؤں سے باہر ہے۔ میرا کوئی ہمسایہ نہیں ہے کیونکہ وہاں صرف ایک ہی گھر ہے۔۔تو اس کے آس پاس کیا ہے۔ ہم نے پوچھا۔ کہنے لگا، کھیت ہیں۔خوبصورت، حقیقتاً خوبصورت۔ابھی تم تھکے ہوئے ہو۔صبح سارا علاقہ گھومنا۔تمہیں پسند آئے گا۔تو گویا تم ملٹن گاؤں سے بھی باہر رہتے ہو۔ ہاں گاؤں اور میرے گھر کے درمیان دو، تین کھیت ہیں۔دراصل گھر کے اردگرد کھیت ہی کھیت ہیں اسی لئے یہ جگہ رہائش کے لئے آئیڈیل ہے۔ ہمارا سر چکرانے لگا۔خدایا یہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔

گیسٹ ہاؤس

مارک نے گاڑی پارک کی۔ ڈِگی سے سامان نکالا۔ اور ہم گھر کے پچھواڑے سے گھوم کر سامنے آ گئے۔ مارک نے دروازہ کھولا اور ہم دونوں گھر کے اندر پہنچ گئے۔ بیرونی دروازہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس کے آگے ایک پتلا سا گلی نما راستہ تھا جس کے دائیں جانب باتھ روم اور ٹائلٹ اور بائیں جانب ایک قدرے بڑا کمرا تھا۔ گلی کے آخر میں کچن تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک ڈائننگ ٹیبل پڑا ہوا تھا۔ جس پر کتابیں، لیپ ٹاپ، پرنٹر، سگریٹ، استعمال شدہ اور غیر استعمال شدہ کاغذ، خطوط، بلز، یو۔ ایس۔ بی۔ سٹک، رسائل، اخبار اور نجانے کیا کچھ پڑا ہوتھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوار پر ایک بڑے سائز کا کلاک لگا ہوا تھا۔ جو سامنے سے کسی شیشے یا پلاسٹک کے خول سے ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ ہم اس کی بڑی بڑی سوئیوں کو ہاتھ سے چھو سکتے تھے۔ یہ ایک پرانا بلکہ کافی پرانا کلاک تھا۔ اس کلاک کو دیکھ کر ہمیں فیصل آباد گھنٹہ گھر مینار پر لگے ہوئے کلاک یاد آ گئے۔ یہ گھنٹہ گھر بھی انگریزوں کے دور میں ہی بنایا گیا تھا۔ مارک کے گھر میں لگے ہوئے کلاک کو دیکھ کر ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے فیصل آباد گھنٹہ گھر کا کلاک بھی مارک ہی نے بنا کر بھیجا ہو گا۔ یہاں سے گزر کر ہم اسی کمرے کے اگلے حصے میں پہنچے۔ یہاں پر ٹی۔ وی، لیمپ، ایک بڑا آئینہ جو دیوار پر لگا ہوا تھا، دو صوفے، گملے میں اِن ڈور پلانٹ، ایک نہایت پرانا لکڑی کا صندوق، انگیٹھی اور اُس میں دہکانے کے لئے کوئلے رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنے بیگ رکھے اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہم ابھی اِدھر اُدھر کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ مارک ٹائلٹ سے واپس آ گیا۔ کہنے لگا۔ آیئے، میں آپ کو کمرہ دکھا دوں۔ ٹی۔ وی۔ لاونج کی دیوار میں ایک درمیانے سائز کا دروازہ تھا۔ ہم اس سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس میں، بقول مارک کے، ایک عدد ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا۔ ہمیں وہ بیڈ سنگل لگا، نہ ڈبل۔ سنگل سے بڑا اور ڈبل سے چھوٹا۔ اس پر قرینے سے

UrduDost Library UrduDost.com

کوئلٹ دھرا ہوا تھا۔سامنے کونے میں ایک بہت چھوٹا سا،نہایت پرانا میز تھا۔جس کے ساتھ ایک کرسی جو بچوں کے لئے بڑی اور بڑوں کے لئے چھوٹی تھی، پڑی تھی۔میز کے اوپر ایک چھوٹے سائز کا بُک ریک دیوار پر لگا ہوا تھا۔جس میں بہت ساری سی۔ڈیز ترتیب سے سجی ہوئی تھیں۔بیڈ کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا بیڈ سائیڈ ٹیبل، لیمپ سمیت، پڑا ہوا تھا۔ساتھ ہی سردیوں میں کمرہ گرم رکھنے کے لئے ایک ہیٹر موجود تھا۔بیڈ کے پاؤں کی جانب نظر پڑی تو پوری دیوار کے ساتھ لکڑی کا بنا ہوا بک ریک بنوا کر فِٹ کروایا گیا تھا۔جس میں کتابیں ہی کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ناول،اٹلس،فکشن،نئی اور پرانی معلوماتی کتابیں۔سب اس میں سجی ہوئی تھیں۔ساتھ ہی ایک الماری پڑی ہوئی تھی جس کے سامنے سفید رنگ کا کپڑا لگایا ہوا تھا۔یہ آپ کا کمرا ہے۔مارک بولا۔الماری کے سامنے لگے ہوئے کپڑے کو اٹھا کر کہنے لگا۔آپ اس میں اپنا سامان رکھ سکتے ہیں۔بُک ریک کے اوپر کئی ایک بند ڈبے پڑے ہوئے تھے جن پرُ کیسے برٹش سٹیم ریلوے نے ہماری تہذیب و تاریخ کو تبدیل کیا ہے‘ تحریر تھا۔اس کمرے میں ایک عدد درمیانے سائز کی کھڑکی موجود تھی جس میں شیشے جڑے ہوئے تھے۔یہ کھڑکی گھر سے باہر کی طرف کھلتی تھی۔ایک دیوار پر فریم میں سٹیم سے چلنے والی ٹرین کی کھُلے کھیتوں سے لی گئی تصاویر لگائی گئی تھیں۔بیڈ کے ساتھ دیوار پر ہاتھ سے بنے ہوئے پنسل سکیچ لگائے گئے تھے۔ایک سکیچ میں ایک بچہ سٹول پر بیٹھا بینجو بجا رہا تھا اور اس کے قدموں میں مرغے اور مرغیاں مخالف سمت میں منہ کئے کھڑے تھے۔یوں لگ رہا ہے کہ مرغے اور مرغیوں کی ابھی تکرار ہوئی ہے اور وہ ناراضی کے عالم میں ’کُٹی‘ کر کے کھڑے ہیں اور بچہ غالباً بینجو بجا کر انہیں شانت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔دوسرے سکیچ میں ایک گورا لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔اس نے اگلی طرف جھک کر ایک وائلن سنبھالا ہوا ہے۔سکیچ کی خوبصورتی یہ ہے کہ وائلن بجانے سے سُر کی آواز کے ساتھ تتلیاں برآمد ہو رہی ہیں۔تیسرا سکیچ مارک کا ہے جس میں اسکی مختلف عمر کی تصاویر لگائی گئی ہیں۔اور نیچے اسے پچاسویں سالگرہ کی مبارکباد دی گئی ہے۔چوتھے سکیچ میں ایک خوبصورت گوری، پری کے انداز میں دکھائی گئی ہے۔پری اپنے سامنے بنی ہوئی لکڑی کی ریلنگ کے اوپر جھک کر، ترچھی نگاہ سے اوپر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ایک اور سکیچ

UrduDost Library UrduDost.com

ایک ایسے اینگری ینگ مین کا بنایا گیا ہے جس نے پرانی جینز کی جیکٹ پہن رکھی ہے۔۔۔ مارک نے ہمیں بلا کر کہا۔ آؤ میں تمہیں کچن دکھا دوں۔ درمیانے سائز کے کچن میں کھانے پکانے کے لئے ہر چیز موجود ہے۔ الیکٹرک اوون لگا ہے جس میں چار مختلف چولہے فِٹ ہیں۔ ہر چولہے میں چھ مختلف کوائل لگے ہوئے ہیں۔ ہر کوائل کا اپنا ایک درجہ حرارت ہے۔ کپڑے دھونے کے لئے واشنگ مشین موجود ہے۔ فریج اور فریزر علیحدہ علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ کچن میں کئی شیلف اور ریک بنے ہوئے ہیں جن میں نمک، مصالحے اور ایسی ہی دیگر اشیاء موجود ہیں۔ شیلف اور فرش پر شراب کی خالی اور بھری ہوئی بوتلیں پڑی ہوئی ہیں۔ مارک بولا، تم اپنی سہولت کے مطابق کچن کی ہر چیز استعمال کر سکتے ہو۔ ہم واپس اپنے کمرے میں آئے اور اپنا سامان کھولنے لگے۔۔۔ ہمارا سوٹ کیس لاک ہے۔ اسکی چابی کہاں ہے۔ اپنا ہینڈ بیگ ٹٹولا۔ جیبیں بار بار کھنگالیں۔ قدرے بد حواسی میں، جلدی جلدی ہر چیز کی تلاشی لی لیکن سوٹ کیس کی چابی ندارد۔ اب کیا کیا جائے۔ ہینڈ بیگ سے ٹوتھ برش اور شیونگ کِٹ نکال کر باتھ روم میں لے گئے۔ ہاتھ منہ دھوئے۔ واپس آ کر کھانے کی اشیاء نکالیں اور کچن میں گھس گئے۔ اتنے میں مارک بولا۔ کیا آپ کے پاس رات کے کھانے کے لئے فوڈ آئٹم موجود ہیں۔ جی ہاں۔ ہم نے آتے ہوئے ریلوے سٹیشن کے پاس موجود سٹور سے خرید لی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم نے بے مزہ کھانا زہر مار کیا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹنے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن ہمارا سلیپنگ سوٹ تو سوٹ کیس میں ہے اور اُس کی چابی کہیں گم ہو گئی ہے۔۔۔ اب کیا کیا جائے۔۔۔ کرنا کیا ہے۔ جو کپڑے پہن رکھے ہیں انہی میں سو جایئے۔ لیکن ہم نے تو ڈریس پینٹ پہن رکھی ہے اور وہ سونے کے لئے بالکل آرام دہ نہیں ہے۔۔۔ لیکن اب کوئی اور چوائس ممکن نہیں۔ سو، بیڈ پر لیٹے۔ ٹیبل لیمپ آف کیا۔ لیٹتے ہی سردی کا احساس شروع ہو گیا۔ تو اب کوئلٹ اوڑھنا پڑے گا۔ ارے نہیں۔ اگست کے مہینے میں تو اے۔ سی چلا کرتے ہیں پھر بھی سکون نہیں آتا۔ کوئلٹ اوڑھ کر سونا تو آدابِ گرما کے خلاف ہے۔ ابھی ہم اسی ادھیڑ بُن میں ہی تھے کہ سردی کا احساس زیادہ ہو گیا اور ہم نے سوچے سمجھے بغیر کوئلٹ کھینچا اور اپنے اوپر ڈال لیا۔ تھکن سے بدن نڈھال ہو چکا تھا۔ جلدی ہی نیند

UrduDost Library UrduDost.com

کی آغوش میں چلے گئے۔ معلوم نہیں کتنا وقت گزرا ہوگا کہ یکا یک کسی انجن کے کان پھاڑنے اور دل دہلا دینے والے شور سے ہماری آنکھ کھلی اور ساتھ ہی زلزلے کے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ جو پوری طرح بند نہیں تھا زور کے ساتھ دہلیز سے ٹکرایا۔ کمرے کا فرش لرز رہا تھا اور ہم اپنے بیڈ پر ہچکولے لے رہے تھے۔ یا الٰہی۔ ایں چیست؟ خوف کے مارے کمرے سے باہر بھاگے۔ میز سے ٹکرائے۔ انگیٹھی کو اُلٹایا۔ ٹی۔ وی۔ لاؤنج میں پڑے برتن فرش پر گرے۔ اندھیرے میں نجانے کس کس چیز سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کی۔ اتنے میں مارک نائٹ گاؤن پہنے۔ آنکھیں ملتا ہوا، اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ کیا ہوا۔ اُس نے پوچھا۔ ہم نے کہا۔ یہ شور اور زلزلہ کیا ہے۔۔۔ اوہ، کچھ بھی نہیں۔ ٹرین گزری ہے۔ جی۔ ٹرین۔۔۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔ کہنے لگا۔ گھر کے ساتھ ہی تو ریلوے ٹریک ہے۔ اچھا، اب ہمیں سمجھ آئی کیا ہوا ہے۔ واپس اپنے کمرے میں آئے اور دوبارہ سونے لگے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے شعور کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ٹرین دوبارہ بھی آسکتی ہے اور یہ حادثہ پھر ہوسکتا ہے۔ اس لئے خوف زدہ ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسی صورتِ حال میں انسان غور و خوض کے بعد خوفزدہ نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو بس آناً فاناً ہوتا ہے اور آپ کتنے ہی کمپوزڈ ہوں اور پُرسکون رہنے کی کوشش کریں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب آپ خوفزدہ ہو گئے ہیں۔۔۔ ندامت کی ضرورت نہیں بہادر سے بہادر آدمی بھی خوف کا شکار ہو سکتے ہیں۔۔۔ ہم تو اکثر ہی خوف زدہ رہتے ہیں اسی لئے بے حد بہادر واقع ہوئے ہیں۔ ہم دوبارہ سُو گئے۔ معلوم نہیں کتنا وقت گزرا ہوگا، پھر وہی شور اور زلزلہ۔ اس دفعہ ہم نے حواس پر قابو رکھنے کی کوشش کی لیکن خوف پھر ہم پر حاوی ہو گیا۔ خدشات کا تانتا بندھ گیا۔ اگر ٹرین کسی وجہ سے ہماری قیام گاہ سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا۔۔۔ ہونا کیا ہے۔۔۔ ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں۔۔۔ ارے نہیں۔ ٹرین ٹریک پر سیدھا چلتے ہوئے لڑھک کیسے سکتی ہے۔۔۔ کیوں نہیں، سب کچھ ہوسکتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو مارک یہاں کیسے رہتا ہے؟ پتہ نہیں کیسے رہتا ہے۔ ویسے بھی اس نے تو اپنی زندگی کی اننگز کھیل لی ہوئی ہے۔ اب آوٹ بھی ہو جائے تو کیا ہے۔ اور ہم نے تو ابھی سینچری بنانی ہے۔ اتنی دیر میں ایک اور ٹرین آ گئی۔ اس

UrduDost Library UrduDost.com

مرتبہ ہم نے بقائمی ہوش وحواس سب کچھ دیکھا، سنا،محسوس کیا۔۔۔ٹرین آتی ہے۔شور ہوتا ہے۔ دروازے کھٹکتے ہیں۔مکان کی چھت ہلتی ہے۔فرش لرزتا ہے۔زلزلے کی کیفیت ہوتی ہے۔شور کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اورٹرین گزر جاتی ہے۔اس میں کیا پریشانی ہے۔۔۔لیکن یہ تو بار بار ہو گا۔گھر بدل لیا جائے۔۔۔ہاں۔مگر اتنی جلدی گھر کیسے ڈھونڈا جائے۔ ہاں دیکھتے ہیں۔ صبح دیکھیں گےاور ہم دوبارہ سو گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو مارک ناشتہ کر رہا تھا۔ہم بھی ٹی۔وی۔لاؤنج میں صوفے پر آ بیٹھے۔خوب۔ کیا آپ رات اچھی طرح سوئے۔ مارک بولا۔سوئے تو نہیں، کروٹیں ہی لیتے رہے۔اصل میں نئے بیڈ پر سونے میں ذرا مشکل ہوتی ہے۔ہم نے جواب دیا۔ہاں چند دنوں بعد آپ اس بیڈ کے عادی ہو جائیں گے۔ مارک نے ہمیں تسلی دی۔اوہ مجھے یاد آیا۔رات تم ڈر گئے تھے۔ وہ ٹرین گزری تھی۔۔۔ہاں،مگر سارا گھر کیوں لرز رہا تھا۔۔۔ہوں۔دراصل یہ گھر ۱۸۵۰ میں بنایا گیا تھا۔شائد اس کی تعمیر میں ٹرین کے گزرنے سے پیدا ہونے والے ارتعاش کوملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا۔۔۔کیا۔یہ گھر واقعی ۱۸۵۰ میں تعمیر ہوا تھا۔ہم نے حیرت کا اظہار کیا۔میرا خیال یہی ہے۔ مارک نے جواباً کہا۔ہمارے ہاں تو اتنے پرانے قصے کتابوں میں بھی خال خال ہی ملتے ہیں۔ہم کسمسائے۔مارک ہنس دیا۔میں خوش قسمت ہوں کہ اس تاریخی گھر میں رہتا ہوں۔ویسے تم یہاں اس سے بھی پرانے گھر اور عمارات دیکھ سکتے ہو۔ مارک نے ہمیں ساتھ لیا اور گھر سے باہر آ گیا۔ اوہ،میرے خدا۔۔۔یہ تو ریلوے ٹریک سے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ گھر اور ٹریک کے درمیان خاردار تار لگی ہوئی ہے تا کہ کوئی غلطی سے بھی ٹریک پر نہ جا سکے۔گھر کی بیرونی دیوار پر پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں چڑھائی گئی تھیں۔یہ بیلیں بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔لگتا ہے انہیں گھر کی چھت تک پہنچنے میں کافی عرصہ لگا ہو گا۔ہم نے تبصرہ کیا۔جی ہاں۔ میں نے یہ بیلیں آج سے تیس سال پہلے لگائی تھیں۔ مارک بولا۔۔۔کیا،تم اس گھر میں پچھلے تیس سالوں سے مقیم ہو۔۔۔ہوں،نہیں،بتیس سال ہو گئے ہیں۔میری عمر اُس وقت اٹھائیس سال تھی۔ جب میں اس گھر میں آیا تھا۔ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔بتیس سال اوراس ویرانے میں۔خیر،دنیا میں کیا

نہیں ہوتا۔ مارک بولا۔ یہ ریلوے ٹریک کیمبرج کو ایلی سے ملاتا ہے اور یہ ۱۸۵۰ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں پر ریلوے کراسنگ ہے جہاں پھاٹک لگا دیا گیا۔ پھاٹک کھولنے اور بند کرنے کے لئے جس آدمی کو مقرر کیا جاتا، یہ گھر اس کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی لئے اسے گیٹ ہاوس کا نام دیا گیا تھا۔ کافی عرصہ پہلے پھاٹک کو آٹو میٹک کر دیا گیا۔ اب ٹرین کے آنے سے پہلے پھاٹک خود بخود بند ہو جاتا ہے اور جانے کے بعد کھل جاتا ہے۔ اب کسی گیٹ کیپر کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ریلوے والوں نے گھر ویسے کا ویسا ہی رہنے دیا۔۔۔ تو تم یہاں کیسے رہتے ہو، ہم نے تجسس کا مظاہرہ کیا۔ مارک کہنے لگا۔ بہت عرصہ پہلے، میں کچھ دیر کے لئے یہاں گیٹ کیپر کے طور پر کام کرتا تھا۔ ان دنوں میں ہی میں یہاں شفٹ ہوا تھا۔ بعد میں گیٹ کیپر کی ذمہ داری تو ختم ہوگئی۔ البتہ ریلوے والوں نے گھر میرے پاس ہی رہنے دیا اور میں اس کا باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتا ہوں۔ گھر کے برابر، ریلوے ٹریک کے سامنے، مارک نے باڑ لگا کر گارڈن بنا رکھا تھا۔ ہم مارک کے ساتھ گارڈن میں آ گئے۔ اوہ، زبردست۔۔۔ ہم پکارے۔ اس گارڈن میں تو پورا ریلوے ٹریک بنا ہوا ہے۔ ایک لُوپ کی شکل میں۔ اور یہ صرف لُوپ نہیں ہے۔ اس میں تو ایک ٹریک کو دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوئے اور کئی جگہوں پر دو لائنوں کو ملتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ ایک طرف مٹی ڈال کر ڈھیر بنایا ہوا ہے۔ ریلوے ٹریک اس کے اندر سے گزارا گیا ہے۔ سرنگ کا بہترین نمونہ ہے یہ۔ کہیں ڈھلوانیں بنائی گئی ہیں اور کہیں سگنل گاڑے ہوئے ہیں۔ ٹریک کی چوڑائی چار پانچ انچ ہوگی۔ اس پر کھلونا نما سٹیم انجن اور اس کے ساتھ مسافروں کے لئے بوگیاں لگائی گئی ہیں۔ یہ کھلونا نما ماڈل کس نے بنایا ہے۔ ہم نے پوچھا۔ مارک بڑے فخریہ انداز میں بولا۔ میں نے۔ میرے پاس اس کے علاوہ دوسری ٹرینیں بھی ہیں۔ یہ سب میں نے خود بنائی ہیں۔ بغیر کسی کی مدد کے۔۔ واقعی، یہ تو پورے ریلوے سسٹم کا حقیقی نمونہ ہے۔ اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ ہم نے تحسین کی۔ مارک بولا۔ شکریہ۔ گارڈن میں ایک بے حد بڑا درخت لگا ہوا تھا۔ جس پر سبز رنگ کے گولے لگے ہوئے تھے۔ یہ کس چیز کا درخت ہے۔ ہم نے سوال کیا۔ یہ اخروٹ کا درخت ہے۔ مارک نے ہمارے علم میں اضافہ کیا۔ اخروٹ تو ہم بچپن سے کھاتے چلے آئے ہیں مگر اسکا درخت آج دیکھا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہم بہت گھومے ہوئے

UrduDost Library UrduDost.com

ہیں۔اور شائد کہیں اخروٹ کے درخت دیکھے بھی ہوں مگر یاد نہیں۔اب البتہ یاد رہے گا۔مارک کا اخروٹ کا درخت دیکھ کر ہم نے خود کلامی کی۔درخت کے نیچے ریل کی بوگی نما کمرہ تعمیر کیا گیا تھا۔ ہم نے اندر جھانکا۔۔اس میں طرح طرح کے اوزار پڑے تھے۔چھوٹی مشینیں بھی موجود تھیں۔ ہم نے بغور جائزہ لیا۔کسی بھی ورکشاپ میں جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب کا سب یہاں موجود ہے۔مارک ہمیں دیکھ کر بولا۔یہ میری ورکشاپ ہے۔۔۔بہت عمدہ۔تمہارے پاس تو بڑی عمدہ ورکشاپ بھی ہے۔مارک کی گاڑی گھر کے پچھواڑے میں بغیر کسی شیڈ کے کھڑی تھی، ساتھ ہی ایک بہت پرانا سا شیڈ بنا ہوا تھا جس میں سارا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔

ہم واپس گھر کے اندر آ گئے۔ناشتہ بنایا۔الماری میں سے مگ نکالا۔چائے ڈالی اور ٹی۔وی۔لاؤنج میں ناشتہ کرنے لگے۔ساتھ ہی ساتھ ٹی۔وی۔بھی دیکھ رہے تھے۔چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے لئے مگ اٹھایا۔جونہی مگ پر نظر پڑی۔ہمیں جھٹکا سا لگا۔اس پر فور سٹروک انجن کا تھرموڈائی نیمک سائیکل بنا ہوا تھا۔ذرا توجہ کی۔مگ کو چاروں طرف گھما کر دیکھا۔فور سٹروک انجن کے چاروں سٹروک، تصاویر کے ساتھ نہایت آسان زبان میں لکھے گئے تھے۔اسکا مطلب ہے مارک کو انجینئرنگ سے کافی لگاؤ ہے اور بالخصوص انجن ٹیکنالوجی سے۔ہم نے یہ چیزیں ساری عمر پڑھی ہیں اور پڑھائی بھی۔اپنے بارے میں تو ہم کچھ عرض کرنا پسند نہیں کرتے کہ ہمیں تو علم اور ٹیکنالوجی سے بے حد لگاؤ ہے۔۔۔البتہ ہم نے زندگی میں بے شمار انجینئرنگ کے پروفیسر دیکھے ہیں۔سب کی ٹیکنالوجی کے ساتھ وابستگی اور دلچسپی صرف کلاس روم تک ہی محدود دیکھی ہے۔ جونہی کلاس سے باہر آئے، کسی بھی قسم کی تکنیکی گفتگو سے حتی الامکان اجتناب برتتے ہیں۔آپ اُن سے کرکٹ کا سکور پوچھ لیں، وہ سکور بھی بتا دیں گے جو اگلے بال پر بننا ہے۔سیاسی معاملات پر گفتگو تو خیر ان کے گھر کی لونڈی ہے۔مالٹا اور سماٹرا تک کی حکومتیں کیا گُل کھلانے والی ہیں۔سب خبر ہے۔فلمی دنیا میں پردہ سیمیں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ایسی جامع معلومات فراہم کریں گے کہ عقل دنگ اور رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔مذہب اور انسان کا کیا تعلق ہے۔ایسا مفصل بیان کریں گے کہ آپ کو گمان ہو گا کہ علامہ اقبال نے انہی سے پڑھ کر اپنے افکار سنوارے ہوں گے۔۔۔ذرا آپ انجینئرنگ میں ان کے سبجیکٹ کی بات کریں تو بے مزہ ہو جائیں گیا اور بے

UrduDost Library UrduDost.com

اعتنائی سے دوسری طرف جھانکنے لگیں گے۔۔۔کیا تم انجینئر ہو۔ہم نے مارک سے سوال کیا۔ نہیں، میں نے تھیٹر اور فلم میکنگ میں ڈگری کی ہوئی ہے۔اُس نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔لیکن تمہارے گھر میں ہر دوسری، تیسری چیز میں انجینئر نگ نظر آتی ہے۔ہم نے مزید تجسس کا اظہار کیا۔وہ دراصل میرے مشاغل میں سے ایک ہے۔۔۔مشاغل میں سے بھی ایک۔اتنا کچھ تو ہمارے انجینئر نگ کے پروفیسروں کے پاس بھی نہیں ہوتا جتنا کچھ تم نے اکٹھا کر رکھا ہے۔ہم نے دل ہی دل میں مارک کی ستائش کی۔ہم نے ناشتہ ختم کیا تو مارک نے کہا۔آؤ میں تمہیں اپنا کمرہ بھی دکھاؤں۔مارک کا کمرہ کیا تھا۔ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ایک بیڈ پڑا ہوا تھا۔دیواروں کے ساتھ بک ریک لگے ہوئے ہیں۔جن میں انگریزی ڈکشنریوں سے لے کر ڈراموں، سیاست اور تاریخ تک بے شمار موضوعات پر کتابیں موجود تھیں۔آپ آجکل کیا کام کرتے ہیں۔ہم نے مارک سے پوچھا۔میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ویسے میں رائٹر ہوں۔ناول لکھ رہا ہوں۔کیا آپ کا کوئی ناول شائع ہوا ہے۔ہم نے مزید کُریدا۔ابھی میں لکھ رہا ہوں۔مکمل کرنے کے بعد کسی پبلشر سے رابطہ کروں گا۔۔۔تو کیا آپ کا ناول چھپ جائے گا۔۔۔کچھ کہہ نہیں سکتا، وقت آنے پر پتہ چلے گا۔۔۔خوب، مارک کے حالات ہمارے رائٹرز جیسے ہی ہیں۔

مارک پالمر ایک شریف اور نفیس انسان تھا۔وہ ۱۹۵۰ میں کیمبرج میں پیدا ہوا۔اس کا ایک بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔اس کا باپ ایئر فورس میں مکینک تھا اور اپنی محنت اور مہارت کے بل بوتے پر انجینئر کے عہدے تک پہنچا تھا۔اسکی ماں ہاؤس وائف تھی۔اسکے ماں باپ کے باہمی تعلقات کشیدہ رہتے تھے۔لیکن وہ اپنے بچوں کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔اس کے گھر میں ماں باپ کا جھگڑا ایک معمول کی بات تھی۔جس نے اس کے بچپن کو بے حد متاثر کیا۔جب اس کی عمر گیارہ برس تھی تو اس کے ماں باپ کمپرومائز کی زندگی سے تنگ آ گئے اور بالآخر انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔ماں باپ کی علیحدگی نے مارک کو ایک اور صدمے سے دوچار کر دیا۔اس کی ماں بنیادی طور پر مذہبی رجحانات کی حامل خاتون تھی۔وہ ہر وقت بائبل اور چرچ کے لئے بے تاب رہتی۔اور اپنی اولاد کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی۔لیکن مارک کا میلان مذہب کی طرف نہ تھا۔جس کی وجہ سے اس کی ماں اسے ڈانٹتی رہتی اور مارک اس مسلسل اذیت

UrduDost Library UrduDost.com

سے تنگ آ گیا۔ جب اسکی عمر پندرہ برس ہوئی تو اسکی ماں نے اسے متنبہ کیا کہ وہ مذہبی رسومات باقاعدگی سے ادا کیا کرے یا بصورت دیگر گھر چھوڑ دے۔ اس نے گھر چھوڑنے کو ترجیح دی۔ مارک ہمیں آپ بیتی سناتے ہوئے کہنے لگا۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ مذہبی لوگ رسومات اور عبادات پر کیوں اتنا زور دیتے ہیں جبکہ انسانی معاملات اور معاشرتی اخلاقیات کی ان کے ہاں اہمیت کیوں کم ہے۔ میری ماں کے لئے مذہب ہی اہم تھا۔ اسے مجھ سے کوئی انسیت نہ تھی اور آج پنتالیس سال گزرنے کے بعد بھی میری ماں ویسی ہی ہے جیسی وہ میرے عالمِ نوجوانی میں تھی۔۔۔ میں نوجوانی میں موسیقی کا دلدادہ تھا اور گلوکار بننا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک مقامی سطح کے موسیقی میلے میں پرفارم کیا۔ بے شمار لوگوں نے مجھے سراہا۔ میرے لئے وہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ لیکن میرے ماں باپ میرا کنسرٹ تک دیکھنے نہ آئے۔ انہوں نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہ کی۔۔۔ کسی تکلینکی مسئلے اور دفتری تنازعے کی وجہ سے میرے باپ کی ایئر فورس کی نوکری ختم ہوگئی۔ میرے دادا، دادی کی نیو مارکیٹ روڈ کیمبرج میں شراب بیچنے کی دکان تھی۔ میرے باپ نے میری دادی کے پاس دکان میں نوکری کر لی۔ لیکن وہ اندر ہی اندر اس نوکری سے انتہائی ناخوش تھا۔ میری ماں سے علیحدگی اور ایئر فورس سے برخاستگی کے بعد وہ حد درجہ ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ اور ایک روز اس نے خودکُشی کر لی۔ مجھے آج تک اپنے باپ کے آخری دنوں کے نفسیاتی ہیجان اور خودکشی کا افسوس ہے۔۔۔ کیا تم اپنی ماں سے ملتے رہتے ہو، ہم نے استفسار کیا۔ ہاں کبھی کبھار فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔ وہ برطانیہ کے شمال میں ہڈرس فیلڈ میں رہتی ہے۔ میری بہن بھی اس کے ساتھ رہتی ہے۔ میرا اپنی بہن کے ساتھ زیادہ رابطہ رہتا ہے۔۔۔ میں پندرہ سال کی عمر میں اپنی ماں کے رویے سے تنگ آ کر گھر چھوڑ کر لندن چلا گیا۔ میں نے وہاں گٹار بجانا سیکھا اور فوک کلبوں میں گانا شروع کر دیا۔ لیکن اس کام سے میری آمدنی انتہائی ناکافی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونا شروع ہوا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ میں نے چوبیس برس کی عمر میں جی۔سی۔ایس۔سی یعنی میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میرے ہم عمر یہ امتحان سترہ برس کی عمر میں پاس کر چکے تھے۔ میں زمانے کے تھپیڑے سہتا رہا۔ اسی اثنا میں باربرا میری گرل فرینڈ بن گئی۔ میری باربرا کے ساتھ اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ ہم دونوں خوش رہتے تھے۔ لیکن پھر مجھ سے ایک خطا سرزد ہوگئی۔۔۔ ہم نے پوچھا۔ وہ

UrduDost Library UrduDost.com

کیا۔ مارک کہنے لگا۔ میں بار برا کی ایک سہیلی کو پسند کرنے لگا۔ میری پسند عشق کی حدوں کو چھونے لگی۔ بار برا کو یہ چیز بے حد ناپسند تھی۔ اس نے میرے اس عشق یا فلرٹ سے تنگ آ کر مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ میں دوبارہ تنہا ہو گیا۔ میں جذباتی بحران سے گذر رہا تھا۔ کہ ایک رات کلب میں میری ملاقات ایک اور لڑکی سے ہوگئی۔ اس لڑکی کا نام بھی بار برا ہی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ چند مہینوں کی ملاقات کے بعد ہم نے اکٹھے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ بار برا دوئم بھی اچھے مزاج کی نوخیز سی لڑکی تھی۔ ہم دونوں کبھی جھگڑ پڑتے لیکن پھر خود ہی صلح کر لیتے۔۔ آپ دونوں بڑے صلح جو قسم کے لوگ تھے۔ ہمارے ہاں تو رنجشیں بھلانے میں لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہے۔ ہم نے لقمہ دیا۔۔۔ وہ دراصل میں بار برا دوئم کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مارک نے جواب دیا۔ اکثر میں ہی اسے منایا کرتا تھا۔ میرے لندن قیام کے دوران ۱۹۶۸ کی کلچرل مومنٹ بھی عروج پر تھی۔ میں بھی اس تحریک سے متاثر ہوا۔ اس تحریک کے زیرِ اثر میرا اور میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ انفرادی زندگی میں فرد کی خوشی ہی سب سے اہم ہے، معاشرے کی اقدار اور رسم و رواج بالکل بے معنی چیزیں ہیں۔ میں کسی حد تک سوشلزم کی طرف بھی راغب رہا۔ پھر مجھے کیمبرج کی یاد ستانے لگی اور میں نے واپس یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ایک پرسکون بلکہ خاموش جگہ رہنے کو پسند کرنے لگا لیکن میری دوسری گرل فرینڈ، بار برا دوئم لندن کی رنگینیوں پر فریفتہ تھی۔ اس نے مجھے حتمی طور پر بتا دیا کہ وہ میرے ساتھ کیمبرج آ کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن میرا دل لندن سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں واپس کیمبرج آ گیا۔ بار برا دوئم لندن میں رہ گئی۔ میرے بعد اس نے میرے بیسٹ فرینڈ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ میں نے کیمبرج واپسی پر ریلوے میں بطور پھاٹک چوکیدار نوکری شروع کر دی۔ ساتھ ہی میں نے اوپن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اوپن یونیورسٹی کے کورسز گھر بیٹھ کر پڑھے جا سکتے ہیں اور آپ کے لئے کلاسز اٹینڈ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد میں نے اوپن یونیورسٹی کی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی۔ چند سال گزرنے کے بعد مجھے اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سیسکس یونیورسٹی میں کمپیوٹنگ میں داخلہ لے لیا۔ میں نے اپنے طور پر کمپیوٹر پروگرامنگ سیکھ لی تھی۔ سیسکس یونیورسٹی میں میری پڑھائی اچھی جا رہی تھی کہ میں فلم، ڈرامہ، موسیقی کی طرف راغب ہو

UrduDost Library UrduDost.com

گیا۔ میں نے کمپیوٹنگ چھوڑ کر فلم اور ڈرامہ میں ڈگری کرنا شروع کر دی۔۔۔مارک ذوق کے اعتبار سے تم چوں چوں کا مربع ہو۔ کہاں کمپیوٹنگ اور کہاں فلم، ڈرامہ۔ ہم نے مارک کے طرزِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔وہ دراصل مجھے بچپن سے ہی پرفارمنگ آرٹس بہت اچھے لگتے تھے۔ مارک بولا۔ میں شروع سے آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ ڈگری مکمل کرنے کے بعد مجھے کسی حد تک احساس ہوا کہ پرفارمنگ آرٹس میں ڈگری کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اصل مشکل کام اپنے آپ کو بطور آرٹسٹ منوانا ہے۔ میں نے فلم، ڈرامہ اور موسیقی کے لئے کئی کوششیں کیں لیکن ناکام رہا۔ تنگ آ کر میں نے آرٹس مینجمینٹ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسطرح کم از کم ایک باوقار روزگار حاصل کر لوں گا۔ مجھے جاب کی کئی آفرز بھی ہوئیں لیکن تنخواہ اسقدر کم تھی کہ ایک آدمی کا بھی اُس تنخواہ میں گزارہ کرنا مشکل تھا۔ ایک دن میری پاؤلا بیسیٹ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھ سے برسوں چھوٹی تھی۔ لیکن ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ پھر میں اور پاؤلا، جسے میں پیار سے پولی کہتا ہوں، نے اکٹھے رہنا شروع کر دیا۔۔۔شادی کر لی، پولی سے۔ ہم نے پوچھا۔ نہیں، شادی کے بغیر ہی ہم اکٹھے رہتے تھے۔ پولی میری گرل فرینڈ تھی۔ مارک نے جواب دیا۔ میں اور پولی، عمر کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کے اچھے ساتھی بن گئے۔ پھر میں اور پولی نے مل کر ایک نیا بزنس شروع کیا۔ ہم ایک ویب سائٹ چلاتے تھے۔ ہمارا گھر ہی ہمارا دفتر تھا۔ ہم انگلینڈ اور اس کے باہر رہنے والے لوگوں کو ان کے انگلینڈ میں آباؤ اجداد کی معلومات ڈھونڈنے کی کنسلٹینسی کیا کرتے تھے۔۔۔ ہیں یہ کیا کام ہے، ہم نے تنگ کر پوچھا۔ اصل میں انگلینڈ میں بہت سارے ایسے لوگ آپ کو مل جاتے ہیں جو اپنے آباؤاجداد کی کھوج لگانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مارک نے ملائمت سے جواب دیا۔ انگلینڈ کے علاوہ۔ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں بھی ایسے بہت سارے لوگ ہیں جن کے اجداد انگلینڈ سے ہجرت کر کے اُن ملکوں میں جا بسے تھے۔ ایسے لوگوں کو اپنے اجداد کے بارے جاننے میں بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ اپنے شجرہ نسب جاننا چاہتے ہیں۔۔۔ بہت خوب، یہ عادت ہم نے اپنے وطن میں تو لاتعداد لوگوں میں دیکھی ہے۔ ہم نے پریشانی سے کہا۔ عامیوں کی تو بات ہی چھوڑیں۔ ہمارے قومی شاعر جیسے عالی دماغ بھی زندگی کے ایک حصے میں اپنے آباؤاجداد کا کھوج لگانے میں مشغول

UrduDost Library UrduDost.com

رہے ہیں۔ ہم تو اسے خالص مشرقی مرض سمجھتے رہے ہیں۔لیکن یہ تو مغرب میں بھی پایا جاتا ہے۔۔۔ویسے یہاں لوگ اپنا شجرہ نسب ڈھونڈ کر کیا کرتے ہیں۔ہم نے مارک سے پوچھا۔۔۔ ہوں۔۔۔ دراصل بہت سارے لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ بادشاہوں یا اپنے زمانے کے دوسرے انتہائی ممتاز افراد کی اولاد سے ہیں اوراگر ہماری تحقیق سے یہ ثابت ہوجاتا ہےتو وہ لوگ اپنی ساری عمراس پرفخرمحسوس کرتے رہتے ہیں۔گاہے وہ اپنے رشتہ داروں اوراحباب کے سامنے ثبوت کے ساتھ شیخی بھی بھگارتے ہیں۔شائداس سے انکی جذباتی تسکین ہوتی ہے۔۔۔لیکن تم کیسے لوگوں کا شجرہ نسب تلاش کرتے تھے۔ہم نے تجسس سے پوچھا۔مارک کہنے لگا۔اس کے کئی طریقے ہیں۔سب سے پہلے تو یہ کہ انگلینڈ میں ۱۸۳۷ سے قومی سطح پرتمام افراد کی پیدائش،اموات اورشادی کا ریکارڈ رکھا جانے لگا تھا۔اس مقصد کے لئے ایک رجسٹر بنایا گیا ہےجس کی وقت کے ساتھ ساتھ تجدید کی جاتی ہے۔ہم اس ریکارڈ سے بہت سارے لوگوں کے خاندانوں کا پتہ لگا سکتے ہیں۔مزید یہ کہ مقامی سطح پر گرجا گھروں میں بھی ایسے ہی رجسٹر موجود ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کے افراد کے کوائف کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔گرجا گھروں کا یہ ریکارڈ قومی سطح کے ریکارڈ کی نسبت بہت زیادہ پرانا ہے۔اس کی مدد سے ہم ۱۸۳۷ سے پہلے کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ، انگلینڈ کے طول وعرض میں بہت سارے ریسرچرز اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ہم کسی کا شجرہ نسب معلوم کرنے کے لئے ان سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔۔۔ہمارا بزنس اچھا چل رہا تھا کہ بدقسمتی سے ۱۱/۹ کا منحوس واقعہ رونما ہوگیا۔ پتہ نہیں کیوں ہمارے امریکی گاہکوں نے اس واقعے کے بعد ہم سے رابطہ کرنا چھوڑ دیا۔۔۔تمہارے گاہکوں کے آباؤاجداد کی ارواح ۱۱/۹ کے واقعے میں ملوث ہوں گی۔ہم نے گتھی سلجھائی۔۔۔مارک نے ہنستے ہوئے بات جاری رکھی۔پھر میرے گاؤں میں ایک خوفناک طوفان آیا۔جس کی وجہ سے پورے چار ہفتوں تک ہمارا کمپیوٹر نیٹ ورک کام نہ کرسکا۔اورہم ان چار ہفتوں میں اپنے گاہکوں سے رابطے میں نہ رہ سکے۔گاہک کسی کا نہیں ہوتا۔اسے صرف اپنے کام سے غرض ہوتی ہے۔چار ہفتوں کے بعد ہمارا نیٹ ورک تو کام کرنے لگا لیکن گاہک ہم سے منہ موڑ گئے اور یوں یہ بزنس بند ہوگیا۔۔۔اب ہمیں مارک کے ساتھ ہمدردی محسوس ہونے لگی۔۔۔مارک اپنی کہانی سنا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔مارک نے

UrduDost Library UrduDost.com

دروازہ کھولا تو سامنے ایک درمیانی عمر کی پرکشش خاتون کھڑی تھی۔ بال تراشے ہوئے، گورا رنگ،سفید شرٹ اور سکرٹ میں ملبوس۔ مارک اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔۔اوہ۔ پولی تم۔خوش آمدید۔آؤ،اندرآجاؤ۔ پولی ہمارے سامنے صوفے پرآ بیٹھی۔ بڑے پیاراورآداب سے ہم سے مصافحہ کیا۔ہم اپنا تعارف کروانے لگے تو بولی۔مارک نے آپ کے بارے میں فون پر مجھے بتا دیا تھا۔آپ کے آنے سے قبل ، میں اور مارک اسی گھر میں اکٹھے رہتے تھے۔اتنی دیر میں مارک دو شمپین گلاسوں میں ڈرنکس لے آیا۔ایک گلاس پولی کوتھمایا اور دوسرے سے خود چسکیاں لینے لگا۔ ہماری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔آپ ڈرنک نہیں لیتے۔کیا آپ کے لئے فریش جوس لے آؤں،اور وہ بھی نابالغوں والا۔۔۔ہم اس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کرمحظوظ ہوئے۔وہ پولی کی موجودگی میں خوش نظرآنے لگا۔ہم نے اسکا شکریہ ادا کیا۔ مارک نے اپنی کہانی جاری رکھی۔۔۔میں اور پولی چودہ سال اکٹھے رہے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے بور ہونا شروع ہوگئے۔ہم بات بات پرایک دوسرے سے تکرار کرتے۔یہاں تک کہ ہم نے محسوس کرلیا کہ اب ہم دونوں ساتھ نہیں چل سکتے۔ہم نے ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔۔۔مارک کی آپ بیتی سن کر ہم قدرے اداس اور غمگین ہوگئے اور سوچنے لگے کہ ہمارے ہاں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ اگر آپ کسی ترقی یافتہ ملک میں رہتے ہوں تو آپ کا ہر دن عیداوررات شبِ برات ہے۔ مارک کی زندگی پریشانیوں سے بھری ہوئی دیکھ کرہمیں یاد آیا کہ گوتم بدھ نے صحیح کہا تھا کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔مصیبتیں، پریشانیاں،غم ہرجگہ اورزمانے میں پائے جاتے ہیں۔ان سے چھٹکارا بقول حضرت غالب موت کو گلے لگانے سے ہی ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اگلے جہاں میں احتساب سے بھی بچ نکلیں۔۔۔مارک، پولی اور ہم کافی دیرتک خاموش بیٹھے رہے۔ہم نے سکوت توڑتے ہوئے مارک سے پوچھا۔اگر تمہیں دوبارہ زندگی ملے تو تم کیا کروگے۔ مارک غوروخوض کے بعد بولا۔میں کوشش کروں گا کہ اپنی تعلیم جلد سے جلد مکمل کرلوں۔۔۔

ہم اردگرد کا جائزہ لینے کے لئے گیٹ ہاؤس سے باہرآ گئے۔گیٹ ہاؤس ملٹن سے باہر واقع ہے۔ملٹن کی آبادی لگ بھگ چار ہزارافراد پر مشتمل ہے۔اسمیں ایک پرائمری سکول ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

ہائی سکول موجود نہیں ہے۔ سٹوڈنٹس پرائمری پاس کرنے کے بعد کیمبرج میں ہائی سکول چلے جاتے ہیں۔ البتہ ملٹن میں زرعی کالج واقع ہے۔ یہاں تین پب ہیں، تین چار ریستوران ہیں۔ سپر مارکیٹ ہے۔ چرچ ہے۔ کنٹری پارک ہے۔ اس کے علاوہ 'انڈین ٹیک اوے' بھی ہے۔ مارک نے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ گاؤں کے لوگ سپر مارکیٹ بننے سے نالاں تھے کیونکہ ان کے خیال میں، سپر مارکیٹ بننے سے ملٹن کا 'گاؤں پن' یا 'دیہاتیت' متاثر ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ سپر مارکیٹ کی افادیت سے بخوبی واقف ہیں۔ ملٹن کے وسط سے مین روڈ گزرتی ہے جسے ملٹن روڈ کہتے ہیں۔ ہم ملٹن روڈ سے فین روڈ پر ٹرن کریں تو قریباً ایک فرلانگ تک رہائشی گھر موجود ہیں۔ گھروں کے بعد کھیت آتے ہیں۔ ذرا آگے آئیں تو ریلوے کراسنگ اور گیٹ ہاؤس ہے۔ ریلوے کراسنگ سے آگے یہ سڑک کہاں جاتی ہے۔ ہم نے پوچھا۔۔۔ خوب، پھاٹک کے بعد اسی روڈ پر کھیتوں کے ساتھ چلتے جائیں تو ایک فرلانگ کے بعد آپ دریائے کیم کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ایک خوبصورت جگہ ہے۔ دریائے کیم کے کنارے پر ایک ٹریک ہے جس پر آپ واک یا سائکلنگ کرتے ہوئے کیمبرج شہر اور یونیورسٹی مزے سے جا سکتے ہیں۔۔۔ ہے نا یہ پُر لطف جگہ، قدرتی زندگی کے بالکل قریب۔ مارک نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔۔۔ ہاں، بالکل۔۔۔ مگر تمہیں یہاں ڈر نہیں لگتا اور تم تنہا محسوس نہیں کرتے۔۔۔ نہیں، میں نے یہاں ایک شاندار زندگی گزاری ہے۔ لوگ بڑھاپے میں ایسی جگہوں میں رہنے کی تمنا کرتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی جوانی شہروں میں برباد کرنے کی بجائے اس جگہ رہنے کو ترجیح دی، میں اسی لئے بہت مطمئن ہوں۔۔۔ ہم نے قدرے حیرت سے مارک کی ہاں میں ہاں ملائی اور یہ جو میرے گھر کے بالکل ساتھ والا کھیت ہے۔ اس میں کیمبرج یونیورسٹی ایک بہت بڑا تالاب بنانے جا رہی ہے۔ جس میں کشتی رانی کے مقابلے ہوا کریں گے۔ اس تالاب میں آٹھ لین ہوں گی۔ یہ انٹرنیشنل مقابلوں کے لئے ایک بہترین جگہ ہوگی۔ یہ ایک بہت بڑا منصوبہ ہے۔ اس کے آغاز کی وجہ یہ ہے کہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے درمیان کشتی رانی کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ ان مقابلوں کی یہاں بہت اہمیت ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے کشتی رانی میں آکسفورڈ کا پلہ بھاری رہا

UrduDost Library UrduDost.com

ہے۔اس لئے کیمبرج نے ان مقابلوں میں اپنی ساکھ بچانے اور دوبارہ جیتنے کی منصوبہ بندی کرنے کے لئے لئے یہ منصوبہ تیار کیا ہے۔ یہ بہت مہنگا پراجیکٹ ہے۔لیکن کیمبرج یونیورسٹی کا ایک سابق طالبعلم جوارب پتی ہے۔اُس نے اِس منصوبے کے لئے سپانسر بننے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمیں بڑی حیرانی ہوئی کہ سابقہ طالبعلم اور موجودہ ارب پتی کو کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں سوجھا۔۔۔ڈھنگ کا کام، مثلاً کیا۔مثلاً یہ کہ سیاست میں حصہ لے۔کرکٹ، کار ریس اور گھوڑوں کی دوڑ پر جوا کھیلے۔فلم بنانے کے بہانے ٹاپ اداکاراؤں سے میل ملاپ پیدا کرے۔ مارک مسکرانے لگا۔۔۔او۔کے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں یہاں رہنے کے لئے سائیکل کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ کیا تم سائیکل چلا سکتے ہو۔ہم کیوں نہیں چلا سکتے۔ہم تو آج تک گاڑی جس رفتار اور اعتماد کے ساتھ چلاتے رہے ہیں، اسے دیکھتے ہوئے ہمارے احباب کی رائے یہ ہے کہ سائیکل چلا رہے ہیں۔۔۔ویسے زمانہِ طالبعلمی میں، انٹرمیڈیٹ تک، ہم نے خوب سائیکل چلائی ہے۔ یہ کتنی پرانی بات ہے۔۔۔کل کی تو بات ہے۔۔۔یہی بس دو دہائیوں سے دو چار سال زیادہ ہوئے ہوں گے۔۔۔بہت خوب، میرے پاس پولی کی پرانی بائیسکل ہے۔ میں اس سے اجازت لے لیتا ہوں، تم وہ لے لو۔۔۔وہ جو انگیٹھی پر فریم میں ایک تصویر رکھی ہوئی ہے۔کیا وہ پولی ہے۔ہاں وہ پولی ہی ہے۔بھئی مارک تم کس قدر عاقبت نااندیش ہو۔گرل فرینڈ اور وہ بھی سابقہ کی تصویر سب کے سامنے دیدہ دلیری سے رکھ کر بیٹھے ہوئے ہو۔تمہیں اتنی خبر بھی نہیں کہ تصویرِ یار کا مسکن تو صرف دلِ عاشق زار ہی ہوسکتا ہے۔۔اور سابقہ محبوبہ کی اصل جگہ تو دل بھی نہیں یاد میں ہی ہوسکتی ہے۔دل کی وسعتوں پر تو صرف موجودہ محبوب ہی کی حکمرانی ہونا چاہیئے۔ ہم نے مارک کے اصلاحِ احوال کی سعی کی۔۔۔ہاں یاد آیا۔میں نے تمہارے لئے گھر کی چابی بنوانی ہے۔ساتھ ہی سائیکل لئے چلتے ہیں۔اسے بھی ٹھیک کروالیں گے اور میں تمہیں، تمہارا انسٹیٹیوٹ بھی دکھا دوں گا۔مارک نے تجویز پیش کی۔آئیڈیا بہت اچھا ہے۔ہم اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ اس کی چابی گم ہوگئی ہے۔نئی بنوالیں گے۔ہم نے فوراً تائید کی۔ مارک نے فوراً اپنی پرانی پیجو کار نکالی اور ہم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی بیلٹ باندھ لی۔ہم گیٹ ہاؤس سے نیم شکستہ روڈ پر ملٹن روڈ کی

UrduDost Library UrduDost.com

طرف روانہ ہو گئے۔ جس جگہ پر فین روڈ اور ملٹن روڈ ملتے ہیں، یہاں بس رکتی ہے۔ اس سٹاپ کا نام 'ویگن اینڈ ہورسز سٹاپ' ہے۔ مارک بولا۔۔۔ سامنے ہی دیوار پر سٹاپ کا نام کندہ تھا۔ 'ویگن اینڈ کیا سٹاپ' ہم نے پوچھا۔ ہورسز، مارک نے جواب دیا۔ مارک تمہارا تلفظ اور لہجہ بالکل بھی درست نہیں ہے۔ تم 'ہارسز' کو 'ہورسز' بولتے ہو۔ اب ہم کچھ دیر تمہارے ساتھ مقیم رہیں گے۔ ہم سے جتنا چاہے سیکھ لو۔ بالخصوص اپنے تلفظ اور لہجے کی ہم سے اصلاح لیا کرو۔ ایسے مواقع بار بار نہیں ملا کرتے۔ ہماری موجودگی سے فائدہ اٹھاؤ۔ ہم نے مارک کو مشورہ دیا۔۔۔

ملٹن روڈ نہایت کشادہ اور شاندار بنی ہوئی ہے۔ گاؤں میں لوگوں کے گھر روایتی برطانوی انداز میں بنے ہوئے ہیں۔ گھروں کے ساتھ گارڈن بھی موجود ہیں۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ٹریفک رش نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اِکا دُکا گاڑیاں گزرتی ہیں۔ کبھی کبھار کوئی پیدل جاتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ ریستورانوں کے باہر کرسیاں اور بینچ پڑے ہوئے۔ گورے اور گوریاں خوش گپیاں لگاتے ہوئے جام پر جام چڑھاتے جا رہے ہیں۔ کس قدر صاف ستھرا اور سلیقے سا بنایا گیا گاؤں ہے۔ اتنے عمدہ تو ہمارے لاہور اور کراچی ڈیفنس کے علاقے بھی نہیں ہیں۔ چلتے چلتے ہم سوچ رہے ہیں۔ ملٹن سے گزر کر ہم کیمبرج میں داخل ہو گئے۔ گاڑی نجانے کن راستوں سے ہوتی ہوئی نیو مارکیٹ روڈ پہنچ گئی۔ وہاں چابیاں بنوائیں، سائیکل مرمت کروائی اور مارک ہمیں بٹھا کر انسٹیٹیوٹ جہاں ہم نے آنے والے دنوں میں گپ شپ عرف کام کرنا تھا، کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ہم انسٹیٹیوٹ پہنچ گئے۔ صرف باہر سے ہی نظارہ کیا اور مارک ہمیں راستہ سمجھانے لگا۔ واپسی پر اس نے ہمارے لئے نقشے اور بسوں کے شائع شدہ شیڈول بھی لے لئے۔ اب ہمیں گھر سے انسٹیٹیوٹ آنے جانے کے لئے درکار معلومات مل گئیں۔ گھر پہنچنے کے بعد، ہم نے سائیکل نکالی اور چلانے کی کوشش کرنے لگے۔ سوار ہوئے، ذرا زور لگا کر پیڈل گھمائے۔ سائیکل سرکنے لگی۔ لڑھکتے لڑھکتے ہم نے بمشکل اسکا توازن برقرار رکھا۔ ریلوے ٹریک عبور کیا اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ سائیکل چلانا شروع کر دیا۔ جب ہم نے بچپن میں سائیکل چلانا سیکھا تھا تو بالکل اسی طرح کسی بے آباد سڑک کی تلاش میں ہوتے جہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ

UrduDost Library UrduDost.com

ہو۔کوئی ہم سے ٹکرائے اور نہ ہی کوئی ہماری سائیکلانہ مہارت پر قہقہے لگائے۔آج ہم پھراسی دور سے گزر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔قریباً سوفٹ سائیکل چلانے کے بعد پُراعتماد ہوگئے اوراب ہم ماہر سائیکلسٹ تھے۔بچپن کے بعد آج ہمیں احساس ہورہا تھا کہ بچے اورلڑکے کیوں اس قدر ضد کر کے سائیکل خریدتے ہیں۔ سائیکل چلانا واقعی ایک پُر لطف کام ہے۔ہم پیڈل گھماتے گھماتے دریائے کیم جا پہنچے۔ دریا کی چوڑائی دیکھی۔ اگر دریا اتنا ہی چوڑا ہوتا ہے۔تو ہمارے پنجاب میں اسوقت ڈھائی نہیں بلکہ ڈھائی سو دریا تو ہونگے۔اس سے زیادہ چوڑی تو ہمارے ہاں نہریں ہوتی ہے۔کس قدر ڈھٹائی ہے گوروں کی۔قریبا ساٹھ ستر فٹ چوڑی نہر کو دھڑلے سے دریا کہتے جاتے ہیں۔انہیں اپنی اصلاح کی بے حد ضرورت ہے۔

دریائے کیم کا پانی ہلکا سبزی مائل ہے۔ یہاں پر کسی بھی قسم کا ٹھوس یا مائع فضلہ دریا میں پھینکنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔دریا میں موجود آبی حیات کی وجہ سے اس کا رنگ سبزی مائل ہے۔ یہاں بہت ساری کشتیاں موجود ہیں۔ چپوؤں سے چلنے والی اور ساتھ ہی انجن سے چلنے والی۔ انجن سے چلنے والی کشتیوں میں جھونپڑیاں سی بنا کر ریستوران بنائے گئے ہیں۔آرام کرنے کے لئے بنچ اور کرسیاں موجود ہیں۔ چند ایک گورے اور گوریاں بھرے ہوئے گلاس لئے شغل میں مصروف ہیں۔دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت ٹریک بنا ہوا ہے۔ جہاں پر بڑے لطف سے سائیکلنگ اور واک کی جاسکتی ہے۔دریا میں مچھلیاں اوربطخیں تیر رہی ہیں۔لوگ بطخوں کو دانہ ڈالتے ہیں تو وہ جھٹ سے اچک لیتی ہیں۔دریا میں ایک لاک بھی بنا ہوا ہے جس کی مدد سے پانی کو عارضی طور پر روکا جاسکتا ہے۔دریا کے اوپر ایک لکڑی کا پُل بنا ہوا ہے، جہاں سے آپ پیدل یا سائیکل کے ہمراہ دریا عبور کر کے دوسری طرف جاسکتے ہیں۔ہم نے دریا کے ساتھ ساتھ سائیکل چلانا شروع کی۔ یہ اس قدر پُر لطف تجربہ تھا کہ ہمیں افسوس ہونے لگا کہ ہم بلاوجہ مارک سے پوچھ رہے تھے کہ اُس نے اِس ویرانے میں زندگی کیسے بِتا دی۔اب احساس ہوا، مارک ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اُس نے شہروں میں رہ کر زندگی برباد نہیں کی۔

اگلے روز ہم علی الصبح یعنی گیارہ بجے سو کر اٹھے۔باتھ روم گئے۔غسل کئے بغیر ہماری

UrduDost Library UrduDost.com

آنکھیں کھلتی ہیں نہ عقل کام کرتی ہے۔جلدی جلدی غسل کرنے لگے۔تو پتہ چلا کہ باتھ روم میں ٹب تو لگا ہوا ہے مگر شاور نہیں۔تو اب ٹب میں ہی نہانا پڑے گا۔باتھ روم ٹب جسے روز ہی دیکھتے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں ہم نہاتے صرف شاور سے ہی ہیں۔پہلی بار ایسی صورتحال سے پالا پڑا ہے کہ جہاں ٹب موجود ہے۔شاور نہیں۔ٹب میں نہانے کی کیوں عادت نہیں ہے۔دماغ ٹٹولا۔لگتا ہے کوئی نفسیاتی نوعیت کا معاملہ ہے۔لاتعداد انگریزی اور دیسی فلموں میں ہیروئن کو ٹب میں نہانے کا منظر۔۔۔لوگ دیکھ چکے ہوں گے۔اس کے باوجود ہماری طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ہاں،خوب یاد آیا۔کئی مرتبہ پنجابی فلموں میں کسی خونخوار قسم کے ولن کو ٹب میں جھاگ ملے ہوئے دیکھا ہے۔پھر اس کے ڈائیلاگ اور ستم بالائے ستم اسکی دھاڑتی ہوئی آواز نے ہمارے لاشعور کو اس قدر متاثر کیا کہ ہم نے کبھی ٹب میں نہانے جیسی اوچھی حرکت کا ارتکاب کرنے کی جرات نہیں کی۔لیکن آج معاملہ اختیار اور انتخاب سے بالا ہے۔آج سے اسی ٹب میں نہانا پڑے گا۔ہم نے ٹب میں پانی بھرا،اور اس میں داخل ہوئے۔لیکن ٹب میں ہم اگر اپنی ٹانگیں بھگوتے ہیں تو باقی آدھا دھڑ،سر اور چہرے سمیت،پانی سے باہر ہوتا ہے۔جسم کے بالائی آدھے دھڑ کو بمشکل پانی میں داخل کرتے ہیں تو ٹانگیں باہر نکل جاتی ہیں۔عجیب صورتِ حال ہے۔گویا قسطوں میں ہی نہایا جائے گا۔مزید یہ کہ سر اور چہرہ پانی میں لے جاتے ہیں تو ڈبکی لگتی ہے اور ہمیں خدشہ ہے کہ ہم محض ڈھائی فٹ گہرے ٹب میں ہی نہ ڈوب جائیں۔دھیرے دھیرے ہم نے اپنی فراست کو قابو میں رکھتے ہوئے ٹب میں نہانے کی تکنیک دریافت کی۔اور پھر اس تکنیک کے سہارے غسل کرتے رہے۔تیار ہوئے، فین روڈ پر دس منٹ کی واک کے بعد 'ویگن اینڈ ہورسز سٹاپ' پہنچ کر کیمبرج جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج شہر

دنیا میں کئی ملکوں میں کیمبرج نام کے شہر موجود ہیں۔ ان تمام شہروں نے برطانوی شہر کیمبرج سے یہ نام مستعار لیا ہوا ہے۔ دراصل انگریز دنیا میں جہاں بھی گئے، وہاں انہوں نے شہروں، گلیوں، محلوں کے نام اپنے آبائی وطن کی مناسبت سے رکھ لئے۔ آپ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ گھوم آئیے۔ آپ کو جگہ جگہ، گلیوں محلوں کے نام وہی ملیں گے جو برطانیہ میں ہیں۔ شائد یہ چیز انسانی مزاج کے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ وہ اپنے آبائی وطن کو کسی نہ کسی حوالے سے یاد کرتا رہتا ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد جو لوگ موجودہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے، وہ اپنے ساتھ اپنے دیہات وغیرہ کے نام بھی لے آئے۔ اسوقت دنیا میں بیسیوں ایسے چھوٹے، بڑے شہر اور دیہات ہیں جن کا نام کیمبرج ہے۔ امریکہ کی ریاستوں انڈیانا، آئیوا، کنساس، کنٹکی، میری لینڈ، میسا چیوسٹس، منی سوٹا، نبراسکا، نیو یارک، اوہائیو، پنسلوینیا، وسکونسن، مشی گن وغیرہ میں کیمبرج نام کے شہر، ٹاون اور دیہات موجود ہیں۔ کینیڈا میں انٹاریو اور نوواسکوٹیا میں کیمبرج شہر پائے جاتے ہیں۔ شمالی امریکہ سے باہر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جمیکا میں بھی اس نام سے شہر موجود ہیں۔ امریکہ کی ریاست میسا چیوسٹس میں کیمبرج نام کا شہر بہت معروف ہے۔ برطانوی کیمبرج کی طرح امریکی کیمبرج شہر کی بھی اصلی وجہِ شہرت، اس میں موجود شہرہ آفاق یونیورسٹی یعنی، میسا چیوسٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (ایم۔آئی۔ٹی) ہے۔ دورِ حاضر میں اپیلائیڈ سائنسز اور انجینئرنگ میں ایم۔آئی۔ٹی کا شائد ہی کوئی نعم البدل ہو۔ ایم۔آئی۔ٹی کے شہر کا نام کیمبرج بھی دراصل برطانوی کیمبرج

UrduDost Library UrduDost.com

یونیورسٹی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے رکھا گیا تھا۔

بیسویں صدی کے نصفِ اول تک برطانیہ دنیا میں سپر پاور کے طور پر راج کرتا رہا۔ جنگِ عظیم دوئم کے بعد اس کی سپر پاور کی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ لیکن دورِ حاضر میں بھی برطانیہ عالمی سطح پر ایک ممتاز ملک سمجھا جاتا ہے۔ برطانوی معاشرہ بلاشبہ ایک ترقی یافتہ اور متمدن معاشرہ ہے۔ اس کے تابناک ماضی سے پوری دنیا نے علم کی روشنی حاصل کی ہے۔ دنیا میں سائنسی اور صنعتی انقلاب برپا کرنے میں برطانیہ کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جدید سائنس اور معاشرے کی بنیاد پورے یورپ اور بالخصوص برطانیہ میں ہی رکھی گئی تھی۔ انگلینڈ کی موجودہ آبادی تقریباً سوا پانچ کروڑ اور رقبہ پچاس ہزار مربع میل سے زائد ہے۔ یہاں دنیا میں پائی جانے والی ہر نسل کے لوگ ملتے ہیں۔ انگلینڈ کو انتظامی اعتبار سے نو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ حصے شمال مشرق، شمال مغرب، یارک شائر اور ہمبر، مشرقی درمیانی خطہ، مغربی درمیانی خطہ، مشرقی خطہ، جنوب مشرقی خطہ، جنوب مغربی خطہ اور لندن ہیں۔ ان نو حصوں کے علاوہ، انگلینڈ کو کاونٹیز میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ جن کی تعداد اڑتالیس ہے۔ پاکستانی تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انگلینڈ کے نو صوبے ہیں اور اڑتالیس ڈویژن ہیں۔ اگرچہ صوبے اور ڈویژن کی اصطلاح یہاں استعمال نہیں کی جاتی۔ اڑتالیس کاونٹیوں میں سے چھ کاونٹیاں آبادی کے لحاظ سے بڑی ہیں۔ انہیں میٹروپولیٹن کاونٹیز کہا جاتا ہے۔ جبکہ باقی کاونٹیوں کو نان میٹروپولیٹین کاونٹیاں تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں کراچی اور لاہور کو میٹروپولیٹن کا درجہ حاصل ہے جبکہ دوسرے اضلاع میٹروپولیٹن نہیں کہلاتے۔ غیر میٹروپولیٹن کاونٹیوں میں ایک کاونٹی کیمبرج شائر ہے جو انگلینڈ کے مشرق میں واقع ہے۔ کیمبرج شائر کا رقبہ تقریباً تیرہ سو مربع میل ہے اور یہ انگلینڈ میں اپنے رقبے کے لحاظ سے پندرہویں درجے پر ہے۔ اسکی آبادی ساڑھے سات لاکھ افراد سے زائد ہے جبکہ اس میں فی مربع میل آبادی کی تعداد ۵۸۸۱ فراد ہے۔ آبادی کے لحاظ سے کیمبرج شائر انگلینڈ میں اٹھائیسویں درجے پر آتا ہے۔ اس میں لگ بھگ نوے فیصد گورے رہتے ہیں جبکہ سب سے بڑی اقلیت ایشیائی باشندوں کی ہے۔ جو آبادی کا تقریباً تین فیصد ہے۔ کیمبرج شائر کاونٹی کو انتظامی اعتبار

UrduDost Library UrduDost.com

سے مزید چھ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان چھ اضلاع میں سب سے چھوٹا ضلع کیمبرج ہے۔ جس کے چاروں طرف جنوبی کیمبرج شائر کا ضلع پایا جاتا ہے۔ جنوبی کیمبرج شائر کی حیثیت ایک ایسے غلاف کی ہے جس نے ہر طرف سے کیمبرج کو لپیٹا ہوا ہے۔

کیمبرج شہر، کیمبرج شائر کاؤنٹی کا مرکزی مقام ہے۔ کیمبرج میں انسانی آبادی کی تاریخ رومی سلطنت سے قدیم ہے۔ یہاں ۳۵۰۰ سال پرانی عمارتوں کے نشان موجود ہیں۔ آثارِ قدیمہ کی شہادتوں سے پتہ چلا ہے کہ یہاں زمانہ قبل از مسیح میں قبائل آباد تھے۔ اہم تعمیرات کا آغاز پہلی صدی عیسوی میں رومیوں کے حملے اور قبضے سے ہوا تھا۔ رومیوں کے دور کی سڑکیں، دیواریں اور عمارات اب بھی اس علاقے میں موجود ہیں۔ رومیوں کے بعد سیکسون اس جگہ آباد ہو گئے۔ سیکسون، جنہیں اینگلوسیکسون بھی کہا جاتا ہے، ہی وہ لوگ تھے جو بعد ازاں انگریز بنے۔ نویں صدی عیسوی میں یہاں سیکنڈے نیویا سے تاجر، سیاح اور دیگر لوگ آ کر بس گئے تھے۔ ان لوگوں کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے کیمبرج میں ترقی کا آغاز ہوا۔ اس دور کو 'وائکنگ عہد' کہا جاتا ہے۔ وائکنگ عہد کے بعد کچھ عرصے کے لئے سیکسون حکومت پر قابض ہو گئے۔ انہی کے عہد میں موجودہ کیمبرج میں موجود سب سے پرانی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ یہ 'بینیٹ سٹریٹ' میں واقع 'سینٹ بینیٹ چرچ' ہے۔ بینیٹ دراصل بینیڈکٹ کا مخفف ہے۔ سینٹ بینیٹ چرچ قریباً ۱۰۲۵ء عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس چرچ میں ایک ٹاور بھی ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ گیارھویں صدی عیسوی میں ہی تعمیر کیا گیا تھا۔ جبکہ اس کی بقیہ عمارت کو وکٹورین عہد میں دوبارہ بنایا گیا ہے۔ اس کے ٹاور میں سوراخ رکھے گئے ہیں جن کا مقصد اُلوؤں کو ٹاور کے اندر گھونسلے بنانے کی ترغیب دینا تھا۔ تاکہ اس کے اندر چوہے بسیرا نہ کر سکیں۔ ویسے کیا نرالی منطق ہے کہ اُلوؤں کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے اور چوہوں سے جان چھڑائی جا رہی ہے۔۔۔ اس ٹاور میں گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں جن کے لگانے کا مقصد طالبعلموں کو پڑھائی کے لئے بلانا تھا۔۔۔ گویا، ہم جیسے سنجیدہ طالبعلم ہر دور میں موجود رہے ہیں جنہیں پڑھائی کے لئے بلانا ہی پڑتا ہے۔ اس چرچ کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں گذشتہ دس صدیوں سے عیسائی مذہبی عبادات جاری ہیں۔ آج بھی

UrduDost Library UrduDost.com

اس چرچ میں باقاعدگی کے ساتھ مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

۱۰۶۶ء میں ولیم اول نے انگلینڈ فتح کیا تھا۔ولیم اول کا تعلق شمالی فرانس سے تھا۔وہ اپنے ماں باپ کی ناجائز اولاد تھا۔اسی لئے اسے برطانیہ کی فتح سے پہلے 'ولیم۔دی باسٹرڈ' کے نام سے جانا جاتا تھا۔لیکن برطانیہ فتح کرنے کے بعد وہ شاہِ برطانیہ کے لقب سے جانا جانے لگا۔۔۔ تاریخ بھی کیا ظالم چیز ہے۔ہزار سال پرانے قصے بھی نہیں بھلاتی۔۔۔۱۰۶۸ء میں ولیم اول نے کیمبرج اور اس کے گردونواح کو فتح کیا اور اُسی برس کیمبرج میں ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔آج یہ قلعہ اپنی اصل حالت میں موجود نہیں ہے۔البتہ اس کی جگہ پر ایک مصنوعی ٹیلہ سا بنا کر اس جگہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔یہ جگہ کیسل ہل یا قلعہ پہاڑی کے نام سے جانی جاتی ہے۔اسی زمانے میں راؤنڈ چرچ تعمیر کیا گیا تھا جو آج بھی شہر کے درمیان میں اپنی اصل حالت میں برج سٹریٹ میں موجود ہے۔اسکی تعمیر ۱۱۳۰ء کے لگ بھگ کی گئی تھی۔صدیوں تک اس چرچ میں مذہبی رسومات ادا کی جاتی رہی ہیں لیکن اب یہ چرچ عبادات اور دیگر مذہبی رسومات کے حوالے سے متروک قرار دیا جا چکا ہے۔راؤنڈ چرچ اس وقت کیمبرج میں موجود دوسری سب سے قدیم عمارت ہے۔یہ سیاحوں کے لئے کھلا رہتا ہے۔اس میں 'انگلینڈ پر عیسائیت کے اثرات' کے نام سے ایک نمائش کا انعقاد کیا گیا ہے۔اس چرچ میں ایک لائبریری قائم کی گئی ہے۔اس کے علاوہ 'صوفیا اور علماء' (سینٹس اینڈ سکالرز) کے نام سے ایک ویڈیو فلم بھی اس میں دکھائی جاتی ہے۔اس چرچ میں گاہے بگاہے لیکچرز، کورسز، محافلِ گفتگو اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں لندن شہر کی آبادی کو محدود رکھنے کی غرض سے کیمبرج میں کئی ایک نئی آبادیاں بنائی گئی تھیں۔یہ آبادیاں زیادہ تر شہر کے شمالی علاقوں میں بنائی گئی ہیں۔۱۹۹۲ء میں کیمبرج میں دوسری یونیورسٹی بنائی گئی۔آج کل اس یونیورسٹی کا نام انجلیا رسکن یونیورسٹی ہے۔یہ پہلے ایک پولی ٹکنیک سکول تھا۔۱۸۵۸ء میں معروف شاعر، نقاد اور مصور جان رسکن نے کیمبرج سکول آف آرٹ کی بنیاد رکھی تھی۔یہی سکول مختلف تاریخی مراحل سے گزر کر آج انجلیا رسکن یونیورسٹی بن چکا ہے۔انگلینڈ اور بالخصوص کیمبرج کے تاریخی پس منظر میں ۱۹۹۲ء میں

UrduDost Library UrduDost.com

تعمیر ہونے والی یونیورسٹی کی زیادہ اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔لیکن ہمارے اندازوں کے بالکل برعکس انجلیا رسکن یونیورسٹی ایک توانا ادارہ بن کرا بھر رہی ہے۔اس وقت اس میں قریباً بیس ہزار طلبا وطالبات زیرِتعلیم ہیں۔جن کا تعلق دنیا کے ہر ملک سے ہے۔اس یونیورسٹی میں آرٹس،ادب، قانون، سائنس وٹیکنالوجی، بزنس جیسے شعبے کامیابی سے کام کررہے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں وہ یونیورسٹیاں جنہیں پچاس سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے، وہ بھی ابھی تک انجلیا رسکن یونیورسٹی کے برابر قرار نہیں دی جاسکتیں۔

انیسویں صدی کے آغاز پر کیمبرج کی آبادی محض دس ہزار افراد پر مشتمل تھی جو بیسیویں صدی کے شروع میں بڑھ کر چالیس ہزار افراد ہوگئی۔ اکیسویں صدی کے طلوع کے موقع پر یہ قریبا ایک لاکھ اور دس ہزار افراد جبکہ موجودہ آبادی سوا لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔کیمبرج کو اسکی مشہورِ زمانہ یونیورسٹی کے باوجود ۱۹۵۱ء تک شہر کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔اس میں زیادہ تر تاریخی عمارات مختلف کالجوں کی ملکیت ہیں۔کیمبرج کا علاقہ مجموعی طور پر میدانی علاقہ ہے۔ دراصل یہ مشرقی برطانیہ کا وہ حصہ ہے جو کبھی دلدلی زمین ہوا کرتا تھا۔ دورِ حاضر میں یہ دلدلی زمین خشک ہوچکی ہے اور زرعی اعتبار سے انتہائی زرخیز ہے۔کیمبرج سطحِ سمندر سے محض پچاس،سوفٹ اونچا ہے۔بعض دوسرے یورپی خطوں کے بالکل برعکس یہاں کا درجہ حرارت نہایت معتدل ہے۔گرمیوں میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت پچیس اور سخت سردیوں میں کم از کم صفر ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پنجاب اور سندھ کے مقابلے میں اسے سرد قرار دیا جاسکتا ہے لیکن یورپ کی شدید سردیوں کے تناظر میں یہ نہایت معتدل اور متوازن علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔کیمبرج کی زیادہ تر آبادی گوروں پر مشتمل ہے جن کی تعداد نوے فیصد کے لگ بھگ ہے۔کیمبرج میں انگلینڈ کے باقی علاقوں کی نسبت اعلیٰ تنخواہ پانے والے اور اعلیٰ تعلیم اور مہارت رکھنے والے افراد کا تناسب کافی زیادہ ہے۔ اسی طرح یہاں پر ہاتھ سے کام کرنے والے اور نچلے درجے کی ملازمتیں کرنے والے افراد کی تعداد کافی کم ہے۔اس وقت انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ قریباً بیس فیصد ہیں جبکہ کیمبرج میں ان کا تناسب چالیس فیصد سے زائد ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج ایک نان میٹرو پولیٹن ڈسٹرکٹ ہے۔ جس کا مقامی انتظام و انصرام سٹی کونسل کے سپرد ہے۔ کیمبرج کو ۱۲۰۷ء میں رائل چارٹر دیا گیا تھا۔ جس کے تحت یہاں ایک میئر کا تقرر کیا جاسکتا ہے۔ میئر سٹی کونسل اور مقامی حکومت کا سربراہ ہوتا ہے۔ کیمبرج شہر کو انتظامی اعتبار سے چودہ وارڈز میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شہر میں مقامی انتخابات کے ذریعے کونسلر منتخب کیئے جاتے ہیں۔ اس وقت لبرل ڈیموکریٹ کونسلروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جو کہ انتیس ہے۔ دوسرے نمبر پر لیبر کونسلر ہیں جو نو ہیں۔ جبکہ کنزرویٹو کا صرف ایک کونسلر ہے۔ کیمبرج میں برطانیہ کی مرکزی پارلیمنٹ کی ایک نشست ہے۔ جنگِ عظیم دوئم کے بعد زیادہ تر کنزرویٹو پارٹی سے تعلق رکھنے والے افراد ہی برطانیہ کی مرکزی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے ہیں۔ لیکن پچھلے بیس برس میں یہ رجحان تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب مرکزی پارلیمنٹ کی واحد نشست لبرل ڈیموکریٹ پارٹی کے قبضے میں ہے۔

کیمبرج شہر شاہرات اور ریلوے کے ذریعے دوسرے بہت سارے شہروں سے منسلک ہے۔ یہاں سے لندن کنگز کراس اور لیور پول سٹریٹ کے لئے ریلوے کی براہِ راست سروس موجود ہے۔ کیمبرج ریلوے اسٹیشن ۱۸۴۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور یہ منصوبہ بندی کے تحت سٹی سنٹر سے دور رکھا گیا تھا۔ لیکن اب شہر پھیلنے کے بعد یہ سٹی سنٹر سے زیادہ دور شمار نہیں کیا جاسکتا۔ روایات کے مطابق ، پہلے پہل کیمبرج کی مقامی انتظامیہ ریلوے ٹریک کے ذریعے کیمبرج کو دوسرے شہروں سے منسلک کرنے کے خلاف تھی۔ تاہم بعد میں جب اس ریلوے ٹریک کی تعمیر کی گئی تو ریلوے اسٹیشن کو اس لئے شہر سے دور رکھا گیا تھا کہ یونیورسٹی کے طلبا آسانی سے ریل میں بیٹھ کر لندن نہ پہنچ سکیں۔ دراصل یہ طلبا کو بکثرت لندن جانے سے روکنے کے لئے کیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کے بکثرت لندن یا دوسرے بڑے شہروں کو جانے سے اُن کی پڑھائی کا ہرج ہونے کا اندیشہ تھا۔۔۔ گویا 'بابگان' ہمیشہ سے ہی نوجوانوں کے سیر سپاٹے کے خلاف منصوبہ بندی کرتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں آج بھی نوجوانوں کو اسی طرح کے ہتھکنڈوں سے سیاحت کے ثمرات سے روکنے کی سعی کی جاتی ہے لیکن آفرین ہے ہم جیسے 'نوجوانوں' پر جن کے 'بابگان' کو اُن کے سیر

UrduDost Library UrduDost.com

سپاٹے کی خبر ہی اُس وقت ہوتی ہے جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔خود ہمارے بہت سارے احباب اسی ناروا سماجی پابندی کے خلاف علمِ جہاد کرتے ہوئے کئی مرتبہ اٹک چیک پوسٹ پر ایجنسیوں کے مہمان بننے کا شرف رکھتے ہیں۔۔۔انگلینڈ کی دو اہم شاہرات یعنی ایم۔١١ اور اے۔١۴ کیمبرج شہر سے گزرتی ہیں۔کیمبرج کا اپنا ایئرپورٹ ہے جو وسطی شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر مشرق میں موجود ہے۔اس کا نام مارشل ایئرپورٹ ہے۔اور یہ ١٩٣٨ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک مقامی ایئرپورٹ ہے جہاں سے برطانیہ کے مختلف شہروں کے لئے پروازیں دستیاب ہوتی ہیں۔اسکے علاوہ لندن سٹینسٹیڈ ایئرپورٹ کیمبرج سے تقریباً اٹھائیس میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں سے پورے یورپ کے لئے پروازیں دستیاب ہیں۔اندرونِ کیمبرج سفر کرنے کے لئے ٹیکسی اور بس سروس دستیاب ہے۔عام بس اور کوچ سروس کے علاوہ دومنزلہ یعنی ڈبل ڈیکر بسیں بکثرت میسر ہیں۔ڈبل ڈیکر بس کی بالائی منزل میں بیٹھ کر کیمبرج سٹی سنٹر اور گرد ونواح میں گھومنے کا تجربہ انتہائی پرلطف ہوتا ہے۔عام بس،کوچ اور ٹیکسی میں سوار ہوکر آپ شہر کی قدیم و جدید عمارات کو اس زاویے سے نہیں دیکھ سکتے جو ڈبل ڈیکر بس کی بالائی منزل سے ممکن ہے۔کیمبرج کو برطانیہ کا سائیکل سواری کا دارالخلافہ بھی کہا جاتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق شہر کی تقریباً پچیس فیصد آبادی سائیکل سواری کرتی ہے۔ یہاں سائیکل سواری ایک خوشگوار تجربہ ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کیمبرج شہر میں بے شمار تنگ گلیاں پائی جاتی ہیں جہاں پر سائیکل کے ذریعے پہنچنا نسبتاً آسان ہے۔۔۔یہاں سائیکل گاہے چوری بھی ہوجاتے ہیں جس کے بے شمار فائدے ہیں۔اگر آپ کا سائیکل چوری ہوجائے تو نئی سائیکل خریدیے اور اسکی سواری سے لطف اٹھائیے۔آپ کی اپنی پھٹیچر سائیکل سے جان چھوٹ جائے گی۔اور اگر آپ کسی دوسرے کا سائیکل چوری کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو یہ نہایت زبردست ایڈونچر ہوگا کیونکہ سائیکل چوری کرنے کے بعد آپ کو فوراً جائے وقوعہ سے رفو چکر ہونا پڑے گا جس کے نتیجے میں آپ کسی خوبرہ حسینہ یا پولیس سے ٹکرا سکتے ہیں اور لطف دوبالا بھی ہوسکتا ہے۔۔۔ہم حیران ہیں کہ موٹر سائیکل بھی سائیکل کی جگہ پر استعمال کئے جاسکتے ہیں مگر آپ کو کیمبرج میں شائد ہی کبھی کوئی موٹر سائیکل سوار

UrduDost Library UrduDost.com

نظر آتا ہے۔اور ہم نے تو اکیسویں صدی میں ایک نئی چیز بھی اپنائی ہے جس کا نام موٹر سائیکل رکشہ ہے۔جس کا انجن موٹر سائیکل کا اوراس میں سواریوں کی تعداد بس کے برابر ہوتی ہے۔کیونکہ اس میں یہ پرویژن دستیاب ہے کہ ہر مسافر کے کندھوں اور گود میں ایک اور مسافر سوار ہوسکتا ہے۔اس مسافر بالائے مسافر اور سواری درسواری حکمتِ عملی سے ہر چوک پر موٹر سائیکل رکشہ اپنا اگلا پہیہ ہوا میں ایسے بلند کر لیتا ہے جیسے پنجابی فلموں میں ہیرو گھوڑے کی اگلی ٹانگیں ہوا میں بلند کر کے، پچھلی ٹانگوں، ناظرین کی دعاؤں اور خدا کے سہارے کھڑا ہوتا ہے۔یہ منظر اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ اگر آپ اسکا مشاہدہ کرلیں تو کبھی فن لینڈ میں کسی پنگھوڑے اوراڑن کھٹولے میں بیٹھنے کی آرزو نہیں کریں گے۔ہم ناحق ٹوکیو کے ڈزنی لینڈ میں خوار ہوتے رہے ہیں۔جو لطف اور خوف آپ کو رولر کوسٹر میں سوار ہونے میں میسر آتا ہے، وہی سب کچھ موٹر سائیکل رکشہ میں آتا ہے۔بس حسِ لُطف موجود ہونی چاہیئے۔یہ نہایت کم خرچ، آرام دہ، خوبصورت، بے آواز، آلودگی نہ پیدا کرنے والی سواری ہے جو لاہور میں جا بجا ملتی ہے۔اس کے ڈھنگ، رنگ اور آہنگ سے ہماری معاشرتی، معاشی اوراعلیٰ حسیاتی ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کاش کیمبرج کے ٹرانسپورٹ کے منصوبہ سازاسے ملاحظہ فرمائیں۔وہ ہمیں داد دیے بغیر نہ رہ پائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ کیمبرج میں اسکو رواج دینے کی کوشش بھی کریں۔۔ہم تو صرف مشورہ ہی دے سکتے ہیں۔اس مشورے سے بچنا البتہ ان کے اختیار میں ہے۔۔۔

کیمبرج شہر کے عین وسط یعنی سٹی سنٹر کے بالکل قریب ایک انتہائی خوبصورت گراؤنڈ ہے۔یہاں پر اگی ہوئی گھاس اس قدر شاندار ہے کہ آپ کتنے ہی نازک طبع کیوں نہ ہوں، ایک مرتبہ چند قدم ننگے پاؤں، چہل قدمی کے لئے بے تاب ہو سکتے ہیں۔یہ دلکش میدان ’پارکرز پیس‘ کے نام سے جانا جاتا ہے۔۱۶۱۳ء سے پہلے یہ میدان ٹرینٹی کالج کی ملکیت تھا۔لیکن اسی برس ٹرینٹی کالج نے کسی دوسرے قطعہ زمین کے بدلے یہ میدان کیمبرج ٹاؤن کو دے دیا۔بعدازاں کالج کے ایک باورچی، جسکا نام ایڈورڈ پارکر تھا، کے نام سے اسے منسوب کر دیا گیا اور یوں اس کا نام پارکرز پیس ہوگیا۔یہ مربع شکل میں قریباً ۱۲۵ ایکڑ قطعہ اراضی ہے۔اسکے دونوں وتر کی سمت میں دو

UrduDost Library UrduDost.com

فٹ پاتھ نما راستے بنے ہوئے ہیں جہاں آپ پیدل گھوم سکتے ہیں یا سائیکل سواری بھی کر سکتے ہیں۔ یہ میدان ۱۸۱۷ء سے ۱۸۶۴ء تک فرسٹ کلاس کرکٹ کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی رسمِ تاجپوشی کا جشن منانے کے لئے اسی میدان میں پندرہ ہزار لوگوں کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس جگہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہیں پر فٹ بال کھیلنے کے قوانین وضع کئے گئے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں یہاں پر کیمبرج قوانین کے نام سے فٹ بال کھیلنے کے جو سادہ اصول بنائے گئے تھے۔ وہ دراصل کیمبرج یونیورسٹی کے طلبا نے وضع کئے تھے۔ ان قوانین کا بنیادی اصول کھیل کے دوران قوت اور طاقت کی بجائے مہارت کا استعمال تھا۔ اسی بنیاد پر فٹ بال میں بال کو ہاتھ سے پکڑنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ یہ سادہ اصول ۱۸۶۳ء میں لندن میں فٹ بال ایسوسی ایشن کے وضع کردہ قوانین کی بنیاد بنے تھے۔ اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فٹ بال جیسے انتہائی مقبول کھیل کی ابتداء یہیں سے ہوئی تھی۔ یہ میدان کیمبرج کا مشہور ترین پکنک سپاٹ ہے۔ سردیوں کے موسم میں پارکرز پیس کی گھاس اور کناروں پر بنے ہوئے بنچوں پر بیٹھ کر دھوپ تاپنا اور خوش گپیاں کرنا ایک نہایت پُرتسکین تجربہ ہے۔ یہاں گورے، گوریاں پہروں بیٹھتے ہیں اور اپنے دکھ سکھ بانٹتے ہیں۔ کیمبرج میں کرکٹ اور فٹ بال کے علاوہ رگبی اور واٹر سپورٹس مثلاً کشتی رانی بھی بہت پسند کی جاتی ہیں۔

عہدِ حاضر میں جس جگہ کیمبرج واقع ہے۔ صدیوں پہلے یہاں ایک دریا بہتا تھا۔ جس کا نام دریائے کیم تھا۔ اس دریا کے دونوں اطراف پر انسان آباد ہو گئے تھے۔ دریا کے دونوں طرف آمدورفت کے لئے اس کے اوپر ایک برج یعنی پُل تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی کیم اور برج کے بننے کے بعد اس جگہ کا نام کیمبرج بن گیا تھا۔ دریائے کیم اس علاقے میں ہمیشہ ہی بہت اہم رہا ہے۔ یہ دریا کیمبرج میں جنوب مغربی حصے میں داخل ہوتا ہے اور شمال کی طرف بہتے ہوئے گزرتا ہے۔ اور ایلی شہر کے جنوب میں ایک اور دریا میں مدغم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ دونوں دریا سمندر میں جا گرتے ہیں۔ کیمبرج سے سمندر یعنی بحرِ شمالی کا فاصلہ قریباً چالیس میل ہے۔ انگلینڈ میں دریاؤں پر لاک بھی لگائے جاتے ہیں۔ یہ لاک دراصل دریا کے پانی کے سامنے عارضی بند ہوتے ہیں۔ جنہیں

UrduDost Library UrduDost.com

کسی وقت بند کر دیا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت دوبارہ کھول دیا جاتا ہے۔ لاک بند کرنے اور کھولنے سے دریا کے ایک خاص حصے میں پانی کی سطح کم یا زیادہ کی جا سکتی ہے۔ دریائے کیم میں دو عدد لاک بنائے گئے ہیں۔ ایک لاک کیمبرج شہر کے وسطی علاقے میں ہے جس کا نام مسیح لاک ہے اور دوسرا شمال میں واقع ہے۔ اس کا نام 'بیٹس بائٹ لاک' ہے۔ یہ لاک ہماری رہائش گاہ یعنی گیٹ ہاؤس سے اندازاً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہوگا۔ ان دونوں لاکس کے درمیانی حصے میں کشتی رانی کی جاتی ہے۔ نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ دریائے کیم میں رہائشی کشتیاں بھی موجود ہیں جن میں لوگ رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ان کشتیوں میں گھر جیسی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ کچن، بیڈ روم، ٹی۔ وی۔ لاؤنج سب کچھ میسر ہوتا ہے۔ جو لوگ ان کشتی گھروں میں رہتے ہیں اُن کو 'کیم بوٹرز' کہا جاتا ہے۔۔۔ پکارنا تو انہیں مینڈک چاہیئے۔۔۔ دریائے کیم کے حوالے سے انگلینڈ میں کافی ادب بھی تخلیق ہوا ہے۔ مختلف کہانیوں، کتابوں، ناولوں اور فلموں میں دریائے کیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ دریائے کیم میں کسی قسم کا فضلہ ٹھکانے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے پانی کا رنگ سبزی مائل ہے جسکی بنیادی وجہ اس میں موجود نباتات ہیں۔ اسمیں سے مچھلیاں بھی پکڑی جاتی ہیں۔ 'بربوٹ' نامی مچھلی کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ انگلینڈ میں ناپید ہو چکی ہے کیونکہ مچھلی کی یہ قسم ۱۹۷۰ء کے بعد یہاں دریاؤں میں نظر نہیں آئی ہے۔ حالیہ برسوں میں دریائے کیم میں اس مچھلی کے پائے جانے کے شواہد ملے ہیں۔ چونکہ دریائے کیم بحرِ شمالی میں اختتام پذیر ہوتا ہے اسلئے صدیوں تک کیمبرج قدرتی طور پر ایک اندرونِ زمین پورٹ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ سمندر کے ذریعے جو مال بیرونِ برطانیہ سے لایا جاتا تھا، اس کو دریائے کیم کے راستے کیمبرج تک پہنچایا جاتا رہا ہے۔ سترھویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں دریائے کیمبرج کے ذریعے انسانوں اور اشیاء کی آمدورفت ایک معمول رہی ہے۔ اس آمدورفت پر مختلف ٹیکس لگائے گئے تھے جن سے حاصل ہونے والی خطیر آمدنی کو دریا کی تعمیر وترقی کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۸۴۴ء کے لگ بھگ انگلینڈ میں مشرقی کاؤنٹیز ریلوے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے بعد دریائے کیم کے ذریعے انسانی آمدورفت قریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ جبکہ دیگر اموال اور اشیاء کی دریا

UrduDost Library UrduDost.com

کے ذریعے آمدورفت میں نمایاں کمی آنا شروع ہوگئی۔ بعد ازاں جنگِ عظیم اول تک اشیاء کی آمدورفت بھی ختم ہوگئی۔

دریائے کیم میں کشتی رانی نہایت مقبول مشغلہ ہے۔ کشتی رانی کی بہت ساری اقسام ہیں۔ پہلی قسم میں ملاح صرف ایک طرف سے چپو چلاتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ دونوں طرف سے چپو چلا سکتا ہے۔ ایک اور قسم کو بادبانی کشتی کہتے ہیں جس میں ہوا کے رخ سے کشتی چلائی جاتی ہے۔ اس کو 'سیلنگ' کہتے ہیں۔ کیمبرج میں کیم سیلنگ کلب ۱۸۹۹ء میں قائم کیا گیا تھا۔ کیمبرج شہر کے اندر دریائے کیم کی چوڑائی کم ہونے کی وجہ سے سیلنگ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن شہر کے شمالی جانب واٹر بیچ کا علاقہ ہے جہاں دریا کا پاٹ قدرے چوڑا ہے۔ یہ جگہ سیلنگ کے لئے موزوں ہے اور یہاں پر مارچ سے نومبر کے مہینوں میں سیلنگ کے پر جوش مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ بالائی دریائے کیم میں لوگ تیراکی بھی کرتے ہیں۔ کشتی رانی کی ایک بہت معروف قسم کو انگریزی میں 'روئنگ' کہا جاتا ہے۔ اس میں عام طور پر ایک سے زائد ملاح کشتی میں ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ کر ایک ہی رخ اور ٹائمنگ کے ساتھ چپو چلاتے ہیں۔ اور چپو کی طاقت کے ردعمل کے نتیجے میں کشتی دریا میں آگے بڑھتی جاتی ہے۔ روئنگ میں جب کئی ملاح رنگین ملبوسات پہنے ہوئے ایک ساتھ چپو چلاتے ہیں اور کشتی تیز رفتاری سے تیرتی ہے تو یہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔

کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اپنے اپنے 'بوٹ کلب' ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سال میں ایک مرتبہ روئنگ یعنی کشتی رانی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ کشتی رانی کے اس میچ کی نہ صرف کیمبرج اور آکسفورڈ بلکہ پورے برطانیہ میں بہت اہمیت ہے۔ یہ میچ لندن میں دریائے تھیمز میں عام طور پر مارچ کے آخری یا اپریل کے پہلے ہفتہ کے دن منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ مقابلہ دونوں یونیورسٹیوں کے موجودہ اور سابق طلباء کے علاوہ عام لوگوں کے لئے بھی انتہائی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ تقریباً دس لاکھ افراد دریا کے کناروں کے پاس بیٹھ کر اس مقابلے کو پُر جوش انداز میں دیکھتے ہیں۔ جبکہ برطانیہ کے مختلف علاقوں میں ستر سے نوے لاکھ لوگ ٹی۔ وی۔ پر براہِ راست اس مقابلے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ برطانیہ سے باہر پوری دنیا میں لوگوں کی ایک

UrduDost Library UrduDost.com

بہت بڑی تعداد اس مقابلے کو ملاحظہ کرتی ہے۔ایک اندازے کے مطابق برطانیہ سے باہر تقریباً بارہ کروڑ افراد براہِ راست یہ مقابلہ دیکھتے ہیں اور اسطرح یہ مقابلہ پوری دنیا میں ایک دن میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا کھیلوں کا مقابلہ ہے۔اس مقابلے میں ایک کشتی میں آٹھ ملاح ہوتے ہیں جو پوری مہارت کے ساتھ چپو چلاتے ہیں۔دونوں ٹیموں کے ملاحوں یا کھلاڑیوں کو 'بلیوز' یا 'نیلے' اور اسی طرح دونوں کشتیوں کو نیلی کشتیاں کہا جاتا ہے۔دونوں ٹیموں میں فرق کرنے کے لئے کیمبرج کو ہلکا نیلا اور آکسفورڈ کو گہرا نیلا کہا جاتا ہے۔اس ریس کا پہلا مقابلہ ۱۸۲۹ء میں ہوا تھا۔ یہ مقابلہ ۱۸۵۶ء سے ہر سال منعقد کیا جاتا رہا ہے۔ان مقابلوں میں آج تک صرف دو مرتبہ تعطل آیا ہے۔ یہ دونوں مواقع پہلی اور دوسری جنگِ عظیم ہیں۔کشتی رانی کے اس مقابلے کا آغاز بھی دلچسپ ہے۔چارلس مریویل اور چارلس ورڈز ورتھ نامی دو دوست تھے۔ وہ دونوں سکول میں ہم جماعت تھے۔سکول کے بعد مزید تعلیم کے لئے چارلس مریویل کیمبرج اور چارلس ورڈز ورتھ آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔۱۸۲۹ء میں کیمبرج کے چارلس مریویل نے آکسفورڈ کے چارلس ورڈز ورتھ کو کشتی رانی کے مقابلے کے لئے چیلنج کیا اور یوں یہ مقابلہ شروع ہوا تھا۔ابتدائی سالوں میں کیمبرج اور آکسفورڈ کے درمیان مقابلے کے مقام کے حوالے سے اختلافات بھی رہے ہیں۔جس کے نتیجے میں یہ مقابلہ مختلف مقامات پر منعقد کیا جاتا رہا ہے۔اس مقابلے میں دونوں کشتیاں سوا چار میل کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ یہ راستہ انگریزی حرف 'ایس' کے مشابہ ہے۔ ریس شروع ہونے سے پہلے ٹاس کیا جاتا ہے۔اور ٹاس جیتنے والی ٹیم فیصلہ کرتی ہے کہ اُس نے دریا کے کس کنارے کی طرف سے اپنی ریس کا آغاز کرنا ہے۔دریائی کنارے کا تعین،موسم اور ریس کے راستے کے خم وغیرہ کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کرکٹ میں میچ شروع ہونے سے پہلے ٹاس کر کے بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔کرکٹ میں موسم، ہوا، بال، وکٹ، نمی جیسے عوامل کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ٹاس جیتنے والی ٹیم بیٹنگ کرے گی یا باؤلنگ۔کیمبرج اور آکسفورڈ کے مابین کشتی ریس کا ایک اور اہم پہلو ہے۔وہ یہ کہ کھلاڑیوں کا انتخاب کیسے کیا جائے۔کھلاڑیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یونیورسٹی کے طالبعلم ہوں۔ان کا

UrduDost Library UrduDost.com

یونیورسٹی میں داخلہ بالکل اسی طریقہ کار سے ہوتا ہے جیسے ایک عام طالبعلم کا۔ مراد یہ ہے کہ دونوں یونیورسٹیوں کے پاس کھیل کی بنیاد پر کسی کو داخلہ دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اس کشتی ریس کا مقصد طالبعلموں کے درمیان کھیلوں میں ایک صحتمند مقابلے کی فضا قائم کرنا ہے نہ کہ پروفیشنل کھلاڑیوں کے ذریعے ریس جیتنا۔۔۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے سکول کی کبڈی ٹیم کھیل میں نہایت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ایسے ایسے پہلوان کبڈی کے میچوں سے پہلے اچانک آسمان سے وارد ہوتے جو رستم زماں کو پچھاڑنے کی اہلیت رکھتے۔ مجال ہے کہ کسی دوسرے سکول کی ٹیم میچ کا وقت ہی پورا کر پاتی۔ بیچارے عین میچ کے بیچ علی الاعلان اپنی شکست تسلیم کر کے باقیماندہ زندگی بچاتے ہوئے فرار ہو جاتے۔ میچ سے قبل اور اس کے درمیان ہمارے تمام دوست اور اساتذہ ششدر رہ جاتے کہ ایسے پہلوان انہوں نے سکول میں تو کیا کبھی ٹی۔وی۔ میں فری اسٹائل کشتیوں میں بھی نہیں دیکھے۔ مقابل ٹیمیں بھی یہی اعتراض کرتیں کہ ہمارے پہلوان عرف کھلاڑی کسی طور پر سکول کے طالبعلم نہیں ہیں۔ لیکن قربان جائیے ہمارے سکول کے محترم پی۔ٹی استاد پر کہ ہر پہلوان کے تمام طالبعلمانہ کوائف ان کے پاس موجود ہوتے۔ کب انہوں نے داخلہ لیا۔ کس کلاس میں پڑھتے ہیں۔ پڑھائی کا کیا ریکارڈ ہے اور کب انہوں نے تعلیم مکمل کر کے دوسری ٹیموں کو سکون کا سانس لینے دینا ہے۔ اکثر یوں ہوتا کہ مقابل ٹیم وہ سارے کوائف لے کر اس خوش فہمی میں گھر روانہ ہو جاتی کہ جب یہ پہلوان تعلیم مکمل کر لیں گے تو پھر مقابلے ہوا کریں گے۔ مگر آفرین ہے پی۔ٹی استاد پر کہ وہ آنے والے سالوں کی منصوبہ بندی ہمیشہ قبل از وقت کر لیتے اور آنے والے سالوں میں اسی نوع کے نئے پہلوان نجانے کہاں سے پھر ڈھونڈ کر لے آتے۔ یہ تو خیر کبڈی کا حال تھا۔ کرکٹ اور ہاکی کی بھی سن لیجئے۔ ان دونوں کھیلوں میں، ہمیں آج تک اچھی طرح یاد ہے، ہمارے سکول کی ٹیم کا پلڑا نہائت بھاری رہتا۔ کرکٹ میں دورانِ میچ ایک بیٹسمین برآمد ہوتے جو محض پانچ اوورز میں سنچری مکمل کر لیتے۔ ایسی ایسی شاٹس کھیلتے کہ مخالف ٹیم کے چھکے چھوٹ جاتے۔ ایک ایسے ہی بلے باز ہمارے سکول کو میچ جتوانے کے بعد ہمیں کچھ سالوں کے بعد قومی ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر

UrduDost Library UrduDost.com

آئے۔ ہاکی کا ماحول اس سے بھی شاندار تھا۔ ہمارے سکول کے ہاکی ٹیم کے کپتان، جنہیں صرف اہم میچوں میں ہی دیکھنے کا موقع ملتا، بعدازاں قومی ٹیم کے رکن بنے۔ رکن بننا بھی چھوٹی بات ہے وہ قومی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ بلکہ ایک وقت ان پر ایسا بھی آیا کہ دنیائے ہاکی میں ان جیسا فارورڈ نہیں پایا جاتا تھا اور جرمنی اور آسٹریلیا کی قومی ٹیموں کے کوچ اُن کے کھیل کے باقاعدہ نوٹس لیا کرتے تھے۔۔۔ کیسے کیسے کھلاڑی ہوتے تھے ہمارے سکول کے پاس۔۔۔ ہاں تو کیمبرج اور آکسفورڈ کی ٹیمیں صرف اپنے طلبا تک ہی محدود ہوتی ہیں۔ مثلاً ۲۰۰۵ء میں کیمبرج کی کشتی رانی کی ٹیم میں چار ایسے کھلاڑی موجود تھے جو اسی یونیورسٹی میں باقاعدہ پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ایک انتہائی کڑے طریقہ کار کے تحت چنے جاتے ہیں، کھلاڑی بننے کے امیدوار طالبعلموں کے ٹرائل پر ٹرائل ہوتے ہیں اور صرف بہترین کھلاڑی ہی ٹیم کی رکنیت کا اعزاز حاصل کر پاتے ہیں۔ ٹیم میں منتخب ہونے کے بعد مقابلے سے چھ ماہ پہلے ان کی تربیت شروع ہو جاتی ہے اور ہر کھلاڑی کو ہفتے میں لازماً چھ دن تربیتی کورس میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ تب جا کر بیچارے میچ کھیلتے ہیں اور کتنے میچ۔۔۔ صرف ایک میچ۔۔۔ واقعی دانہ خاک میں مِل کر گل وگلزار ہوتا ہے۔۔۔ لیکن ان کھلاڑیوں میں پھر ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے بعد میں اولمپک مقابلے بھی جیتے ہیں۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے کشتی ریس کے مقابلے اسپانسر بھی کیئے جاتے ہیں لیکن دوسری کھیلوں کے برعکس اسپانسر کا نام اور نشان کھلاڑیوں کی شرٹس اور ان کی کشتیوں پر نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ پابندی اس کھیل کو کاروباری نہ بنانے کے حوالے سے کی گئی ہے لیکن آجکل اسپانسرز اس پابندی کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ اگرچہ اصل مقابلہ کیمبرج اور آکسفورڈ کی مردانہ ہیوی ویٹ ٹیموں کے درمیان ہی ہوتا ہے لیکن اس مقابلے سے کچھ عرصہ پہلے، سٹارٹر کے طور پر، کیمبرج اور آکسفورڈ کی دوسری ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوتی ہیں۔ ان مقابلوں میں دونوں یونیورسٹیوں کی ریزرو ٹیمیں، مردانہ لائٹ ویٹ ٹیمیں، خواتین کی ہیوی اور لائٹ ویٹ ٹیمیں اور تجربہ کار، پرانے 'بابوں' کی ٹیمیں بھی حصہ لیتی ہیں۔ ابھی تک ہونے والے سالانہ مردانہ ہیوی ویٹ مقابلوں میں سے اسّی مقابلے کیمبرج اور پچھتر مقابلے آکسفورڈ نے جیتے

UrduDost Library UrduDost.com

ہیں۔کیمبرج نے آج تک ہونے والے اِن مقابلوں میں سب سے تیز کشتی ریس کا ریکارڈ بھی بنایا ہے۔۱۹۹۸ء میں کیمبرج کی ٹیم نے سوا چار میل کا فاصلہ ساڑھے پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۱۶ منٹ اور ۱۹ سیکنڈ میں مکمل کیا تھا۔اس کے علاوہ کیمبرج کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُس نے آکسفورڈ کو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک مسلسل تیرہ مرتبہ شکست سے دوچار کیا ہے۔کیمبرج میں ہر کالج کا اپنا روئنگ کلب بھی ہے۔جن کے درمیان مقابلے سارا سال جاری رہتے ہیں۔

کشتی رانی کی ایک بہت مشہور قسم کو'پنٹنگ' کہا جاتا ہے۔پنٹنگ بلاشبہ کیمبرج میں انتہائی مقبول ہے۔آپ کو جگہ جگہ دریائے کیم پر پنٹنگ کے لئے کشتیاں مل سکتی ہیں۔یہ کشتیاں شوقین اور منچلے خود چلاتے ہیں۔اس کے علاوہ پنٹ یعنی کشتی شوفر یعنی ملاح سمیت بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ ہر سیاح جو کیمبرج دیکھنے آتا ہے۔وہ ایک دفعہ پنٹنگ کا مزہ ضرور لیتا ہے۔پنٹ ایسی کشتی کو کہتے ہیں جس کا پیندہ ہموار ہوتا ہے۔یہ کشتی کم گہرے پانی میں کشتی رانی کرنے کے لئے نہایت موزوں ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ اس کشتی کو عام چپو کی بجائے ایک سیدھے ڈنڈے، جسے'ڈانگ' کہنا زیادہ مناسب ہے، کی مدد سے چلایا جاتا ہے۔یہ ڈنڈا یا لاٹھی قریباً پندرہ، بیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اسے عام چپو کی طرح استعمال نہیں کیا جاتا۔کیمبرج شہر کے اندر چونکہ دریائے کیم کی گہرائی زیادہ نہیں ہے۔اس لئے یہ لاٹھی کشتی کے پچھلے حصے پر کھڑے ہو کر دریا میں عموداً کھڑی کر دی جاتی ہے۔یہ لاٹھی دریا کی زمینی سطح کو چھوتی ہے بلکہ اسے ہلکے سے زور کے ساتھ دریا کی ریت اور کنکریوں میں گاڑ دیا جاتا ہے۔اور پھر قوت لگا کر پیچھے کی طرف دھکیلا جاتا ہے جس کے ردِعمل کے طور پر کشتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔پنٹنگ (Punting) کیمبرج میں اسقدر ہر دلعزیز ہے کہ بہت سارے لوگ فارغ وقت یا تعطیل کے روز پنٹنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔سیاحوں کی پنٹنگ میں دلچسپی کی بہت اہم وجہ یہ ہے کہ دریائے کیم کیمبرج یونیورسٹی کے کئی تاریخی کالجوں کے پچھواڑے سے گزرتا ہے۔اس کی علاوہ کئی تاریخی کالج دریائے کیم کے دونوں طرف واقع ہیں۔ تاریخی کالجوں کے عقبی اطراف یا درمیان میں سے گزرنے کی وجہ سے دریائے کیم میں پنٹنگ کرتے ہوئے آپ ان کالجوں کے انتہائی قدیم اور خوبصورت مناظر دیکھ سکتے ہیں۔خصوصاً ایسے

UrduDost Library UrduDost.com

مناظر جو کالجوں کے سامنے کی اطراف سے نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ کئی کالجوں کے صدیوں پرانے لان بھی دریائے کیم کے کنارے واقع ہیں۔ قدیم عمارات، لان، دریائے کیم اور بسا اوقات آسمان پر موجود بادل مل کر ایسا سماں باندھتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ دریائے کیم پر ڈارون کالج کے لکڑی کے بنے ہوئے دو پُل موجود ہیں جو دریا کے دونوں طرف کالج کو ملاتے ہیں۔ کوینز کالج بھی دریا کے دونوں اطراف واقع ہے جن کو ملانے والے پُل کا نام میتھ میٹیکل برج یا 'ریاضیاتی پُل' ہے۔ یہ پُل تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ۱۷۴۹ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد ازاں اس کو ۱۸۶۶ء اور ۱۹۰۵ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ لیکن اس کے اصلی ڈیزائن کو تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ اس کو ریاضیاتی پُل اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ریاضی کے ایک کلئے کے مطابق بنایا گیا تھا۔ پُل ایک قوس کی شکل میں ہے۔ جس کے ساتھ مختلف رداسوں کی شکل میں لکڑی کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں۔ ان رداسی ٹکڑوں کو پُل کی قوس کے ساتھ لگے ہوئے لکڑی کے مماسی ٹکڑوں کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ دراصل اس قسم کے ڈھانچے کو ریاضی میں 'مماسی اور رداسی ڈھانچہ' کہتے ہیں۔ کسی ڈھانچے کو اسطرح ترتیب دینے سے اس کی طاقت کافی بڑھ جاتی ہے اور ایسے ڈھانچے دیرپا تصور کئے جاتے ہیں۔ اس پُل کے بارے میں ایک دلچسپ حکایت زبان زدِ عام ہے۔ کہ یہ پُل نیوٹن نے بغیر نٹ اور بولٹوں کے تعمیر کیا تھا۔ نیوٹن کے بعد کے زمانوں میں کئی مرتبہ اس پُل کے ڈھانچے کو علیحدہ کرنے کے بعد اس کو اکھاڑا گیا۔ اور پھر اسے از سرِ نو تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بعد میں کبھی بھی یہ نٹ اور بولٹوں کے بغیر تعمیر نہ ہوسکا۔ چنانچہ مجبوراً اس میں نٹ اور بولٹ کسنے پڑے۔۔۔ گویا نیوٹن کے زمانے میں نٹ اور بولٹ سرے سے موجود ہی نہ تھے یا پھر اُسے اِن کے استعمال سے چڑ تھی۔۔۔ ایسا نہیں، بتانا یہ مقصود ہے کہ نیوٹن یہ پُل بنانے کے لئے نٹ اور بولٹ کا محتاج نہ تھا۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ پُل اصل میں نیوٹن کے انتقال کے بائیس برس بعد بنایا گیا تھا اور پہلی تعمیر میں بھی نٹ، بولٹ استعمال ہوئے تھے۔۔۔ ہم تو صرف بدنام ہی ہیں۔ اصل میں گورے بھی اپنے مشاہیر کا قد بڑھانے کے لئے محیر العقول قصے گھڑ لیتے ہیں۔ ہماری تاریخ تو ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں کسی کی شان بڑھانے یا

UrduDost Library UrduDost.com

گھٹانے کے لئے واقعات گھڑنے کی بیشمار روایات موجود ہیں۔ دریائے کیم پر کنگز کالج کا پُل بھی بہت مشہور ہے۔ یہ پُل پہلی مرتبہ پندرھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا، تاہم یہ بعد کے کئی ادوار میں دوبارہ بنایا گیا۔ اس پُل کے پاس کنگز کالج اور اس کے احاطے میں موجود مشہورِ زمانہ چیپل یا گرجا گھر اور کالج کے عقبی لان کا نظارہ بے حد دلفریب ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے بہت ساری تصاویر میں کیمبرج کی نمائندہ تصویر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں بہت سارے مصور اپنے اپنے کینوس لگائے منظر کشی کر رہے ہوتے ہیں۔ دریائے کیم پر اس وقت موجود تمام پُلوں میں، سب سے قدیم پُل کلئیر کالج کا پُل ہے۔ جو ۱۶۴۰ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ قدیم طرزِ تعمیر کا پُل ہے۔ اس کی ایک قوس میں کام ادھورا چھوڑا ہوا ہے۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے معمار کو پوری ادائیگی نہیں کی گئی تھی اور اس نے انتقاماً اس کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔۔۔ بہت خوب، مزدوروں اور معماروں کے ساتھ دھوکہ دہی اور ان کا جواباً کام مکمل نہ کرنے کا وطیرہ، ہمارے ہاں شائد گوروں سے ہی منتقل ہوا ہے۔ انگلینڈ میں تو شائد یہ ایک ہی پُل کی تعمیر کے سلسلے میں ہوا ہوگا۔ مگر آفرین ہے ہم پر۔ ہم نے قدم قدم پر اس درخشاں روایت کی پیروی کر کے سرخروئی کی منزل پالی ہے۔۔۔ ٹرینٹی کالج اور ٹرینٹی ہال کے درمیان واقع پُل کا نام گیرٹ ہاسٹل پُل ہے۔ اس پُل کی چڑھائی دوسرے پُلوں سے زیادہ ہے جس بنا پر سائیکل سواروں کے لئے اس پر چڑھنا قدرے دشوار ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اس پُل پر چڑھ جاتے ہیں تو اترائی بھی اسی مناسبت سے زیادہ ہونے کے سبب سائیکل تیز رفتاری سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس طرح سائیکل سوار پُل کے اوپر چڑھتے ہوئے بہت زور لگاتے ہیں لیکن اترائی کے وقت تیز رفتاری کی وجہ سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس پُل کا نام 'اور گیزم برج' ہے۔ اگر آپ کو 'اور گیزم' کا اردو ترجمہ نہیں آتا ہے تو فوراً لغت سے رجوع کیجئے۔ سائیکل سواروں کے ساتھ ساتھ آپ بھی محظوظ ہوں گے۔۔۔ آخر ہم ہی کیوں فحش گوئی کے مرتکب ہوں۔ کوئی گناہ تو آپ کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے۔

دریائے کیم پر دوسرا قدیم پُل سینٹ جان کالج کا کچن برج ہے۔ یہ ۱۷۱۰ء میں بنایا گیا

UrduDost Library UrduDost.com

تھا۔اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ چونے کے ایک ہی بڑے پتھر سے تراشا گیا تھا۔سینٹ جان کالج کا دوسرا پل 'آہوں کاپُل' کہلاتا ہے۔یہ۱۸۳۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔اسکا نام وینس میں موجود 'آہوں کے پُل' سے مستعار لیا گیا تھا۔اس پُل کی خوش بختی یہ ہے کہ یہ ملکہ وکٹوریہ کا پسندیدہ پُل رہا ہے۔اس کو آہوں کا پُل اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے دونوں اطراف سینٹ جان کالج کی عمارات ہیں۔ایک طرف طلباء کا ہاسٹل ہے اور دوسری طرف اساتذہ کے دفاتر ہیں۔جہاں پڑھائی کے سلسلے میں ان کی گوشمالی ہوتی رہتی ہے۔اس لئے جب طلباء اساتذہ کے دفاتر جاتے ہیں یا وہاں سے واپس آتے ہیں تو وہ ٹھنڈی سانسیں اور آہیں لے رہے ہوتے ہیں۔دریائے کیم پر ایک اور اہم پُل ٹرینٹی کالج کا پُل ہے جو پہلی مرتبہ۱۶۵۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔البتہ موجودہ پُل ۱۷۶۴ء میں بنایا گیا تھا۔بالکل اسی طرح ماڈلین کالج کا پُل پہلی مرتبہ۱۸۳۱ء میں جبکہ یہی پُل موجودہ حالت میں۱۹۸۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔دریائے کیم میں بنائے گئے مسیح لاک کے اوپر بھی ایک پُل ہے جس کے اوپر سے عام لوگ گزر کر دریا کے دوسری طرف جاتے ہیں۔یہ پُل۱۸۹۲ء میں مکمل کیا گیا تھا۔یہ پُل اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ایک جانب پنٹنگ یعنی لاٹھی والی کشتی رانی اور دوسری جانب روئنگ یعنی متعدد ملاحوں والی کشتی رانی کی جاتی ہے۔دریائے کیم کے اوپر بنائے گئے پُلوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے ہوئے یہ گمان ہونے لگا کہ شائد یہاں پُل کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ موہنجودڑو کے عہد میں تعمیر کیا گیا ہو۔جس پُل کو دیکھو کم از کم ایک صدی پرانا ضرور ہے۔کیا حالیہ پچاس،سو برسوں میں پُل بنانے والے انجینئر،معمار اور مزدور چھٹی پر گئے ہوئے ہیں کہ کوئی پُل دورِ حاضر یا ماضی قریب میں نہیں بنایا جا سکا۔لیکن ہماری یہ غلط فہمی بھی جلد دور ہوگئی۔جب ہمیں الزبتھ وے برج کے بارے میں علم ہوا۔یہ چیسٹرٹن کے علاقے میں واقع ہے جو کبھی کیمبرج شہر کے پاس ایک گاؤں ہوتا تھا۔۱۹۱۱ء میں چیسٹرٹن گاؤں کو کیمبرج شہر میں مدغم کر دیا گیا تھا۔چیسٹرٹن کے علاقے الزبتھ وے کے قریب اس پل کی تعمیر ۱۹۷۱ء میں کی گئی تھی۔اس چار رویہ پُل کا افتتاح کیمبرج کے ہائی سٹیورڈ نے کیا تھا۔جب عزت مآب ہائی سٹیورڈ سنہری قینچی سے افتتاحی فیتہ کاٹنے لگے تو کئی منٹوں تک قینچی فیتہ نہ کاٹ سکی جس سے

UrduDost Library UrduDost.com

حاضرینِ مجلس کے سامنے عزت مآب کی سبکی ہوئی۔ایسا اس لئے ہوا تھا کہ عزت مآب نے صدیوں پرانے پُلوں کے معماروں اور مزدوروں کی برابری کرنے کی جرات کی تھی۔اور ان معماروں اورمزدوروں کی روحوں نے قینچی کو کند کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا تھا۔تاہم نئے پُل بنانے کی حماقت پھر بھی ترک نہیں کی گئی اور حال ہی میں یعنی ۲۰۰۸ء میں چیسٹرٹن اور ریور سائیڈ کے درمیان پیدل چلنے اور سائیکل سواری کرنے والوں کے لئے ایک نیا پُل بنایا گیا ہے۔جس کا بدلہ لینے کے لئے عالم ارواح میں معماروں اور مزدوروں کی انجمنِ ارواح کا اجلاس تا حال جاری ہے۔اجلاس کا لائحہ عمل طے ہوتے ہی نئے پُلوں کے لئے کام کرنے والے تمام افراد کو ہتکِ عزت کے نوٹس جاری کر دیے جائیں گے۔

کامن ویلتھ سکالر شپ اینڈ فیلو شپ ایجنسی کی طرف سے گاہے بگاہے اُن طلبا اور ریسر چرز کی پارٹیاں کی جاتی ہیں جن کو کامن ویلتھ وظائف مل رہے ہوتے ہیں۔ایسے اجتماعات کا مقصد کامن ویلتھ کمیونٹی کے باہمی روابط استوار کرنا ہوتا ہے۔ یہ روابط ان طلبا اور محققین کی زندگیوں میں بڑے کام آتے ہیں۔ یہ اجتماعات مختلف اوقات میں برطانیہ کے مختلف شہروں میں منعقد کیے جاتے ہیں اور دور دراز سے کامن ویلتھ سکالرز اور ریسر چرز ان میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔ایسا ہی ایک اجتماع ہمارے قیامِ کیمبرج کے دوران منعقد ہوا۔جس میں کامن ویلتھ طلبا اور ریسر چرز کو مدعو کیا گیا تھا۔ہمیں بھی بذریعہ ای۔میل دعوت نامہ موصول ہوا۔ہم نے فوراً اس پارٹی میں شرکت کا ارادہ کر لیا۔اس پارٹی کے ایجنڈے میں کیمبرج سٹی سنٹر کے قریب واقع پارکرز پیس میں پکنک اور دریائے کیم میں کشتی رانی کا پروگرام تھا۔سہولت کی خاطر یہ پروگرام اتوار کے دن رکھا گیا تا کہ کسی کی پڑھائی کا ہرج نہ ہو۔۔۔یہ سہولت دوسروں کے لئے ہوگی،ہم تو ہر روز تعطیل سے بہرہ ور ہوتے تھے۔۔۔ہم اپنی تمام تر سستی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مقررہ وقت سے چند منٹ قبل پارکرز پیس پہنچ گئے۔وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں آیا۔دس، پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد ہم نے نوٹ کیا کہ ایک گوری جس کی شرٹ پر بڑا واضح کینیڈا لکھا ہوا ہے،کبھی گھڑی دیکھتی ہے تو کبھی آسمان کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور پھر اپنے ناخن صاف کرنا

شروع کر دیتی ہے۔اسکی شرٹ پر کینیڈا لکھا دیکھ کر یاد آیا کہ میزبان نے ای۔میل میں اپنی یہی نشانی بتائی تھی۔ہم نے جھٹ سے اسے پوچھا کہ کیا آپ کامن ویلتھ پارٹی کی میزبان ہیں۔اس نے فوراًاثبات میں سر ہلایااور ساتھ ہی کہنے لگی کہ شکر ہے آپ آ گئے ہیں ورنہ میرا خیال تھا کہ شائد کوئی بھی مہمان نہیں آ رہا ہے۔ہم نے فوراًہاتھ ملایا۔گوری نے اپنا نام راشیل بتایا۔کہنے لگی میرا نام دراصل فرانسیسی ہے لیکن میں کینیڈین ہوں۔کیمبرج یونیورسٹی میں کریمی نالوجی یعنی جرائم کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی۔کر رہی ہوں۔۔۔جرائم کرنے پر نہیں،غالباً جرائم کی ماہیت اوران کے تدارک پر تحقیق کر رہی ہوگی۔ہم نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ہم نے اپنا مختصر تعارف کروایا۔جلد ہی راشیل اپنی دلچسپیوں کے بارے میں بتانے لگی۔مجھے کھیلوں میں ٹینس پسند ہے۔میں ہفتے میں تین سے چار روز ورزش کرتی ہوں۔مجھے کانٹینینٹل فوڈ اچھا لگتا ہے۔میں کینیڈا میں کیلگری میں رہتی ہوں،وہاں بہت زیادہ ٹھنڈ ہوتی ہے۔کیمبرج کا موسم خوشگوار ہے۔ٹھنڈ کم پڑتی ہے۔مجھے دوست اورفن اچھے لگتے ہے۔میں سکاچ اور وائن شوق سے پیتی ہوں۔کیمبرج بہت بور جگہ ہے۔یہاں نائٹ لائف نہیں ہے۔کوئی کام کا نائٹ کلب نہیں ہے۔کلب جانا ہو تو لندن جانا پڑتا ہے۔لندن آنا جانا کافی مہنگا ہے۔بس کے ذریعے لندن جانا نسبتاً سستا ہے لیکن اس میں بہت وقت برباد ہوتا ہے۔میرا پی۔ایچ۔ڈی سپروائزر عجیب موڈ کا آدمی ہے۔کبھی بہت اچھا اور کبھی نک چڑھا۔کبھی کہتا ہے گھومو پھرو اور کبھی ویک اینڈ پر بھی کام کے لئے بلا لیتا ہے۔تھوڑا خبطی ہے۔آج میرا پکنک ڈے ہے،لیکن اُس نے مجھے اسائنمنٹ دے دی۔میرا دل چاہ رہا ہے میں انجوائے کروں لیکن لگتا ہے کام کرنا پڑے گا۔کام نہ کیا تو وہ میرا ماہانہ وظیفہ کاٹ سکتا ہے۔پھر میرے کھانے اور بالخصوص پینے کا کیا ہوگا۔۔۔کھانے کا بندوبست ہم کر دیں گے،پی کسی اور جگہ لینا۔ہم نے جھٹ پیشکش کی۔۔۔اگر آپ پلا نہیں سکتے تو پھر کھلانے کا کیا فائدہ۔راشیل نے ہماری ادھوری پیشکش کے جواب میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔اب ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔۔۔ہمیں راشیل کی پُر لطف گفتگو کا مزہ آنے لگا۔شکر ہے کوئی اور صاحب پارٹی میں شرکت کے لئے نہیں آئے۔اب صرف ہم اور راشیل گپ شپ کریں گے۔باقی لوگوں نے یہاں آ کر کیا لینا

UrduDost Library UrduDost.com

ہے۔ ویسے بھی انہیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اور تمام تر توجہ پڑھائی اور صرف پڑھائی پر مرکوز رکھنی چاہئے۔۔۔ اور اگر کوئی ایک بھی صاحب آ گئے تو پکنک کا مزہ جاتا رہے گا۔ ہم نے دورانِ گپ شپ غور و خوض کیا۔ اور ساتھ ہی ایسی منحوس صورتحال کے پیش آنے کی صورت میں منصوبہ بندی کرنا شروع کر دی۔ ایسا کرتے ہیں کہ ہم اور راشیل کسی ریستوران میں چلتے ہیں، لنچ کر لیں گے اور دیگر افراد اگر آ بھی گئے تو وہ تو یہیں آئیں گیاور خود ہی نامراد واپس چلے جائیں گے۔ یہ اچھا منصوبہ ہے۔۔۔ ہم نے قہقہے لگاتی راشیل کو کسی قریبی ریستوران میں لنچ کی پیشکش کی۔ کہنے لگی، اگر ہم کھانے کے لئے چلے گئے اور کوئی دوسرا کامن ویلتھ سکالر یہاں آ گیا تو اسکا کیا بنے گا۔۔۔ ہمیں کافی مایوسی ہوئی۔ گویا وہ ابھی تک باقی لوگوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ کیا فائدہ ہماری اتنی میٹھی میٹھی باتوں کا۔۔۔ ہم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا، اگر کسی نے آنا ہوتا تو آ چکا ہوتا۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ ہمارے باطن سے آواز آئی 'گلیاں ہو جان سنجیاں وچ مرزا یار پھرے'۔ یہ پیار بھری تکرار جاری تھی کہ ایک گورا، سر پر اونی ٹوپی پہنے ایسی سائیکل پر سوار جس کی سیٹ بلند اور پہیے بچوں کی سائیکل جیسے تھے، دفعتاً آن دھمکا۔ راشیل کو دیکھتے ہی رکا۔ سائیکل کو بے پروائی سے پار کر زیپس کے گھاس پر گرا کر دھم سے ہمارے اور راشیل کے درمیان بنچ پر براجمان ہو گیا۔۔۔ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یہ منحوس کہاں سے آ ٹپکا۔ ہم نے آہ بھری۔۔۔ تم لوگ یہاں بیٹھے ہو اور میں سارے میدان میں سائیکل گھماتا تم لوگوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ میں نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ راشیل تم بڑے دنوں سے غائب ہو۔ پھر تمہارے سپروائزر کو کام کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔ شکر ہے میرا سپروائزر تو امریکہ گیا ہوا ہے۔ جاتے جاتے مجھے کافی کام دے گیا تھا۔ خیر میں نے کونسا وہ کام کرنا ہے۔ جب واپس آئے گا، دیکھا جائے گا۔ ویسے آدمی برا نہیں ہے۔ میرا کافی خیال رکھتا ہے۔ راشیل تم پچھلے ہفتے پارٹی میں بھی نہیں آئی۔ بڑا زبردست ڈانس ہوا تھا۔ کیمبرج میں ایسی ڈانس پارٹیاں کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں۔ یہاں تو جس سے ملو، کتابی کیڑا ہی نکلے گا۔ کسی کو گھومنے پھرنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں ورنہ میں نے آسٹریلیا گھومنے جانا تھا۔۔۔ کوئی بات نہیں، یورپ

UrduDost Library UrduDost.com

میں یہ اچھی بات ہے۔ایک گھنٹے کی فلائٹ لیں اور کسی دوسرے ملک چلے جائیں۔ میں فرانس جانے کا سوچ رہا ہوں۔تم بھی جاؤ گی میرے ساتھ۔۔۔راشیل نے پیار سے کہا۔چلی تو جاؤں لیکن سپروائزر بہت ناراض ہوگا۔۔۔اس گورے کو شائد یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ بنچ پر دو نہیں، تین لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے گورے کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔معاف کرنا، آپ کا نام کیا ہے۔ کہنے لگا۔اوہ، سوری۔ میں تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔میرا نام فلپ ہے اور میں راشیل کی طرح کینیڈا سے ہوں اور یہاں دہشت گردی پر پی۔ایچ۔ڈی کر رہا ہوں۔تو کیا تم تربیت یافتہ دہشت گرد بنو گے۔ہم نے استفسار کیا۔۔نہیں، میں صرف دہشت گردی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ہوسکتا ہے کہ میرا علم کسی مثبت کام میں مدد کر سکے۔ بہت خوب، ہم نے فلپ کو داد دی۔اور ساتھ ہی ہمارے اور راشیل کے درمیان میزبان اور مہمان کا رشتہ باقی رہ گیا۔اتنی دیر میں قریبی بس سٹاپ پر ایک کوچ آکر رکی جس میں سے دس پندرہ رنگ برنگے مرد و خواتین برآمد ہوئے۔وہ چلتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔اور آتے ہی راشیل سے گپ شپ کرنے لگے۔سوری ہمیں لندن سے یہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ان میں سے ایک نے کہا۔کوئی بات نہیں۔راشیل نے ملائمت سے جواب دیا۔آئیں، گھاس پر بیٹھتے ہیں۔سب لوگ زمین پر ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ہمارے ساتھ بیٹھی ایک پستہ قد، منحنی، سانولی سی لڑکی نے کہا میرا نام سارا کی ہے۔میں پچھلے چار سالوں سے لندن یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہوں۔ میرا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔سارا کی کا سراپا مکمل طور پر جنوبی ایشیائی تھا۔۔۔غالباً انگریزی لہجے اپنانے کے چکر میں اس نے اپنے نام سرائیکی کو سارا کی کہنا شروع کر دیا ہے۔لیکن سرائیکی بھی تو کسی کا نام نہیں ہوتا۔یہ تو ایک علاقے کا نام کہا جاسکتا ہے جسے ہم پاکستان میں جنوبی پنجاب کہتے ہیں۔ ہاں مگر کچھ لوگ اپنے علاقے سے انسیت کی بنا پر ایسے نام رکھ لیتے ہیں۔ہمارے ایک ایسے ہی دوست کا نام افغانستان خان ہے۔ہوں، ہوں۔۔۔اسکا مطلب ہے سارا کی اصل میں سرائیکی ہے اور اس کا تعلق جنوبی پنجاب سے ہے۔شکل وصورت، انداز اور بات کرنے میں ایک ہچکچاہٹ۔۔۔جی بالکل یہ پاکستانی ہیں اور جنوبی پنجاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ہم نے اندازہ لگایا۔تو آپ جنوبی

UrduDost Library UrduDost.com

پنجاب کے کس ضلع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم نے پوچھا۔۔۔ضلع ضلع کیا ہوتا ہے۔ سارا کی نے جواب دیا۔ ہمارا مطلب ہے جنوبی پنجاب کے کس شہر سے آپ کا تعلق ہے۔ہم نے وضاحت کی۔۔جنوبی پنجاب کیا ہے۔سارا کی کہنے لگی۔میرا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے۔ہم بھونچکا گئے۔۔۔جی دراصل میرے آباؤ اجداد جنوبی ہندوستان سے ہجرت کر کے جنوبی افریقہ آگئے تھے۔چلیں جنوبی پنجاب نہ سہی، جنوبی ہندوستان اور جنوبی افریقہ تو ہے۔ ہمارا اندازہ کلیتاً غلط نہیں ہے۔ہم نے اپنے آپ کو تھپکی دی۔۔۔سارا کی سے آگے جینیٹ بیٹھی ہوئی تھی۔اس کا تعلق بھی جنوبی فریقہ سے تھا۔ پھر دو ہندوستانی لڑکیاں تھیں۔ایک کا نام صوفیہ اور دوسری کا نام کملیشندے تھا۔صوفیہ دہلی اور کملیشندے پونا سے تھی۔صوفیہ کا رنگ صاف اور بال سلیقے سے تراشے ہوئے تھے۔اسکی مسکراہٹ نہایت دلآویز تھی۔گفتگو بڑے ٹھہراؤ سے کرتی تھی۔بھئی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ آخر دہلی سے تعلق ہے کوئی مذاق نہیں ہے۔سونے پر سہاگہ۔ وہ ادب پر تحقیق کر رہی تھی۔ کملیشندے کو سات کوس سے بھی دیکھیں تو صاف پتہ چلتا تھا بیچاری کسی سائنس کے مضمون میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہے۔فکر، پریشانی اور پژمردگی چہرے سے نمایاں تھی۔کہنے لگی میرا سبجیکٹ فارمیسی ہے۔۔۔خیر ہمیں کیا۔ہم تو صرف صوفیہ سے گپ شپ کرنا چاہتے تھے۔کملیشندے کے بعد ایک سیاہ فام خاتون تھی۔اس نے کپڑے بھی سیاہ رنگ کے پہن رکھے تھے۔اس کے عقب میں ایک اور سیاہ فام بیٹھا ہوا تھا۔جس نے کالی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔سیاہ رنگ کی جیکٹ اور سر پر اونی ٹوپی وہ بھی کالے رنگ میں۔قد چھ فٹ ہوگا اور جثہ ایسا کہ ہمارے گوجرانوالا کے پہلوان بھی اسکے سامنے مات تھے۔کنپٹیوں پر بال مگر سفید تھے جو اس کی عمر کا پتہ دیتے تھے۔اسکے بیٹھنے اور بات کرنے کے انداز سے ہچکچاہٹ چھلک رہی تھی۔صاف پتہ چل رہا تھا کہ اسے اس پارٹی میں مدعو نہیں کیا گیا اور وہ سیاہ فام خاتون کے ہمراہ آیا ہوا ہے۔ہم نے کافی غور وخوض کیا۔کہ ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہوسکتا ہے۔دونوں کی عمر میں سالوں کا نہیں، دہائیوں کا فرق نظر آرہا تھا۔تو کیا سیاہ فام خاتون اپنے ساتھ اپنے بڑے بھائی یا شائد باپ کو لے آئی ہے۔۔۔ ارے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بھائی یا باپ ساتھ ہو۔یہ انگلینڈ ہے یا نارووال جہاں خواتین اپنے

UrduDost Library UrduDost.com

ساتھ باپ، بھائی لئے پھرتی ہیں۔۔۔تو پھر یہ اس کا بوائے فرینڈ یا خاوند بھی ہوسکتا ہے۔لیکن کیا یہ اندھی ہے کہ اپنے باپ کی عمر کے شخص کو بوائے فرینڈ یا خاوند بنا بیٹھی ہے۔۔۔ہم نے مزید اپنے دماغ کو ٹٹولا۔۔۔ہو بھی سکتا ہے، بے جوڑ رشتے دنیا کے کس معاشرے میں نہیں ہوتے۔ابھی ہم اسی اُدھیڑ بُن میں تھے کہ سیاہ فام خاتون نے اپنا تعارف کروانا شروع کر دیا۔۔۔میں جمیکا سے ہوں اور لندن میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔میں آپ سب لوگوں سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔۔اور ہاں، میرے پیچھے میری ممی بیٹھی ہوئی ہیں۔وہ آجکل جمیکا سے میرے پاس گھومنے آئی ہوئی ہیں۔۔۔لاحول ولا قوہ۔۔کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ہم باپ، بھائی، خاوند، بوائے فرینڈ پر غور کر رہے ہیں اور وہ موصوف نہیں موصوفہ نکلی ہیں۔۔۔ممی پر اتنا سر کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ہم نے اُس دن مزید اندازے لگانے پر پابندی عائد کر لی۔۔۔خوش گپیوں کے ساتھ کھانے کا دور بھی چلتا رہا۔گھنٹہ بھر بعد فلپ نے اعلان کیا کہ اب ہم لوگ یہاں سے سیدھا دریائے کیم پر پنٹنگ یعنی کشتی رانی کے لئے چلیں گے۔سب لوگ اٹھ کر چل دیے۔راستے میں راشیل نے اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنے کے لئے رخصت لی اور سب لوگوں کو فلپ کے حوالے کر دیا۔فلپ ہمیں مختلف گلیاں دکھاتا لے جارہا تھا۔اسے یہاں کی گلیوں، محلوں، کالجوں، اداروں حتیٰ کہ ریستورانوں اور دکانوں کی تاریخ ایسے ازبر تھی جیسے وہ پچھلے ہزار برس سے یہیں رہ رہا ہو۔ یہ کافی شاپ ۱۷۲۶ء میں قائم ہوئی، ۱۸۳۳ء میں از سرِ نو تعمیر ہوئی، ۱۸۹۹ء میں اس کے داہنے دروازے کی چٹخنی خراب ہوگئی جس کے لئے سکاٹ لینڈ سے مستری بلوایا گیا جس نے ۱۹۰۱ء کے وسط میں فیصلہ کیا کہ اسکا پورا دروازہ ہی تبدیل کیا جانا چاہیے۔لیکن لوگوں نے تاریخ کو مسخ ہونے سے بچانے کے لئے دروازے کے باہر دھرنا دے دیا۔ناچار مستری نے اسی چٹخنی کو ٹانکہ لگایا۔لیکن چٹخنی تیرہ سال بعد پھر خراب ہوگئی اور اس دن سے آج تک دروازے کو بند کرنے کے لئے رات کے وقت اس کے پیچھے اینٹیں رکھی جاتی ہیں جنہیں کتے باآسانی دھکیل کر دکان کے اندر داخل ہوجاتے ہیں اور ساری رات باسی کافی نوش کرتے رہتے ہیں۔

کیمبرج کی پُر پیچ گلیوں کے تاریخی خم سلجھاتے ہوئے ہم پنٹ ہاؤس پہنچے۔ یہاں سے

UrduDost Library UrduDost.com

لوگ کرائے پر کشتیاں لیتے ہیں اور ملاح کے ساتھ یا اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے ملاح کے بغیر دریا میں کشتی ڈال دیتے ہیں۔فلپ نے دوپنٹ یعنی کشتیاں کرائے پر لے لیں۔ ہمارے گروپ کو دوحصوں میں بانٹا گیا۔ ہماری پوری کوشش کے باوجود صوفیہ اور ہم ایک کشتی میں سوار نہ ہوسکے۔۔۔لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔دونوں کشتیاں ساتھ ساتھ ہی جائیں گی۔ ہماری کشتی میں کملیشند ے،جینیٹ اورشومئی قسمت کالی ماں بیٹیاں بھی سوار ہوگئیں۔اب ہم نے ساری توجہ دوسری کشتیوں اور دریا کے کنارے پر موجود نظاروں پر مرکوز کردی۔فلپ کشتی کے پچھلے حصے پر کھڑا ہوکر لاٹھی یا صحیح لفظوں میں 'ڈانگ' کی مدد سے پانی کو پچھلی طرف دھکیلنے لگا۔کشتی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی جاتی۔ یہ دلچسپ تجربہ تھا۔ساتھ ہی ساتھ فلپ اپنی معلومات کی پٹاری کھول کر ہمیں انچ ،انچ کی تاریخ بتاتا جاتا۔کشتی گاہے کسی دوسری کشتی سے ٹکراتی تو ایک بے ضرر سا دھچکا لگتا۔ٹکرانے والی دونوں کشتیوں کے لوگ ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھتے،ایک آدھ جملہ کستے اور آگے بڑھ جاتے۔کوئی ایک آدھ مِیل 'ڈانگ بازی' کرنے کے بعد فلپ بے حال ہوگیا۔اب ہماری غیرت کو جوش آیا۔ چونکہ کشتی میں فلپ اور ہمارے علاوہ باقی سب خواتین سوار تھیں۔ہم نے فلپ کو دم لینے کے لئے کہا اور خود اسکی جگہ پر کشتی چلانے لگے۔ہمیں فوراً ہی احساس ہوگیا کہ فلپ نے بہت زیادہ فاصلہ طے کیا ہے۔بمشکل سو میٹر کشتی کو دھکیلا ہوگا کہ ہمارا سانس پھولنے لگا۔اور کشتی کی رفتار جو پہلے ہی سست تھی اب سست تر ہوگئی۔اب دونوں کالیوں نے چلانا شروع کیا کہ ہمیں مزا نہیں آرہا ہے۔آپ تیز کشتی چلائیے۔ ہمارا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ مزید زور آزمائی کی جائے۔لیکن ساتھ والی کشتی میں بیٹھی ہوئی صوفیہ ہمیں بغور دیکھ رہی اور ساتھ ہی ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔اس صورتِ حال میں ہم نے کشتی کو تیز رفتاری سے چلانے کا ہنگامی فیصلہ کیا۔پوری طاقت کے ساتھ دریا میں دو چار چپو چلائے ہوں گے کہ احساس ہوا کہ سیدھا چپو چلانے کی بجائے اگر ہم اپنے جسم کو ہلکا سا خم دے کر چپو کو ذرا ترچھے رخ پر چلائیں تو ہم زیادہ زور لگا سکیں گے جس کے نتیجے میں کشتی یقیناً تیز رفتاری سے صوفیہ کے قریب سے گزر جائے گی اور ہم سرخرو ہو جائیں گے۔بالآخر ہم نے تکنیک دریافت کر ہی لی۔۔۔کشتی تیز چلانے کی۔اب ہم نے

UrduDost Library UrduDost.com

اپنے جسم کو ٹیڑھا کرنے کے بعد چپو کو تر چھے رخ پر دریا میں ڈال کر اپنا پورا زور لگا دیا۔ اچانک ہمارا توازن بگڑا، پاؤں ہوا میں بلند ہوئے اور ہم لڑھکتے ہوئے کشتی سے باہر اور دریا کے اندر جا پہنچے۔ پانی میں گرتے ہی ہمیں صرف دو عدد غوطے آئے۔ ساتھ ہی ہمارے کشتی سوار ساتھی جو ایک لمحہ پہلے دوسروں پر آوازے کس رہے تھے، خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگے۔ چونکہ دریا کی گہرائی اور پانی کی رفتار کم تھی۔ ہم نے پانی کے اندر غوطے کھاتے ہوئے کشتی کو تھامنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ فلپ عقلمند آدمی تھا۔ اس نے فوراً ساتھ ہی موجود پل کے کالم کے ساتھ کشتی کو ٹھہرا لیا۔ اور ہمیں ہدایات دینے لگا۔ ہم نے بمشکل کشتی کو پکڑا۔ اور پانی سے سر باہر نکال کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ کالیوں کا رنگ پیلا ہو چکا تھا۔ کملیشندے اور جینیٹ کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر فلپ سب کو پُر سکون رہنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس نے خود پُل کے کالم کو مضبوطی سے تھام کر کشتی کو ساکن کر دیا تھا۔ اب ہم پورا زور لگا کر کشتی کے اندر آنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ کملیشندے اور جینیٹ دونوں نے ہمارا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر پوری طاقت سے ہمیں اوپر کی طرف کھینچا۔ ہم نے بھرپور زور لگایا اور بڑی مشکل سے کشتی میں واپس پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اگر فلپ، کملیشندے اور جینیٹ ناکام ہو جاتے تو آج شائد آپ یہ تحریر نہ پڑھ رہے ہوتے۔ آپ کو اُن تینوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

کشتی میں پہنچ کر ہم نے اپنا حلیہ دیکھا۔ ہم نے سویٹر پہن رکھا تھا۔ بوڑھی کالی اماں جی نے فوراً سویٹر اتارنے کو کہا اور ہمیں اپنی شال اوڑھا دی۔ ہم نے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ خیال آیا۔ ہماری جیب میں تو موبائل فون بھی تھا۔ جلدی جلدی اسے باہر نکالا۔ دیکھا تو فون کام کر رہا تھا۔ ہمیں کچھ تسلی ہوئی۔ ہم نے مزید اطمینان کے لئے ایک فون نمبر ملایا۔ ساتھ ہی فون آف ہو گیا۔ بڑی کوشش کی لیکن فون دوبارہ آن نہ ہو سکا۔ بوٹ اتارے۔ جیبوں میں سے قیمتی کاغذات نکالے۔ فلپ بیچارا دوبارہ کشتی چلانے لگا۔ اب ہم دبک کر بیٹھ گئے اور دوسروں کو دیکھ کر ٹھٹھے کرنے کی بجائے استغفار کرنے لگے۔ فلپ کو نڈھال دیکھ کر جینیٹ نے چپو سنبھال لئے اور آہستہ آہستہ کشتی چلاتے ہوئے ایک قریبی مقام پر لے آئی جہاں ہم اتر کر زمیں

UrduDost Library UrduDost.com

پر آ گئے۔ اب سب ساتھیوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ اسی ہنسی اور سراسیمگی کے عالم میں فلپ نے سب کو ڈرنک لینے کے لیے قریبی دکان پر جانے کا مشورہ دیا۔ سب لوگ ڈرنک شاپ سے رنگارنگ ڈرنکس پینے لگے اور ہم نے ان سے رخصت لے کر گھر جانے میں ہی عافیت جانی۔

کیمبرج میں ادب، موسیقی، فنون، فلم اور تھیٹر کی بہت اہمیت ہے۔ روایتی انداز کے تھیٹر میں 'آرٹس تھیٹر' سب سے معروف سمجھا جاتا ہے۔ یہ وسطی کیمبرج میں واقع ہے اور اس میں ساڑھے چھ سو سے زائد نشستوں کی گنجائش ہے۔ اس میں ڈرامہ، ڈانس، اوپیرا اور 'پینٹو مائم' پیش کئے جاتے ہیں۔ پینٹو مائم یا پینٹو دراصل ایک میوزیکل کامیڈی شو ہوتا ہے۔ جو عام طور پر کرسمس یا سال نو کے آغاز پر پیش کیا جاتا ہے۔ آرٹس تھیٹر میں کرسمس کے موقع پر پیش کیا جانا والا پینٹو کیمبرج کی ایک اہم روایت بن چکا ہے۔ اسکے علاوہ آرٹس تھیٹر کو کیمبرج یونیورسٹی کی ڈرامہ سوسائٹی کا گھر بھی تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس سوسائٹی کے زیادہ تر پروگرام اسی تھیٹر میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں میں سب سے دلچسپ پروگرام 'کیمبرج یونانی کھیل' ہے۔ یہ کھیل قدیم یونانی زبان میں ہوتا ہے اور ۱۸۸۲ء سے تواتر کے ساتھ ہر تیسرے سال پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں کیمبرج یونیورسٹی کے موجودہ اور سابقہ طلباء حصہ لیتے ہیں۔ انگلینڈ میں سفری تھیٹر کا رواج بھی ہے۔۔۔ جیسے ہمارے ہاں سرکس ہوتے ہیں اور وہ پورے ملک میں گھوم پھر کر میلوں، ٹھیلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسی نوع کی ایک کمپنی کیمبرج تھیٹر کمپنی ہے۔ برطانوی سفری تھیٹر کمپنیوں میں یہ کمپنی نہایت ممتاز سمجھی جاتی ہے۔ کیمبرج میں اس کمپنی کے شوز ایک عرصہ تک آرٹس تھیٹر میں ہی پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اہل کیمبرج اس کمپنی کے ساتھ کافی لگاؤ رکھتے ہیں۔ کیمبرج کے سب سے بڑے تھیٹر کا نام 'کیمبرج کارن ایکسچینج'۔ اس میں بارہ سو سے زائد نشستیں دستیاب ہیں۔ یہ عمارت ۱۸۷۵ء میں بنائی گئی تھی اور بنیادی طور پر مکئی کی تجارت کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ اس کی تعمیر میں مقامی طور پر بنائی گئی دس لاکھ اینٹیں استعمال ہوئی تھیں۔ اس عمارت کے افتتاح کے موقع پر قومی ترانہ بجانے میں ایک غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں پر موجود ہجوم نے طیش میں آ کر مقامی میئر کے گھر پر دھاوا بول دیا تھا۔ اس بلوے کی عدالتی تحقیقات کی پوری دنیا کے

UrduDost Library UrduDost.com

پریس میں رپورٹنگ ہوئی تھی۔جس بنا پر کیمبرج آنے والے سیاح اور دیگر لوگ بڑی تعداد میں اس عمارت کو دیکھنے آیا کرتے تھے اور نتیجتاً مکئی کے کاروبار میں خلل واقع ہوتا تھا۔۱۹۶۵ء میں اس عمارت میں مکئی کا بیوپار بند کر دیا گیا تھا اور ۱۹۷۰ء میں اسے موسیقی کے شوز کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔۱۹۸۶ء میں اس کی تزئین و آرائش کے بعد اسے ایک مکمل تھیٹر کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔دورِ حاضر میں یہ عمارت برطانیہ کے معروف تھیٹروں میں شمار کی جاتی ہے جس میں بہترین شوز پیش کئے جاتے ہیں۔اس کو گاہے کیمبرج یونیورسٹی کے طلبا کے امتحانی مرکز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔۲۰۰۴ء میں کیمبرج میں سوادوسونشستوں کا ایک نیا تھیٹر بھی تعمیر کیا گیا ہے۔جس کا نام جے۔ٹو۔ہے۔اسے 'دی شیڈ' بھی کہا جاتا ہے۔اسمیں موسیقی، رقص، ڈرامہ اور بسا اوقات نائٹ کلب بھی منعقد کیا جاتا ہے۔کیمبرج یونیورسٹی کا اپنا بھی ایک تھیٹر ہے۔جس کا نام اے۔ڈی۔سی۔تھیٹر ہے۔یہ اصل میں یونیورسٹی کے ڈرامیٹک کلب کے پاس ہے۔اسے تھیٹر کو یونیورسٹی میں باقاعدہ ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت حاصل ہے۔اس تھیٹر کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ یونیورسٹی کا سب سے چھوٹا ڈیپارٹمنٹ ہے۔جس میں موجود سٹاف کی تعداد صرف چار افراد ہے۔جن دنوں میں یونیورسٹی میں باقاعدہ کلاسز ہو رہی ہوتی ہیں،اس وقت اس تھیٹر میں روزانہ دو شو پیش کیے جاتے ہیں۔جبکہ کلاسز کے بغیر مہینوں میں ہفتے میں صرف ایک شو ہوتا ہے۔گرمیوں، سردیوں کی تعطیلات اور کرسمس کے دنوں میں یہ تھیٹر مرمت وغیرہ کے بہانے بند رہتا ہے۔۔۔کیا الٹا معمول ہے اس تھیٹر کا بھی۔عین دورانِ پڑھائی روزانہ دو شو،اور فراغت کے اوقات میں کچھ بھی نہیں۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس تھیٹر بنانے کا واحد مقصد پڑھائی جیسے غیر ضروری اور غیر ترقیاتی کاموں کے آگے رکاوٹ کھڑی کرنا ہی ہے۔۔۔یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کے پاس اپنے اپنے تھیٹر موجود ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً مختلف پروگراموں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔کیمبرج یونیورسٹی کے علاوہ انجلیا رسکن یونیورسٹی کے پاس بھی اپنا ایک تھیٹر ہے جس کا نام 'مم فورڈ تھیٹر' ہے۔اس میں طلباء اور پیشہ ورانہ مہارت کے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔کیمبرج میں موسیقی کے کئی مقامی بینڈ بھی موجود ہیں۔ان کے علاوہ سولو گلوکار بھی اپنی مہارت کا

UrduDost Library UrduDost.com

مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

کیمبرج میں میلوں ٹھیلوں کا بھی رواج ہے۔ 'مڈسمر کامن میلہ' موسم گرما کے وسط میں 'مڈسمر کامن' نامی میدان میں منعقد کیا جاتا ہے۔ گئے وقتوں میں یہ انگلینڈ کا سب سے بڑا میلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب اسکی حیثیت ایک فن فیئر جیسی ہے۔ 'مڈسمر کامن' وسطی کیمبرج میں ایک میدان ہے جس میں بہترین گھاس اگی ہوئی ہے۔ اس میدان کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں، یعنی عین وسطی کیمبرج میں دن کے وقت گائیں آزادانہ طور پر چرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے کسی شہر کے وسط میں چرتے ہوئے جانوروں کا نظر آنا ایک بالکل انوکھا واقعہ ہے۔ ہمارے ملک میں چند سال پہلے تک بھینس، گائے اور دیگر جانور شہروں کے اندر باافراط پائے جاتے تھے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ یہاں بھی یہ معدوم ہوتا جارہا ہے۔ مڈسمر کامن میں ہی ایک دوسرے میلے کی روایت ۱۹۷۰ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس میلے کا نام 'سٹرابیری میلہ' ہے۔ اس میلے میں مختلف اشیاء کے سٹال لگائے جاتے ہیں۔ موسیقی کے لئے کئی اسٹیج بنائے جاتے ہیں جن پر زیادہ تر نوجوان اور شوقیہ گلوکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس میلے میں فلموں کے شو بھی دکھائے جاتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس میلے کے اہتمام کے لئے قریباً ایک ہزار افراد رضاکارانہ طور پر خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس میلے میں داخل ہونے کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ مقامی پولیس کو میلے کو کامیاب بنانے کے لئے کافی خجالت کرنا پڑتی ہے۔ جس بنا پر وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس میلے کو بند کروانے کی جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ لیکن یہاں پولیس کی سنتا کون ہے۔۔۔ کیمبرج پولیس کے لئے بہترین مشورہ یہی ہے کہ وہ ہمارے ہاں تشریف لے آئے۔ پھر جس میلے کو چاہے بند کرے اور جہاں چاہے نئے میلے کی داغ بیل ڈال لے۔۔۔ کیمبرج میں 'جیسس گرین' نام کا ایک پارک ہے جس میں 'بیئر میلہ' منعقد کیا جاتا ہے۔ درحقیقت بیئر میلہ سال میں دومرتبہ منعقد ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ مئی کے آخر میں جسے موسمِ گرما کا بیئر میلہ اور دوسری دفعہ وسط جنوری میں جسے موسمِ سرما کا بیئر میلہ کہا جاتا ہے۔ اس میلے کی سب سے اہم کارستانی یہ ہے کہ اسمیں جدھر دیکھیں بیئر ہی بیئر نظر آتی ہے۔ گذشتہ برس میلے کے شرکاء نے اس میلے میں بیئر کے

UrduDost Library UrduDost.com

ایک لاکھ ڈبے چڑھائے تھے۔کئی سال پہلے تک یہ سال میں صرف ایک دفعہ منعقد ہوتا تھا لیکن بیئر کی برکت دیکھتے ہوئے اب سال میں دو دفعہ اس میلے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔وہ دن دور نہیں جب یہ میلہ ہر مہینے نہیں، ہر ہفتے حتیٰ کہ ہر روز، بلکہ شب و روز جاری و ساری رہے گا۔۔۔کیمبرج سٹی کونسل کی جانب سے چیری ہنٹن کے علاقے میں ایک لوک میلے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ انگلینڈ میں ہونے والے لوک میلوں میں سب سے بڑا میلہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں میلوں کے حوالے سے ایک اور توانا روایت بھی موجود ہے۔جس کا نام کیمبرج شیکسپیئر فیسٹیول ہے۔اس میلے میں یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کے احاطوں میں شیکسپیئر کے کھیل پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ میلہ آٹھ ہفتوں تک جاری رہتا ہے۔اس کے علاوہ کیمبرج فلم فیسٹیول کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جو غالباً انگلینڈ میں منعقد کیا جانے والا سب سے بڑا فلم فیسٹیول ہے۔

کیمبرج میں تقریباً ہر مذہب کے معتقدین کے لئے عبادت گاہیں موجود ہیں۔ عیسائی مذہب کے گرجا گھر یا چرچ اپنے ڈیزائن کے اعتبار سے بہت پرکشش ہیں۔سٹی سنٹر سے تھوڑے فاصلے پر ہلز روڈ اور لینز فیلڈ روڈ کے سنگھم پر 'ہماری خاتون اور انگلش شہداء چرچ' کے نام سے کیتھولک عیسائی مذہب کا ایک اہم گرجا گھر ہے۔ یہ چرچ اپنی عمارت کے اعتبار سے انگلینڈ میں بڑے گرجا گھروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ روایتی گوتھک طرزِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔اس میں مرکزی ہال کے علاوہ ایک بڑا ٹاور یا مینار بھی ہے۔ اس چرچ کا سنگِ بنیاد ۱۸۸۷ء میں رکھا گیا تھا۔اور اسکی تعمیر پر خطیر رقم خرچ ہوئی تھی۔اسکو انگلینڈ اور ویلز کے چالیس شہداء کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ یہ چالیس شہداء وہ لوگ تھے جو سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں غداری اور دیگر الزامات میں پھانسی پر چڑھا دیے گئے تھے۔ بعد ازاں، کیتھولک فرقے نے انہیں شہید قرار دیا تھا۔اس چرچ میں بی بی مریم کا ایک مجسمہ بھی نصب ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مجسمہ سولہویں یا سترھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔دوسری جنگِ عظیم میں اس چرچ پر ایک چھوٹے سائز کا بم گرایا گیا تھا۔جس سے اس کے کچھ حصوں کو نقصان پہنچا تھا۔اور پھر اسی زمانے میں اس کی مرمت کے لئے پینتالیس ہزار پاؤنڈ خرچ کئے گئے تھے۔اس چرچ کے علاوہ

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج میں روسی آرتھوڈوکس، یونانی آتھوڈوکس اور میتھوڈسٹ چرچ بھی موجود ہیں۔ یہاں پر یہودیوں کی دو عبادت گاہیں یا 'سِنا گاگ' بھی موجود ہیں۔ان کا انتظام وانصرام کیمبرج یونیورسٹی کے یہودی طلباء کی انجمن کے ذمے ہے۔ بدھ مذہب کے پجاریوں نے بھی ۱۹۹۸ء میں نیو مارکیٹ روڈ پر اپنا ایک عبادت خانہ بنایا ہے۔ ہندو مذہب کے پیروکاروں نے ملز روڈ کے قریب بھرت بھون انڈین کلچرل سنٹر کے نام سے ایک عبادت گاہ تعمیر کر لی ہے۔جس کے لئے ۲۰۰۵ء میں چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی گئی تھی۔کیمبرج میں ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے۔اس وقت ان مسلمانوں نے دو مساجد اور اسلامک کلچرل سنٹر بنا رکھے ہیں۔ پہلا ملز روڈ کے قریب ہے جس کا نام ابوبکر جامعہ اسلامک سنٹر ہے جبکہ دوسرے کا نام عمر فاروق اسلامک اینڈ کلچرل سینٹر ہے جو کنگز ہیجز روڈ کے قریب واقع ہے۔ہم جب کیمبرج پہنچے تو اپنی رہائش گاہ پر مغرب کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ایک دن مسجد کے ایک دوست نے تصحیح کی کہ کیمبرج میں قبلہ رخ مغرب نہیں بلکہ جنوب مشرق ہے۔ پہلے تو جنوب مشرق سمت پر ہمیں حیرانی ہوئی لیکن بعدازاں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ دنیا کے ہر خطے میں قبلہ رخ مغرب نہیں ہوتا، بلکہ یہ دنیا کے مختلف خطوں کے لئے مختلف ہوتا ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج یونیورسٹی

ربِ ذوالجلال نے تخلیقِ آدمؑ کے بعد فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ سجدہ، دراصل ایک علامت ہے کہ ساجد، مسجود کی برتری تسلیم کرتا ہے۔ فرشتوں نے جب آدمؑ کے برتر اور اپنے کمتر ہونے کا سبب دریافت کیا، تو رب العالمین نے یہ حکمت ارشاد فرمائی کہ آدمؑ کو ہم نے علم عطا کیا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ پوری انسانی تاریخ اور تہذیب میں علم ہی ایسی چیز ہے جس کی بنا پر افراد اور اقوام ممتاز ہوئے ہیں۔ ہمارے دین میں تو علم کی اہمیت دیگر تمام ادیان سے 'رب زدنی علما' جیسی بلند پایہ دعا کی وجہ سے بالکل واضع ہے۔ چیزوں کو جاننے کا تجسس انسان کو پیدائش سے ہی ودیعت ہوا ہے۔ اسی تجسس کی تسکین کے لئے انسان نے بے شمار کوشش کی ہے۔ قدیم سے قدیم انسانی تاریخ کو کنگال لیں۔ آپ کو علم، صاحبانِ علم اور طالبانِ علم کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور دکھائی دیں گے۔ یونانیوں اور دیگر قدیم تواریخ کے مطالعے سے آپ کو علم کی تحصیل کی بے شمار شہادتیں مل سکتی ہیں۔ افراد علم حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے ہیں۔ آجکل سفر کرنا ایک خوشگوار تجربہ ہے لیکن محض ایک صدی پہلے تک سفر ایک آزمائش اور ابتلاء کا نام ہوتا تھا۔ پھر بھی حصولِ علم کے لئے سفر اختیار کرنے کا انسانی تاریخ میں رواج رہا ہے۔ زمانہ قدیم میں جب کوئی فرد ایک خاص سطح تک علم حاصل کر لیتا تو پھر اسے یہ اعزاز اور اجازت مل جاتی کہ وہ دوسرے لوگوں کو علم سے سیراب کر سکے۔ اسطرح علم کی ترسیل اور تحصیل جاری رہتی۔ پھر

UrduDost Library UrduDost.com

ایسے ہوتا کہ طلبا کا ایک باقاعدہ حلقہ کسی استاد سے اکتساب کرتا۔ یوں سلسلہ تعلیم ایک استاد اور ایک شاگرد سے آگے بڑھا۔ مزید یہ کہ کسی ایک جگہ پر ایک سے زائد اساتذہ جمع ہو جاتے۔ جو طلبا کو پڑھاتے اور باہمی گفتگو سے اپنے علم میں بھی اضافہ کرتے۔ اس طرح سے تحصیلِ علم محض دو افراد کے درمیان تعلق سے بلند ہو گیا اور ایک ادارے کی شکل اختیار کر گیا۔ قدیم یونانی اہلِ علم اور بالخصوص اہلِ فلسفہ کے علمی حلقے بہت معروف رہے ہیں۔ ہمارے دین کے دورِ آغاز سے ہی یعنی عین دورِ نبوت میں علمی حلقے وجود میں لائے گئے۔ یہ روایت محض چند دہائیوں میں اس قدر توانا ہوگئی کہ صاحبانِ علم کو معاشرے کے ماتھے کا جھومر اور طالبانِ علم کو قابلِ تکریم گردانا جانے لگا۔ ہماری تاریخ میں بے شمار حلقہ ہائے درس و تدریس معروف ہوئے۔ علمی اختراعات ہوئیں، تحقیق کا ڈول ڈالا گیا۔ علم کے انبار لگا دیے گئے اور بہت سارے مواقع ایسے بھی آئے کہ معاملاتِ زندگی میں اہل علم کی آراء کو ہی فوقیت کا مرتبہ حاصل ہوا۔۔ لیکن شائد ہمارے ہاں ایک لغزش ہوگئی۔ وہ یہ کہ علم کی تخلیق، تحصیل اور ترسیل کو افراد کے حوالے سے ہی دیکھا گیا۔ جونہی کوئی صاحبِ علم یا اس کے حلقہِ علم کے لوگ نقل مکانی کر گئے، اس حلقے کی علمی سرگرمیاں اختتام پذیر ہوگئیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تخلیق و تحصیلِ علم کا معاملہ افراد کے وجود سے منسلک نہ کیا جاتا۔ کوئی آتا۔ کوئی جاتا۔ لیکن سلسلۂ علم جاری رہتا۔ بڑے سے بڑا عالم بھی اس جہاں سے رخصت ہوتا۔ ایسا وہ جو بے بدل ہوتا، پھر بھی اس سے کمتر علم و فضل کے حاملین ہی اس کی روایت جاری رکھتے۔ دوبارہ پھر کسی زمانے میں، کوئی اور ایسا فرد ودیعت ہو جاتا جو جانے والے کا جانشین ہوتا۔ اگر یہ تسلسل قائم کیا جاتا اور اس کو دوام دینے کی جدوجہد کی جاتی تو ہم آج بھی قرونِ اولی کی طرح مکرم ہوتے۔ لیکن افراد کی غلطیوں کا خمیازہ اقوام بھگتا کرتی ہیں اور زمانوں تک بھگتا کرتی ہیں۔ ہم آج اسی لغزش کا کفارہ ادا کر رہے ہیں اور نہ جانے کب تک اور کتنی نسلیں اسی کفارے کی نذر ہوں گی۔ آپ پہلی صدی ہجری سے تلاش شروع کیجئے اور چھ، سات صدیوں کا سفر طے کر لیجیے۔ آپ کو قدم قدم پر ایسے عجوبہِ روزگار لوگ ملیں گے جنہیں علم کی ہر ہر شاخ میں مہارت حاصل تھی۔ اور ایسے بھی جن کے دماغوں سے نئے علوم کے چشمے پھوٹے اور ایک دنیا سیراب کر گئے۔ لیکن آج آپ کو ان

UrduDost Library UrduDost.com

صدیوں میں قائم کی ہوئی کوئی درسگاہ کہیں نہیں ملے گی۔ مدرسین کے ساتھ ان کے درس بھی قصہ ماضی ہو گئے۔۔۔صرف اس لئے کہ مدرسین اور معلمین اپنی ذات میں تو انجمن تھے مگر اپنے حلقے کی بقا کی تدبیر نہ کر سکے۔

مسلمانوں کی تاریخ کی قدیم ترین درسگاہ جو آج بھی موجود ہے۔ اس کا نام جامعۃ القرووین یا یونیورسٹی آف قرووین ہے۔ یہ افریقی اسلامی ملک مراکو کے تیسرے بڑے شہر 'فاس' میں واقع ہے۔ خوش قسمتی سے یہ یونیورسٹی اس وقت دنیا میں موجود تمام درسگاہوں میں سب سے پرانی ہے۔ فاس شہر کو دریائے فیض کے کنارے ادریسی سلطنت کے بانی ادریس بن عبداللہ نے آباد کیا تھا۔ ادریس بن عبداللہ جناب علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ اور جناب امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا دورِ حکومت ۷۸۸ء سے ۷۹۱ء ہے۔ جامعۃ القرووین کا قیام ۸۵۹ء میں عمل میں لایا گیا۔ یہ مدرسہ قرونِ وسطیٰ میں اسلامی اور یورپی دنیا کے علمی اور ثقافتی رابطے کا ذریعہ رہا ہے۔ ادریس بن عبداللہ کی اولاد میں مشہور جغرافیہ دان اور نقشے بنانے کا ماہر ابو عبداللہ محمد الادریسی پیدا ہوا۔ الادریسی یورپ کے بہت سارے ممالک میں بطور سیاح قیام پذیر رہا۔ اس نے زمانہ جدید سے پہلے دنیا کا ایک نقشہ ترتیب دیا تھا۔ جو اُسوقت سب سے زیادہ درست تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے 'نزہتہ المشتاق' کے نام سے نقشوں اور سیاحتی معلومات پر ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ بعد میں آنے والے سیاح ابن بطوطہ، ابن خلدون، کرسٹوفر کولمبس، واسکو ڈے گاما وغیرہ الادریسی کے کام سے بہت متاثر تھے۔ سیاحت اور نقشے بنانے کے علاوہ، وہ قدیم مصری تاریخ و تہذیب کا بھی ماہر سمجھا جاتا تھا۔ الادریسی کے نقشوں کی مدد سے ہی یورپی حکمران اور فوجیں دور دراز کے ممالک میں جنگی مہمات کے قابل ہوئیں تھیں۔ وہ اپنی عمر کے ایک حصے میں تحصیل علم کی غرض سے مدرستہ القرووین میں مقیم رہا۔ اسکے علاوہ ابن رشد، ابن خلدون اور ابن عربی جیسے علماء بھی اس مدرسے سے فیضیاب ہوئے۔ مدرستہ القرووین دراصل ایک مسجد میں قائم کیا گیا تھا جسے فاطمہ الفہری بنت محمد الفہری نے بنایا تھا۔ فاطمہ اور اسکی بہن مریم دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ فاطمہ نے اپنی موروثی دولت سے ایک مسجد تعمیر

UrduDost Library UrduDost.com

کروائی تھی۔ جس میں عبادات کے علاوہ تعلیم وتدریس کے کام کی ابتداء کی گئی۔ آغاز میں تعلیمی سرگرمیاں مذہب اور سیاست تک محدود تھیں لیکن جلد ہی ان کا دائرہ طبعی سائنس تک وسیع ہوگیا۔ خوش قسمتی سے مدرسۃ القرووین کو بعد کے زمانوں میں سلاطین کی سرپرستی حاصل ہوتی رہی۔ جس سے اس کے ارتقاء کا عمل جاری رہا۔ اس مدرسے کو ۱۹۴۷ء میں باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا گیا۔ آج بھی اس مدرسے میں موطا امام مالک اور سیرت ابن ہشام کے قدیم ترین اصلی نسخے دستیاب ہیں۔ عہدِ حاضر میں یونیورسٹی آف قرووین میں قدیم وجدید علوم کے شعبہ ہائے تعلیم و تحقیق کام کررہے ہیں۔ یہ یونیورسٹی پچھلی بارہ صدیوں سے تسلسل کے ساتھ علمی سرگرمیوں کا اہتمام کرتی آرہی ہے جو بلاشبہ لائقِ رشک اور قابل تحسین ہے۔

جامعۃ القرووین کے قیام کے دوسو سال بعد، یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی، جس کا نام یونیورسٹی آف بولونا ہے، کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ یونیورسٹی اٹلی میں ۱۰۸۸ء میں قائم کی گئی تھی۔ یونیورسٹی کا لفظ بھی اسی یونیورسٹی کے آغاز کے وقت وضع کیا گیا تھا۔ اس یونیورسٹی سے قبل اٹلی میں ہی ایک اور یونیورسٹی جس کا نام سیلرنو یونیورسٹی ہے، نویں صدی عیسوی میں قائم کی گئی تھی۔ لیکن اس یونیورسٹی کو ۱۸۱۱ء میں بند کردیا گیا تھا۔ تاہم اسے دوبارہ ۱۹۶۸ء میں کھولا گیا ہے۔ چونکہ سیلرنو یونیورسٹی قریباً ڈیڑھ صدی تک تعطل کا شکار رہی ہے۔ اس لئے کچھ مورخین کی رائے میں اسے قدیم ترین یونیورسٹی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس بنا پر اس وقت دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی کا اعزاز یونیورسٹی آف بولانا، اٹلی کو حاصل ہے۔ پیرس یونیورسٹی کا قیام ۱۰۹۰ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی سیلرنو یونیورسٹی کی طرح بدقسمتی کا شکار ہوکر ۱۷۸۹ء میں بند ہوگئی تھی۔ عہدِ حاضر کی جدید پیرس یونیورسٹی دراصل قدیم پیرس یونیورسٹی کا ہی تسلسل ہے لیکن اس کا قیام ۱۸۹۰ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۰۹۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آکسفورڈ میں ۱۰۹۶ء سے پہلے تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری تھا۔ اسی لئے آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنِ آغاز کا حتمی طور پر اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اگرچہ آکسفورڈ کے کچھ تعلیمی کالج اور حلقے مصر ہیں کہ اس کا آغاز ۸۲۵ء میں ہوا تھا۔ آکسفورڈ کے ان کالجوں کا دعویٰ ہے کہ ان

UrduDost Library UrduDost.com

کے پاس ۸۲۵ء سے تعلیمی سرگرمیوں کا ریکارڈ موجود ہے۔لیکن یہ ریکارڈ کبھی غیر جانبدار مورخین کے سامنے نہیں لایا گیا۔جس بنا پر اس دعوے کی تصدیق و تردید کرنا مشکل ہے۔اگر آکسفورڈ کا دعویٰ درست ہے تو پھر یہ یونیورسٹی آف قرووین سے بھی قدیم ہے۔۔۔گویا دنیا میں سب سے قدیم یونیورسٹی۔۔۔لیکن ابھی تک یہی طے ہے کہ آکسفورڈ ۱۰۹۶ء میں موجود ضرور تھی۔اس سے کتنا پہلے یہ وجود میں آئی۔اس بارے میں حتمی طور پر کوئی نہیں جانتا۔۱۱۳۱ء میں فرانس میں یونیورسٹی آف مونٹ پیلائر قائم کی گئی تھی۔اس کا میڈیکل سکول دنیائے طب میں قدیم ترین تصور کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اس یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم بھی ۱۱۶۱ء میں شروع کی گئی تھی۔سپین کی یونیورسٹی آف سالامانکا ۱۱۳۴ء میں قائم ہوئی اور اس کو باقاعدہ یونیورسٹی کا چارٹر ۱۲۱۸ء میں مل چکا تھا۔یورپ کی ایک اور قدیم یونیورسٹی کا نام موڈینا یونیورسٹی ہے جو موڈینا، اٹلی میں ۱۱۷۵ء میں قائم ہوئی۔۔۔ہم جس دور کی بات کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی اور یہ دور غزنوی سلطنت کا دور ہے۔غزنوی سلطنت ۹۷۵ء سے ۱۱۸۷ء تک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہی۔غزنوی سلطنت کا بانی ابو منصور سبکتگین تھا۔اس سلطنت کا سب سے معروف بادشاہ محمود غزنوی تصور کیا جاتا ہے جس نے ۹۹۷ء سے ۱۱۳۰ء تک یعنی تینتیس برس کروفر کے ساتھ حکومت کی۔اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری کا زمانہ آتا ہے۔جس نے ہندوستان میں کئی فتوحات کیں۔غوری کے بعد خاندانِ غلاماں آتا ہے۔پھر خلجی آئے، تغلق آئے، سید آئے، لودھی آئے۔یہاں تک کہ بات مغلیہ سلطنت تک آ پہنچی۔ظہیر الدین بابر نے عظیم مغلیہ سلطنت کی بنیاد ۱۵۲۶ء میں رکھی۔جو ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے زوال پر منتج ہوئی۔اس سلطنت میں اکبر جیسے صلح جو اور سیاسی چال باز بھی آئے۔جہانگیر اور شاہجہان جیسے ادب و مصوری کے دلدادہ بھی آئے۔اورنگ زیب جیسا منتظم اور دیندار بھی آیا۔ بہادر شاہ ظفر جیسا باکمال شاعر بھی آیا۔۔۔لیکن۔۔۔افسوس غزنوی سلطنت سے لے کر مغلیہ عہد کے اختتام تک۔ساڑھے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں کسی سلطان نے کوئی بڑی درسگاہ بنانے کے لئے سعی نہ کی۔ہمارے پاس آج کوئی ایسا تعلیمی ادارہ نہیں ہے جو ان ادوار کی یاد دلا سکے۔دورِ حاضر میں موجود قدیم ترین ادارے

UrduDost Library UrduDost.com

انگریزوں کی آمد کے بعد ہی بنائے گئے۔ صرف ایک ادارہ ہم نے بنایا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔۔۔ کیسے کیسے عالی دماغ اس ادارے کے توسل سے ہمیں میسر آئے۔۔ گزرے ہوئے وقت کو کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ اگر آج بھی اس تاریخی سبق سے کچھ سیکھ لیا جائے تو شائد ہمارا آنے والا کل ہی ہمارے حال سے بہتر ہو جائے۔

کیمبرج یونیورسٹی، آکسفورڈ یونیورسٹی کے بعد انگلینڈ کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے۔ یہ دنیا کی ساتویں قدیم ترین یونیورسٹی بھی تصور کی جاتی ہی۔ بارھویں صدی عیسوی میں کیمبرج ٹاؤن میں عیسائی مذہب کی تعلیم دینے کے لئے کئی مدرسے قائم تھے۔ اس کے علاوہ یہاں پر کم از کم دو ہسپتال بھی پائے جاتے تھے۔ ایک میں جذام کے مریضوں اور دوسرے میں ناداروں کا علاج کیا جاتا تھا۔ کیمبرج میں تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے دوسرے علاقوں سے بھی لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ مذہبی مدرسوں کی وجہ سے یہاں عیسائی علماء موجود تھے اور وقتاً فوقتاً دوسرے علاقوں سے بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۲۰۹ء میں آکسفورڈ میں چند طلباء، سکالرز اور مقامی لوگوں کے درمیان تنازعہ ہو گیا۔ اور مقامی لوگوں نے دو سکالرز کو پھانسی دے دی۔ اس افسوسناک واقعے سے خائف ہو کر طلباء اور سکالرز آکسفورڈ سے فرار ہو کر کیمبرج میں پناہ گزین ہو گئے۔ اور یہاں آکر انہوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ ۱۲۲۶ء میں سکالرز اور طلباء کی تعداد اتنی ہو چکی تھی کہ ایک باقاعدہ ادارہ تشکیل دیا جاسکتا تھا۔ اس ادارے کے سربراہ کو چانسلر کہا جانے لگا۔ ابتداء میں سکالرز اور طلباء کرائے کے مکانوں میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنی علیحدہ عمارات کا انتظام کر سکتے۔ یہ عمارات تعلیمی اور رہائشی کاموں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ جس مکان میں طلباء قیام پذیر ہوتے اس میں ایک ماسٹر کا تقرر کر دیا جاتا۔ اس زمانے میں طلباء اور کیمبرج شہر کے لوگوں کے درمیان ایک طرح کی کشمکش اور تناؤ کا ماحول ہوتا تھا۔ طلباء اپنی نوجوانی اور نوخیزی کے ہاتھوں مجبور تھے اور شہر میں ہلا گلا کرتے رہتے تھے۔ شہر کے لوگ انہیں ناپسند کرتے اور جب کسی طالب علم کو کرائے پر مکان دیتے تو اس کا کرایہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ وصول کرتے۔۔۔ ہمارے ہاں آج بھی ایسا ہوتا ہے۔ بڑے شہروں

میں طلباء کو کرائے پر مکان لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا مطلب ہے ہم بھی آج سے محض آٹھ سو سال بعد کیمبرج جیسی یونیورسٹیاں بنا سکیں گے۔۔۔ کیمبرج یونیورسٹی کے آغاز کے دنوں میں انگلینڈ کا بادشاہ ہنری سوئم تھا۔ وہ ایک خوش قسمت انسان تھا۔ جو محض نو برس کی عمر میں بادشاہ بن گیا تھا اور اپنی موت تک قریباً چھپن برس بادشاہت کے منصب پر فائز رہا۔ اس کے عہد میں انگلینڈ نے کافی ترقی کی۔ ویسٹ منسٹر کا علاقہ جہاں آجکل انگلینڈ کا پارلیمنٹ ہاؤس اور دیگر اہم عمارات ہیں، دراصل ہنری سوئم کا ہی آباد کیا ہوا ہے۔ ہنری سوئم نے کیمبرج یونیورسٹی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔ اور کیمبرج میں موجود مقامی لینڈ لارڈز سے سکالرز اور طلبا کے لئے زیادہ سہولتیں طلب کرنے لگا۔ اس نے کیمبرج کی قانونی معاونت بھی کی اور اسے ٹیکس سے مثنیٰ قرار دلوا دیا۔ مزید یہ کہ اسی زمانے میں ہنری کی کوششوں سے اس وقت کے پوپ نے کیمبرج سے فارغ التحصیل ہونے والے سکالرز کو پوری عیسائی دنیا میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ محض ایک صدی کے بعد کیمبرج میں سارے یورپ سے طلبا پڑھنے اور اساتذہ پڑھانے کے لئے آنے لگے۔ ابتداء میں اختیار کیا جانا والا نصاب، اٹلی اور فرانس میں اسوقت رائج نصابوں سے ملتا جلتا تھا جس سے طلباء اور سکالرز اپنے آکسفورڈ قیام کے دوران راہنمائی لیتے رہے تھے۔ اس میں پڑھائی کا آغاز آرٹس، گرامر، منطق اور نظم و نثر سے ہوتا تھا۔ بعد میں ریاضی، جیومیٹری اور فلکیات جیسے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس کورس کے خاتمے پر بیچلر اور ماسٹر ڈگریاں عطا کی جاتی تھیں۔ اس وقت پروفیسرز نہیں ہوتے تھے۔ ان کی جگہ ماسٹر پڑھاتے تھے۔ جو خود اسی نصاب کو پڑھ چکے ہوتے تھے۔ اور اس نصاب کو پڑھانے کا لائسنس رکھتے تھے۔۔۔ اگر پروفیسر اور ماسٹر میں واقعی کوئی فرق ہوتا ہے تو ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے اکثر اساتذہ کرام ماسٹر۔ گستاخی معاف پروفیسر ہی ہیں۔۔۔ پڑھنے کا طریقِ کار نصابی کتابیں وغیرہ پڑھنے اور اسکی تشریح و توضیح پر مبنی تھا۔ امتحانات کا اہتمام زبانی سوالات اور جوابات کے ذریعے کیا جاتا۔ یہ سوالات و جوابات مباحثے کی شکل بھی اختیار کر لیتے تھے۔ اساتذہ میں سے چند ایک ایسے بھی ہوتے جو مذہب، قانون اور حکمت کی مزید تعلیم بھی حاصل کر لیتے۔

UrduDost Library UrduDost.com

تعلیمی ڈگریوں کے عطا ہونے پر گریجویٹس کو مختلف قسم کی سہولیات میسر ہو جاتیں۔ ان سہولیات کے ناجائز حصول کو روکنے کے لئے تعلیمی نظام میں کئی رسوم وضوابط کا اضافہ کیا گیا۔ جن میں دو بہت اہم تھے۔ پہلا یہ کہ طالب علم کو کسی ماسٹر کے پاس رجسٹر ہونا ہوتا تھا اور دوسرا اسے اپنے ماسٹر سے امتحان پاس کرنے کا مرحلہ طے کرنا ہوتا تھا۔ گریجویٹس کو ڈگری اساتذہ کی ایک کمیٹی عطا کرتی تھی۔ اور یہ ڈگری باقاعدہ ایک تقریب میں اساتذہ کی کمیٹی کی جانب سے چانسلر دیتا تھا۔ اس وقت وائس چانسلر کا عہدہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ دورانِ تعلیم نمبروں اور کارکردگی کی بنیاد پر، اسناد تقسیم کرنے کی تقریب میں گریجویٹس کے گاؤن اور ٹوپی کا رنگ منتخب کیا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طلباء کی تعداد بڑھنا شروع ہوگئی۔ اس کے علاوہ اساتذہ، طلبا اور دیگر سٹاف کو شہر کی مقامی انتظامیہ کے ساتھ مختلف امور کے سلسلے میں بات چیت کرنا پڑتی۔ ان معاملات کو نبٹانے کے لئے پروکٹر کا عہدہ وضع کیا گیا۔ اسی طرح دیگر انتظامی عہدے وجود میں آنا شروع ہو گئے۔ مختلف تعلیمی اور انتظامی معاملات طے کرنے کے لئے قواعد وضوابط کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور آہستہ آہستہ ضوابط بنانے کا عمل شروع ہو گیا۔ ابتدائی برسوں میں قواعد مختلف کتابوں اور جگہوں میں منتشر حالت میں پائے جاتے تھے۔ جنہیں بعد میں اکٹھا کیا جانے لگا۔ تیرھویں صدی کے وسط تک قواعد وضوابط تحریر کرنے کا رواج بھی شروع ہو چکا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۸۵۷ء میں پہلی مرتبہ قواعد وضوابط چھاپ کر افادہ عام کے لئے تقسیم کئے گئے تھے۔

گریجویٹس تعلیم مکمل کرنے کے بعد بالعموم دو قسم کی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ایک مذہبی خدمات یعنی وہ چرچ سے وابستہ ہوجاتے اور دوم وہ نظام مملکت چلانے میں مصروف ہوجاتے۔ مملکت کے نظام میں سفارت کاری، عدلیہ اور دیگر انتظامی امور اہم تھے۔ دورانِ تعلیم، بہت سارے طلبا اپنے اخراجات چرچ میں مختلف خدمات کی ادائیگی سے حاصل کی جانی والی آمدنی سے پورے کرتے تھے۔ اسطرح وہ چرچ کی زندگی سے کسی نہ کسی حوالے سے منسلک ہوجاتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طلبا اور سکالرز چرچ کی جانب سے عائد کئے گئے قواعد اور پابندیوں سے کترانے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے مرحلے میں انہوں نے مقامی مذہبی قیادت

UrduDost Library UrduDost.com

اور مقامی چرچ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور بہت سارے اختیارات جو چرچ کے ادارے کو حاصل تھے وہ یونیورسٹی کے چانسلر نے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ ان اختیارات میں سرفہرست لوگوں کے درمیان تنازعات کے فیصلے اور مرنے والوں کی وصیت پر عملدرآمد کے معاملات تھے۔ مقامی دکاندار اور تاجر کھانے پینے کی اشیاء، ایندھن اور موم بتیوں کی قیمتیں بڑھا کر ناجائز منافع خوری کرتے۔ لیکن یونیورسٹی کے پاس اب یہ اختیار بھی آ گیا کہ وہ مقامی دکانداروں کے خلاف مقدمات سن سکتے تھے۔ انہی وجوہات کی بنیاد پر انیسویں صدی کے آخر تک مقامی آبادی اور یونیورسٹی کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے۔ اسے کیمبرج میں 'ٹاؤن اور گاؤن' کی کشمکش قرار دیا جاتا تھا۔ ابتداء میں یونیورسٹی کے پاس اپنی عمارات دستیاب نہیں تھیں۔ اور سینٹ میری اور سینٹ بینیٹ گرجا گھروں میں تعلیم اور امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کے رہائشی گھروں کو جزوی طور پر تعلیمی سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن جلد ہی اساتذہ، طلبا اور دیگر متعلقین یونیورسٹی کی عمارات بنانے، خریدنے اور کرائے پر لینے کی افادیت کے قائل ہو گئے۔ چودھویں صدی کے اواخر میں یونیورسٹی نے سینٹ ہاؤس ہل کے علاقے میں اپنی عمارات خریدنے اور بنانے کی ابتداء کی۔ یہاں بنائی گئی عمارات کو سکولوں کا نام دیا گیا۔ سب سے پہلے 'ڈوینٹی سکول' قائم کیا گیا۔ یہاں پر کلاس روم بنائے گئے۔ پھر لائبریری، چیپل اور خزانہ برانچ بھی یہیں قائم کی گئی۔

ہنری ہشتم انگلینڈ کی تاریخ کا ایک اہم کردار ہے۔ وہ ۱۴۹۱ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۹ء میں بادشاہ بنا اور ۱۵۴۷ء میں اپنی موت تک بادشاہ کے منصب پر فائز رہا۔ اس نے چھ شادیاں کیں جن میں سے دو بیویوں کو اس نے قتل بھی کیا۔ اس کارنامے کی بدولت وہ کتابوں، فلموں، ڈراموں وغیرہ میں موضوعِ بحث رہا۔۔۔ ہماری تاریخ کے بادشاہوں کے تناظر میں محض چھ شادیاں کرنے والا بادشاہ نہیں، اسے زیادہ سے زیادہ کسی علاقے کا صوبیدار کہنا چاہیے۔ ہمارے تاریخ دانوں کو بادشاہوں کی شادیوں کی صحیح تعداد بھی معلوم نہیں ہوا کرتی تھی۔ صرف ریاست اودھ کے والی کے حرم میں سینکڑوں خواتین موجود رہی ہیں۔ اور بادشاہوں کا مقام و مرتبہ تو ہزاروں شادیوں کا طالب

UrduDost Library UrduDost.com

رہا ہے۔۔۔ ہنری ہشتم کا دوسرا بڑا کارنامہ کیتھولک چرچ سے علیحدگی اور چرچ آف انگلینڈ کا قیام ہے۔ وہ مطلق حکمرانی کا خواہشمند تھا۔ اسی لئے اس نے نئے چرچ کے قیام کے ذریعے پرانے چرچ کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس نے اپنے عہد سے پہلے کے رائج شدہ مذہبی نصاب اور تعلیم کو تبدیل کیا اور کیمبرج یونیورسٹی میں قدیم یونانی اور لاطینی علوم رائج کرنے پر زور دیا۔ وہ ریاضی اور بائیبل کی تعلیم کا بھی حامی تھا۔ دراصل اُس زمانے میں حکومتی حلقوں میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ کیمبرج سے تعلیم یافتہ افراد مستقبل میں مملکت اور حکومت کے امور بنٹانے کے لئے کارآمد ہوں گے۔ جس بنا پر بادشاہ یونیورسٹی کے نصاب وغیرہ کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔۔۔ یا مداخلت کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں وائس چانسلر کا عہدہ قائم کیا گیا تھا۔ جس کے ذریعے سے یونیورسٹی کے معاملات پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔۔۔ ہمارے ہاں اب بھی کم وبیش ایسا ہی ہے۔ جو وائس چانسلر یونیورسٹی کو حکومت کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا اسے حکمران آنکھیں دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔

کیمبرج میں اشاعت کا کام ۱۵۲۰ء میں شروع کیا جا چکا تھا۔ ۱۵۳۴ء میں ایک باقاعدہ شاہی فرمان کے ذریعے پرنٹنگ پریس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جبکہ ۱۵۸۴ء میں باقاعدہ اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔ اپنے قیام کے بعد کیمبرج یونیورسٹی پریس اور آکسفورد یونیورسٹی پریس کی انجیل کی اشاعت کے حوالے سے اجارہ داری رہی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز پر نیوٹن کے کام اور قوانینِ طبیعات کے نتیجے میں سائنسی تحقیق کا کام تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ جس سے یونیورسٹی تیز رفتاری سے ارتقائی مراحل طے کرنے لگی۔ اسی زمانے میں یونیورسٹی کو مختلف پروفیسر شپ آسامیوں کے حوالے سے عطیات موصول ہونا شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں بہترین اور قابل ترین سکالرز کو پروفیسر تعینات کرنا اور ان کی تحقیق کے لئے وسائل فراہم کرنا ممکن ہوگیا۔ ریاضی کے مضمون میں 'لیوکاسین پروفیسر شپ'۔ کیمیا اور فلکیات کے لئے 'پلومین پروفیسر شپ'۔ نباتیات اور جیالوجی کے لئے 'وڈورڈین پروفیسر شپ' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس نے بنیادی سائنسی مضامین کی تحقیق وترقی کے نئے امکانات دریافت کرنے میں مدد دی۔ ترقی یافتہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں یہ ایک معمول کا طریقہ کار ہے۔ دورِحاضر میں اس قسم کی پروفیسر شپ کی

UrduDost Library UrduDost.com

آسامیاں نہ صرف سائنس بلکہ سوشل سائنس اور آرٹس کے تمام مضامین کے لئے قائم کی جاتی ہیں۔آجکل بہت ساری نجی اور کثیر القومی کمپنیاں یونیورسٹیوں کو ایسی پروفیسر شپ آسامیاں قائم کرنے کے لئے وسائل مہیا کرتی ہیں۔۔۔ ہمارے ملک کا کاروباری سیکٹر اب کافی پھیل چکا ہے لیکن ابھی تک ہمارے ہاں کمپنیوں کی طرف سے ایسی پروفیسر شپ آسامیاں قائم کرنے کی روایت مضبوط نہیں ہوسکی۔یہ آسامیاں علم کی ترقی کے علاوہ عطیہ دینے والی کمپنیوں کے لئے بھی انتہائی مفید ثابت ہوتی ہیں۔لیکن ہمارے ہاں سرمایہ دار ابھی ان معاملات کی طرف التفات نہیں کرتے۔

اٹھارہویں صدی میں تعلیم مکمل کرنے والے طلباء کے جلسہ تقسیم اسناد کے وقت ایک پرانے گریجویٹ، جو اس زمانے میں بی۔اے کی سند کا حامل ہوتا تھا کو ایک تین ٹانگوں والی کرسی یا سٹول پر بٹھا دیا جاتا اور وہ ہر سند وصول کرنے والی کی شان میں دو چار مزاحیہ یا طنزیہ شعر یا جملے کہتا رہتا۔جس سے تقریب کا ماحول دلچسپ ہو جاتا۔ دلچسپ ،فقرے بازی کرنے والے کے لئے ہوتا۔جس بیچارے پر فقرے چسپاں ہوتے وہ بسا اوقات ساری عمر انہی فقروں سے پہچانا جاتا۔۔ ہمارے کئی دوست ایسی صورتِ حال سے بچنے کے لئے ساری عمر فیل ہو جانے کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔امتحان میں کامیاب ہونے سے آپ کو اگلی کلاس میں کامیابی کے لئے مغزماری کرنا پڑتی ہے یا عملی زندگی کے تھپیڑے سہنے ہوتے ہیں۔ناکامی کی صورت میں دوبارہ وہی کتابیں، وہی امتحان، وہی باتیں، وہی گھاتیں۔وہی راستے، وہی منزلیں۔اسی لئے امتحان میں ناکامی ایک عظیم نعمت ہے۔جس سے کسی صورت بھی دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔۔۔سترھویں صدی سے کیمبرج میں ریاضی دوسرے تمام مضامین کی نسبت زیادہ اہم سمجھا جانے لگا۔شروع میں صرف ریاضی کے امتحانات کو'ٹرائی پوس' کہا جاتا تھا۔بعد میں دوسرے مضامین میں بھی یہی طریقہ اپنایا گیا۔'ٹرائی پوس' کیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ شروع شروع میں جب کوئی طالب علم ایک سالانہ امتحان میں کامیابی حاصل کرلیتا تو اسے تین پایوں والے سٹول کا ایک پایہ دے دیا جاتا۔اسطرح جب وہ تین برسوں میں تین پائے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلیتا تو اسے پورا 'سٹول' مل جاتا یعنی اسے ڈگری

UrduDost Library UrduDost.com

عطا کر دی جاتی۔ 'ٹرائی پوس' کا رواج اور نظام کیمبرج کی روایت ہے۔ آج کل اس سے مراد کسی ڈگری کے امتحانات ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ تین ہوں۔ بہت سارے شعبوں اور مضامین میں یہ تین سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ریاضی کے بعد دوسرے مضامین قدرے تاخیر سے شروع کئے گئے۔ مثال کے طور پر سول لاء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پہلی مرتبہ ۱۸۱۶ء میں منعقد ہو سکا۔۔۔ سترھویں صدی میں ہی کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری کی بنیادیں رکھی گئی تھیں۔ جارج اول اور بشپ جان مور کی کتابوں کے عطیے نے لائبریری کے ذخیرے کو بہتر بنانے میں مدد دی۔ پرانے سکولوں کی عمارات کے بالمقابل سینٹ ہال بلڈنگ میں لائبریری کے لئے ضروری ترامیم کی گئیں اور یوں کتب خانے کا باقاعدہ اجراء ممکن ہو سکا۔

انیسویں صدی میں یونیورسٹی میں اصلاحات کے لئے مطالبات سامنے آنا شروع ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۵۰ء میں اصلاحات کے لئے رائل کمیشن تشکیل دیا گیا۔ جس کی سفارشات کی روشنی میں ۱۸۵۶ء میں یونیورسٹی کے قواعد وضوابط وضع کئے گئے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان ضوابط میں کئی تبدیلیاں آ چکی ہیں لیکن یونیورسٹی قواعد کا بنیادی ڈھانچہ آج بھی تقریباً وہی ہے جو ۱۸۵۶ء میں طے کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق یونیورسٹی کے امور کی بنیادی ذمہ داری سینیٹ، جو تمام گریجویٹس پر مشتمل ہے، اور وائس چانسلر اور اس کے معاونین کی ہے۔ نصاب اور پڑھائی کے دیگر امور جنرل بورڈ آف فیکلٹیز اور مالی امور مالیاتی بورڈ کے ذریعے نبٹائے جاتے ہیں۔ رائل کمیشن کی سفارشات لاگو ہونے کے بعد یونیورسٹی میں کئی نئے مضامین متعارف کروائے گئے اور ساتھ ہی ان مضامین کے طریقہ ہائے امتحانات یعنی 'ٹرائی پوس' بھی طے کر لئے گئے۔ ان مضامین میں قانون، تاریخ، تھیالوجی، ادب، مشرقی و یورپی زبانیں، آرکیٹکچر، آرکیالوجی، بنیادی سائنسز اور انجینئرنگ وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا رواج شروع ہوا۔ گزشتہ صدی کی ستر کی دہائی تک انڈر گریجویٹ طلبا کے لئے ضروری تھا کہ وہ شام کو شہر کی گلیوں اور بازاروں میں پھرتے ہوئے گاؤن پہنیں۔ اسکے علاوہ تمام کالجوں کے مین گیٹ آدھی رات سے بہت پہلے بند کر دیے جاتے تھے۔۔۔ یہ روایت تو

UrduDost Library UrduDost.com

ہمارے زمانہ طالبعلمی میں کالجوں میں عام تھی۔شائد اب بھی یہی طریقہ کار رائج ہو۔نوجوان بڑی تگ ودو کے بعد انتہائی اعلیٰ نمبر لے کر بڑے شہروں کے شاندار کالجوں جیسے گورنمنٹ کالج،ایف سی۔کالج۔لاہور،گورنمنٹ کالج فیصل آباد وغیرہ میں تعلیم حاصل کرنے یا والدین اور بزرگوں کی ناروا پابندیوں سے رہائی پانے آتے۔لیکن کالجوں کا ماحول پھر پابندیاں عائد کر دیتا۔رات کو دس بجے سے پہلے واپس اپنے ہاسٹل آجائیں یا پھر ساری رات باہر گزاریں۔رات باہر گزارنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہوتا تھا۔لیکن اگلے روز باز پرس ہوتی کہ رات کہاں گزاری ہے۔جرمانہ ادا کریں اور ساتھ ہی آپکے والدین کو اس بارے میں بذریعہ خط مطلع کیا جائے گا۔اگر ایسی پابندیوں سے بھر پور زندگی ہی گزارنا تھی تو میٹرک،ایف۔ایس۔سی وغیرہ میں دن رات ہلکان ہو کر میرٹ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ہم ایسے ہی کہا کرتے تھے کہ میرٹ بنا کر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھنا چاہتے ہیں۔آج آپ کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔پڑھائی،محنت،میرٹ غرضیکہ ہر چیز کے پیچھے صرف ایک ہی چیز کارفرما تھی کہ کیسے بزرگوں کے نرغے سے نکل کر ہاسٹل پہنچ کر من مانی کی جائے۔ہاسٹل پہنچے تو پھر پابندیاں۔لیکن ہم اتنی جلدی ہار ماننے والے کہاں تھے۔رات آوارہ گردی کرتے،فلمیں دیکھتے۔دوستوں کے ساتھ مری تک گھومنے بھی جاتے۔لیکن کالج انتظامیہ کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ہم نے چوکیداروں اور میس ملازمین کے ساتھ نہایت اچھے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔فلم کا آخری شو دیکھ کر ڈیڑھ بجے ہاسٹل پہنچتے تو مین گیٹ کے پاس پہنچ کر جانوروں کی آوازیں نکالتے۔چوکیدار کو خبر ہو جاتی،وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر نہایت خاموشی سے مین گیٹ کی بجائے ہاسٹل کا بغلی دروازہ کھولتا۔اور ہم دبے پاؤں اندر داخل ہو جاتے۔جاتے جاتے چوکیدار کو 'چاچا شکریہ' کہنے کے ساتھ نذرانہ بھی دیتے جاتے۔ایک اور عذاب ہوتا تھا ہمارے ہاسٹل میں۔رات کو پڑھائی کا ایک پیریڈ ہوتا تھا۔اذنِ عام تھا سب کمروں کی لائٹس آن ہونا چاہیں۔سب طلباء کو اپنے سٹڈی ٹیبل پر پڑھتے ہونا چاہیے۔۔۔ہم اپنے کسی کتابی کیڑا نما دوست کے ذمے لگا دیتے۔ وہ لائٹس آن کر کے خود پڑھتا رہتا۔چوکیدار کمرے کے باہر برآمدے میں بلند آواز میں پوچھتا۔کون کون پڑھ رہا ہے۔ہمارا دوست جواباً کہتا 'سب' پڑھ رہے

UrduDost Library UrduDost.com

ہیں۔ چوکیدار ہمارے دوست کی آواز پہچان کر اور اسکی شرافت اور صداقت کی وجہ سے قائل ہو جاتا۔ جبکہ سوائے ہمارے اُس کتابی کیڑے دوست کے، 'سب' لوگ اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے۔ اگر کبھی بادل ناخواستہ پڑھائی کے بغیر گزارہ ناممکن ہوتا تو پھر۔۔۔ابنِ صفی، تاریخی ناول، ڈائجسٹ حتیٰ کہ دہی دہانوی کی حیا سے بھرپور تحریریں بھی تو کسی مقصد کے لئے لکھی گئی تھیں، اور ہم اسی مقصد کی تکمیل میں مصروف رہتے۔ متعدد بار ہمارے گھر خطوط لکھے گئے کہ آپ کے نورِنظر خود تو جو ہیں، سو ہیں۔ لیکن یہ دوسرے معصوم طلباء کو ورغلا کر ایسی ایسی حرکتیں کرواتے ہیں کہ آپ کو بذریعہ خط نہیں بتائی جا سکتیں۔ ازراہِ کرم تشریف لائیے۔ تاکہ آپ کو بالمشافہ حالات سے آگاہ کیا جا سکے۔ ہاسٹل انتظامیہ بے حد مطمئن ہوتی کہ ہم نے اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نباہی ہے۔ لیکن ایسے تمام خطوط ڈسپیچ کلرک کے رجسٹر پر درج ہونے کے ایک دن کے اندر ہمارے پاس پہنچ چکے ہوتے۔ کیونکہ کلرک ہمارے حلقۂ دوستاں میں شامل تھے۔ جو ناول، تصاویر، رسالے، فلمیں وہ کہیں سے ڈھونڈ نہیں سکتے تھے آخرکار ہمارے درِدولت سے ہی انہیں میسر آیا کرتی تھیں۔ ہم اپنے گھر لکھے گئے خطوط کا ہفتے، عشرے بعد جواب لکھتے۔ کہ ہمیں آپ کا خط موصول ہوا۔ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ ہمارے جگر گوشے سے آپ کو شکایت ہے۔ ہم بوجہِ مصروفیت آنے سے قاصر ہیں۔ تاہم صاحبزادے کو سمجھا دیا گیا ہے۔ دوبارہ شکایت نہیں ہوگی۔ آپ نے اپنی ذمہ داری نبھائی۔ جسکی تحسین کرتے ہیں اور شکریہ بجا لاتے ہیں۔ کالج انتظامیہ جوابی خط پا کر مایوس ہو جاتی کہ عجب والدین ہیں۔ بچوں کے احوال تک دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ جوابی خط فائل ہوتا اور معاملہ تمام ہو جاتا۔۔۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران یونیورسٹی کے چودہ ہزار لوگوں نے مختلف فرائض ادا کئے۔ انہی فرائض کی انجام دہی کے دوران قریباً ڈھائی ہزار لوگ مارے بھی گئے۔ اس عرصے میں طلباء فیسیں ادا نہ کر سکے جس بنا پر یونیورسٹی کو شدید مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک رائل کمیشن تشکیل دیا گیا تھا۔ جس نے حکومت کو یونیورسٹی کی مالی معاونت کرنے کی سفارش کی تھی۔ اس معاونت سے یونیورسٹی کے معاملات درست کرنے میں مدد ملی

تھی۔انیسویں صدی اور اس سے پیشتر نیوٹن، ڈارون، میکس ویل، تھامسن اور ردرفورڈ اور دیگر ایسے ہی سکالرز کے کام کی وجہ یونیورسٹی کو پوری دنیا میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔جس کی وجہ سے پوری دنیا سے بہترین دماغ پڑھنے اور پڑھانے کے لئے کیمبرج کا رخ کرنے لگے۔اس کے علاوہ،حکومتوں اور پرائیویٹ کمپنیوں نے بھی بہت سارے منصوبوں میں یونیورسٹی کی معاونت شروع کر دی تھی۔جس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسائل میسر آنے لگے اور نئی عمارات، شعبے اور لیبارٹریاں قائم کرنے میں مدد ملی۔اسکی ایک عمدہ مثال ۱۹۷۰ء میں سائنس پارک کا قیام ہے۔

ہمیں کیمبرج آئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ملٹن اور گیٹ ہاؤس بہت عمدہ جگہ تھی۔ برطانوی گاؤں میں رہنے کی ہماری خواہش پوری ہوگئی تھی۔اب ہم نے کیمبرج شہر میں منتقل ہونے کو ترجیح دی اور گیٹ ہاؤس کو خیر باد کہہ دیا۔ہم کیمبرج کے علاقے چیسٹرٹن میں واقع فرینکس لین میں رہائش پذیر ہوگئے۔یہ جگہ سٹی سنٹر سے قریب تھی اور یہاں سے کیمبرج میں کسی جگہ جانا قدرے آسان تھا۔ہم جس گھر میں منتقل ہوئے،وہ ایک عام برطانوی طرز کا دومنزلہ گھر تھا۔اس کے گراؤنڈ فلور پر ایک چھوٹا کمرہ تھا جو ہمیں مل گیا۔اس کمرے کے پچھلی جانب ایک وسیع کچن تھا۔ اس کچن کے اندر ڈائننگ ٹیبل بھی موجود تھی اور بیٹھنے کے لئے صوفے بھی۔گویا یہ کمرہ بیک وقت کچن، ڈائننگ روم، لاؤنج اور ڈرائنگ روم تھا۔اس ہمہ صفاتی کمرے کے پچھلی جانب گارڈن بنا ہوا تھا اور گھر کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک کمرہ بالکل الگ تھلگ بنایا گیا تھا جہاں گھر کا مالک رہتا تھا۔اُس کا نام مِک ایبٹ تھا۔وہ مصور تھا اور گھر میں جا بجا اسکی پینٹنگز دیواروں پر آویزاں تھیں۔ مِک خوش اخلاق اور ہنس مکھ انسان تھا۔وہ دو چار ہفتوں کے لئے اِس گھر میں آتا۔پھر کبھی پیرس اور کبھی نیویارک چلا جاتا۔اسے سیاحت کا شوق تھا۔ڈرائنگ کم ڈائننگ کم کچن میں ایک پینٹنگ دیوار پر لگی تھی جس میں ایک نوخیز دوشیزہ کے چہرے سے نیچے اور گھٹنوں سے اوپر جسم کو دکھایا گیا تھا۔اس کے جسم پر اتنے ہی ملبوسات تھے جن سے زیادہ اگر کوئی دوشیزہ پہن لے تو مصور اس کی تصویر بنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ہم نے بہت غور کیا کہ اس تصویر میں ظاہری برہنہ پن کے

UrduDost Library UrduDost.com

معانی تو ہم جیسے گنوار کو بھی سمجھ آتے ہیں لیکن مصور کی آنکھ نے یقیناً کوئی گہرے رموز دکھائے ہوں گے جو ہمیں نظر نہیں آتے۔ شائد مصور کے علاوہ بھی کوئی شخص ان رموز کو پہچان سکتا ہوگا۔ اپنی کم علمی پر ہر روز ندامت ہوتی۔ ہم بلا ناغہ اس تصویر پر غور کرتے لیکن صرف برہنہ پن ہی نظر آتا۔ ایک دن ہم نے اپنی شکست تسلیم کر کے مِک سے پوچھ ہی لیا کہ اس تصویر میں کیا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مِک نے تصویر کی طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔ یہ دیہاتی جنسی تسکین کے لئے ایک برہنہ لڑکی دکھائی گئی ہے۔ ہم نے پوچھا، دیہاتی اور شہری جنسی تسکین میں کیا فرق ہے۔ بولا۔ میں نے ایسے ہی دیہاتی کہہ دیا ہے۔ اصل میں تو جنسی تسکین کے لئے برہنہ لڑکی ہے۔ ہمیں بات سمجھ نہ آئی۔ مزید دریافت کیا۔ برہنگی تو سب کو نظر آتی ہے لیکن کیا کوئی معنی کا جہاں بھی اس نادر عجوبے میں ہے۔ کہنے لگا۔ نہیں، ایسی تو کوئی چیز نہیں۔ ہم نے پوچھا کہ پھر آرٹ کیا ہے۔ کہنے لگا۔ آرٹ یہی ہے کہ دیکھنے والے کو برہنگی سے تسکین ہو جائے اور کیا۔۔۔ ہم خواہ مخواہ غور و خوض کر کے ہلکان ہوتے رہے۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور پینٹنگ میں ایک خاتون نیم دراز حالت میں پچھلی جانب سے دکھائی گئی تھی۔ یہاں ملبوسات کا اتنا تکلف بھی نہیں تھا جتنا مصور کر لیا کرتے ہیں۔ ہم نے جی کڑا کر کے پوچھا، تو اس تصویر کے کیا معانی ہیں۔ کہنے لگا، وہی جو ساتھ والی کے ہیں۔۔۔ ہم نے بڑی حیرانی سے مِک سے کہا، آرٹسٹ تو اپنی ہر پینٹنگ میں دریا بند کیا کرتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ جو نظر آ رہا ہے بس وہی ہے۔ قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ میں ابھی اُس مقام پر نہیں پہنچا جہاں جھوٹ بول کر آرٹ کا بول بالا کیا جاتا ہے۔

گھر کی بالائی منزل پر چار کمرے تھے۔ ایک کمرے میں نِکولس اور اس کی گرل فرینڈ رہتے تھے۔ نکولس کو اس کی گرل فرینڈ پیار سے یا شائد جلدی میں نِک کہہ کر پکارتی تھی۔ نِک گورا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ چینی تھا۔ اس کا نام چاچاؤ تھا۔ نِک بات بے بات ہنستا رہتا۔ چاچاؤ ہر وقت اپنے چاؤ پورے کرتی رہتی۔ وہ اڑھائی سال پہلے انگلینڈ آئی تھی۔ انگریزی فرفر بولتی تھی۔ کسی کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ گورے کے ساتھ رہنے پر بہت خوش اور پُر اعتماد تھی۔ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتی۔ رات کو دیر تک نِک اور دوسروں کے ساتھ گیمز کھیلتی۔ جونہی نِک سے گیم

میں کوئی بے وقوفی ہوتی۔ اسے بلا دھڑک 'باسٹرڈ' کے خطاب سے نوازتی۔ وہ اس شیریں زبانی کی بھی داد دیتا۔ وہ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے آخری مراحل میں تھا۔ کھانا دونوں اکٹھے کھاتے۔ پکاتا زیادہ تر نِک ہی تھا۔ ۔ گھر میں کسی کو کھانسی بھی آتی تو سب کو آواز سنائی دیتی۔ ہمارے کمرے کے بالکل اوپر نِک اور جا جاؤ کا کمرہ تھا۔ رات کو سونے سے پہلے، جا جاؤ وہ کھلواڑ کرتی کہ ہم جیسے خشک طبع کی بھی رال ٹپکنے لگتی۔ یوسفی صاحب کی تشبیہ تخمی آم چوسنے کا واقعہ بالائی منزل میں وقوع پذیر ہوتا تو آواز اپنے تمام زیر و بم کے ساتھ ہمیں سنائی دیتی۔ ان کے ساتھ والے کمرے میں ایک گوری رہتی تھی۔ اس کا نام ہیلن تھا۔ قد کوئی پونے چھ فٹ ہوگا۔ جیسے باسکٹ بال کی کھلاڑی ہو۔ جسم کمزوری کی حدوں کو چھوتا ہوا سمارٹ۔ بے حد مہذب اور گفتگو اور آداب میں شائستہ۔ پکی سبزی خور تھی۔ گوشت، انڈے اور ان سے بنائی گئی اشیاء سے متنفر۔ ایسے لوگوں سے اس سے قبل بھی ہمارا واسطہ رہا تھا لیکن ہیلن اُن سب سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ دودھ کا استعمال نہیں کرتی تھی۔ ایک دن ہم نے دودھ استعمال نہ کرنے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگی۔ دودھ حاصل کرنے سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے اور میں کسی صورت بھی جانوروں کا استحصال کرنا پسند نہیں کرتی۔ اس کی بجائے میں مختلف پودوں کے بیجوں سے دودھ بنا لیتی ہوں جو غذائیت اور ذائقے میں عام دودھ جیسا ہی ہوتا ہے۔ ہم نے اشتیاق سے ایک روز پودوں کے بیجوں سے کشید کیا گیا دودھ چکھا۔ تو معلوم ہوا کہ غذائیت والی بات تو شائید ہیلن ٹھیک ہی کہتی ہوگی لیکن ذائقے کے حوالے سے ہمیں اس کی بات درست دکھائی نہ لگی۔ وہ پودوں کے بارے میں تحقیق کر رہی تھی۔ آپ بھولے سے بھی کسی پودے کی بات کر بیٹھیں تو خوشدلی سے تفصیلات سناتی۔ یہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کیا فوائد ہیں۔ کن علاقوں کے لئے موزوں ہے۔ الغرض پودوں کا انسائیکلو پیڈیا تھی۔ کھانے پکانے کی دلدادہ۔ کوئی کام کرنے کو نہ ہوتا تو دودھ چاکلیٹ سے کیک بنا کر سب کو کھلاتی۔ ہم سے بہت التفات برتتی۔ ہم ابھی اس کرم کے معنی ڈی کوڈ کر ہی رہے تھے کہ ایک دن کچن میں اس کے ساتھ ایک نوجوان کو دیکھا۔ تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگی۔ میرا بوائے فرینڈ ہے۔ ہفتے، دس دن بعد ایک رات کے لئے مجھے ملنے کے لئے وقت نکال لیتا ہے۔ یہ سن کر ہم پر اوس پڑ گئی۔ اور پھر ہلین کے ساتھ گفتگو

UrduDost Library UrduDost.com

کھانا پکانے اور پودوں کی افزائش نسل تک ہی محدود ہوگئی۔ بالائی منزل کے تیسرے کمرے میں صوفیہ رہتی تھی۔نسبتاً کم گواور کم آمیز تھی۔اسکی آواز اور قہقہے سنتے تو معلوم ہوتا۔اسکا بوائے فرینڈ ملنے آیا ہوا ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ اس کا بوائے فرینڈ صرف رات کے وقت ہی ملنے آتا اور صبح ہوتے ہی چلا جاتا کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کے بوائے فرینڈ کو ایک مرتبہ دن کے وقت بھی آتے دیکھا۔اس روز وہ صوفیہ سے ادھار لینے آیا تھا۔ چوتھے کمرے میں جاؤپو نامی ایک چینی رہتا تھا۔ جو بیجنگ میں انجینئرنگ میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہا تھا۔ وہ اپنی تحقیق کے سلسلے میں چھ ماہ کے لئے کیمبرج آیا ہوا تھا۔وہ سارا دن پڑھتا رہتا یا پھر بور ہوتا رہتا۔اسکی فرصت کے اوقات میں بوریت دیکھنے کے بعد احساس ہوتا کہ پہلے زمانے کے چینی افیون کیوں استعمال کیا کرتے تھے۔ اتنے سارے افراد جہاں اکٹھے رہتے ہوں وہ جگہ گھر نہیں، سرائے ہوتی ہے۔اور جب یہ تمام لوگ موجود ہوتے تو ایک جلسہ برپا ہوتا۔سوائے لینڈ لارڈ مِک ایبٹ کے سب لوگ سائیکلیں استعمال کرتے۔ گھر کے ایک کمرے میں دس سے زائد، ایک سے بڑھ کر ایک پرانی، سائیکلیں جمع تھیں۔ان سائیکلوں کو گھر سے باہر کہیں لے جاتے تو ایسے ایسے تالے لگا کر کھڑی کرتے کہ سائیکل چوروں کو انہیں چرانے میں سخت کوفت اور جھنجھلاہٹ ہوتی۔صرف مِک ایبٹ کے پاس کار تھی۔ جس کی قیمت، اگر زیادہ سے زیادہ بھی لگائی جائے تو، ایک سائیکل سے آدھی تھی۔

ایک دن ہیلن نے اپنی خوش طبعی اور کھانا پکانے کی محبت سے مغلوب ہوکر، سب لوگوں کو تجویز دی کہ سب اکٹھے کھانا بنائیں اور کھائیں گے۔ نک اور جاجاؤ نے ہیومس، سسمی، چپس، چنے اور لیمن جوس بنایا۔ جاؤپو نے چائینز ڈمپلنگ پکایا۔ یہ سبزیوں یا گوشت کے گولے سے ہوتے ہیں جن کے گرد آٹے کا خول سا بنایا جاتا ہے۔ہیلن نے سلاد اور ویت نامی کھانا بنانے کی مشق کی۔ ہم کہ صدا کے پھوہڑ کیا کرتے۔ بازار سے یخنی پلاؤ کا مصالحہ خرید لائے۔ پیاز بھون کر یخنی پلاؤ کا مصالحہ ڈالا اور بھیگے ہوئے چاول اسی ملغوبے میں پکا لئے۔ چونکہ ہم نے مرغی یا کسی اور چیز کا گوشت تو شامل نہیں کیا تو پھر جس طرح کا یخنی پلاؤ بنا ہوگا۔اس کا تصور آپ خود ہی کر لیجئے۔ خیر، کھانا تیار ہوگیا۔سب لوگ کھانے کی میز کے گرد بیٹھ کر کھانے لگے۔ ہم نے جب ویت نامی، چینی

UrduDost Library UrduDost.com

اوراپنے دیسی کھانے چکھے تو یوں لگا کہ ہم گھاس پھوس چر رہے ہیں۔اورڈائننگ ٹیبل سے جو خوشبو آئی،اس سے ہمیں اپنے بچپن کے وہ دن یاد آ گئے جب ہم سالانہ چھٹیوں میں اپنی پھوپی مرحومہ سے ملنے گاؤں جایا کرتے تھے۔گاؤں میں جو بھینس دودھ نہ دیتی ہو۔اس کو جس قسم کے کھانے، جنھیں پنجابی میں کاڑھا کہتے ہیں،کھلا کر دودھ اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہماری ڈائننگ ٹیبل پر موجود کھانوں سے بالکل وہی لپٹ آ رہی تھی۔اس طرح کا کھانا نہایت نفس کُش ہوتا ہے اور آپ کو پل بھر میں ہی مقامِ ولایت دلوا سکتا ہے۔نجانے کیوں جوگی اور سادھو گیان پانے کے لئے بارہ بارہ سال جنگلوں میں رہتے ہیں۔بس اس قسم کی ایک آدھ دعوت کھا لیا کریں۔مقامات آسان ہو جائیں گے۔

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج کے کالج

دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں میں تعلیم و تحقیق کے لئے مختلف شعبے قائم کئے جاتے ہیں۔ ہر یونیورسٹی اپنی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق ان شعبوں کا انتخاب کرتی ہے۔کوئی بھی یونیورسٹی دنیا کے تمام علوم کے شعبے قائم نہیں کرتی۔مزید یہ کہ ہر یونیورسٹی کے کچھ شعبے بہت توانا اور مضبوط ہوتے ہیں لیکن اسی یونیورسٹی کے دیگر شعبے ممکن ہے زیادہ فعال نہ ہوں۔ اسی لئے آج کل یونیورسٹیوں کے نام کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے کس شعبے سے تعلیم حاصل کی ہے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی یونیورسٹی بطور کلی بہت شاندار نہ ہو لیکن اس کے کچھ مخصوص شعبے نہایت اعلیٰ معیار کے حامل ہوں۔تعلیم و تحقیق کا کام زیادہ تر تعلیمی شعبوں یا اکیڈیمک ڈیپارٹمنٹس کے سپرد ہی ہوتا ہے۔ شعبے کی اصطلاح کے ساتھ ساتھ کچھ یونیورسٹیاں سکول، کالج ،انسٹیٹیوٹ، ڈویژن وغیرہ کی اصطلاح بھی استعمال کرتی ہیں۔لیکن یہ سب انتظامی معاملہ ہوتا ہے۔کام کے اعتبار سے ان سب کا ایک ہی مقصد ہے۔یعنی تعلیم و تحقیق۔کیمبرج یونیورسٹی ایک کالجیئٹ یونیورسٹی ہے۔ دنیا میں کالجیئٹ یونیورسٹی کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً آکسفورڈ یونیورسٹی، ڈُرہم یونیورسٹی وغیرہ۔کالجیئٹ یونیورسٹی میں کالج کا تصور غیر کالجیئٹ یونیورسٹی میں پائے جانے والے کالج کے تصور سے بالکل جدا ہے۔غیر کالجیئٹ یونیورسٹیوں میں کالج دراصل تعلیمی شعبوں کے طور پر ہی کام کرتے ہیں۔کالجیئٹ یونیورسٹی میں تعلیمی شعبوں کے ساتھ ساتھ کالج بھی ہوتے ہیں۔ یہ کالج مختلف امور سرانجام دیتے ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ طلباء اور سکالرز کی رہائش گاہ ہوتے ہیں۔ گویا یہ ہاسٹل اور بورڈنگ ہاؤس کے طور پر کام کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ اپنے طلباء، سکالرز، فیلوز اور دیگر

UrduDost Library UrduDost.com

متعلقین کے لئے غیر نصابی سرگرمیوں کا بندوبست کرتے ہیں۔سوشلائزیشن یعنی میل ملاقات اور روابط قائم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔کھیل،ڈرامے،فلمیں،مصوری،شاعری اور بہت کچھ۔ یہ سب انہی کالجوں میں پروان چڑھتا ہے۔تیسرے یہ اپنے طلباء بالخصوص انڈر گریجویٹ طلباء کے لئے محدود تعلیمی کلاسوں یا سپرویژن کا بندودست کرتے ہیں۔یہ سپرویژن طلبا وطالبات کے ایک بہت چھوٹے سے گروپ میں دی جاتی ہے۔عام طور پر ایک سپرویژن کلاس میں ایک سے تین سٹوڈنٹس ہوتے ہیں۔ایک اوراہم کام جو یہ کالج سرانجام دیتے ہیں،وہ مخصوص موضوعات پر تحقیق ہے۔لیکن کالجوں کی تحقیق بالعموم تعلیمی شعبوں کی نسبت محدوداورمخصوص ہوتی ہے۔کالج درحقیقت ایک رہائشی ادارہ ہے جو ایک مخصوص ماحول فراہم کرتا ہے جہاں طلباء کی تربیت اور دانشورانہ صلاحیت پروان چڑھائی جاتی ہے۔کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم وتحقیق تعلیمی شعبوں کی بنیادی ذمہ داری ہے نہ کہ کالجوں کی۔کالج میں بہت سارے سینیئر سکالرزاورفیلوز ہوتے ہیں۔جن کے ساتھ جونیئرز کا ایک غیر رسمی نوعیت کا تعامل ہوتا ہے جو کسی بھی جونیئر کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں انتہائی اہم کردارادا کرسکتا ہے۔کیمبرج اورآکسفورڈ یونیورسٹیاں اپنے اپنے کالجیئٹ نظام پر بہت انحصار اورفخر کرتی ہیں۔ان یونیورسٹیوں کا یہی کالجیئٹ سسٹم انہیں باقی یونیورسٹیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ کیمبرج اورآکسفورڈ میں یہ تصور عام ہے کہ کالجیئٹ نظام کی بدولت ہی ان یونیورسٹیوں نے دنیا کے ہر شعبے کے لئے بہترین افراد پیدا کئے ہیں۔اس ضمن میں بہت ساری شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔دراصل غیر کالجیئٹ یونیورسٹیوں میں طلباء،سکالرز،پروفیسرزاوردیگر تمام متعلقین تعلیم وتحقیق پر زوردیتے ہیں۔جس سے ان کے طلباء تعلیم اور تحقیق میں تو ماہر بن سکتے ہیں۔لیکن غیر نصابی سرگرمیوں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔مزید یہ کہ کالج جس انداز میں علم ودانش کا ایک رہائشی ماحول فراہم کرتے ہیں وہ غیر کالجیئٹ یونیورسٹیوں میں ممکن نہیں ہوتا۔جس بنا پر کالجیئٹ یونیورسٹیوں کے طلبا علم وتحقیق میں بھی دوسری یونیورسٹیوں کے طلباء سے بالعموم بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس بات کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ فرض کریں ایک انڈرگریجویٹ طالبعلم کسی ایک ایسے کالج کا رکن اورر ہائشی ہے جس میں نیوٹن بھی رہائش پذیر ہوتو لامحالہ وہ طالب علم اپنی رسمی کلاسز

UrduDost Library UrduDost.com

کے بعد جب ایسے نادر لوگوں کی صحبت میں وقت گزارے گا تو یقیناً اپنی رسمی تعلیم سے بہت زیادہ علم حاصل کر پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل لوگ علم، سیاست، معیشت، معاشرت غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی میں اس وقت اکتیس کالج ہیں۔ ان کالجوں کے اپنے اپنے امتیازات ہیں۔ کیمبرج میں ۱۲۸۴ء میں سب سے پہلے 'پیٹر ہاؤس کالج' قائم ہوا تھا۔ اُس وقت سے لے کر بیسویں صدی کے دوسرے نصف آخر تک قریباً آٹھ سو سالہ تاریخ میں کالجوں میں صرف مردوں کا داخلہ ہی ممکن تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ڈارون کالج بنایا گیا۔ جس نے سب سے پہلے خواتین کو داخلہ دیا تھا۔۔۔ مرد و خواتین کے مساوی حقوق کا تصور یورپی دنیا میں بھی اتنا پرانا نہیں ہے۔ بلکہ ابھی شائد بہت سارے معاملات میں مغرب کو بھی اس حوالے سے مزید پیش رفت کی ضرورت ہے۔۔۔ ڈارون کالج کی اتباع کرتے ہوئے باقی کالجوں نے بھی اب خواتین کو داخلہ دینا شروع کر دیا ہے۔ ماڈلین کالج وہ کالج ہے جس نے سب سے آخر میں یعنی ۱۹۸۸ء میں خواتین کو داخلہ دینا شروع کیا تھا۔ اس وقت تین کالج ایسے ہیں جو مکمل طور پر خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ 'مرے ایڈورڈ'۔ 'لوسی کیونڈش'۔ اور 'نیونیم' کالج ہیں۔۔۔ ان میں مردوں کو داخلہ نہیں دیا جاتا۔۔۔ وہ وقت دور نہیں جب دنیا کے مرد اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ اپنی تنظیمیں بنا کر عورتوں کے چنگل سے آزادی کے لئے شاہرات پر نعرے بازی کیا کریں گے۔ ہماری مراد عام مرد ہیں۔ شادی شدہ مرد نہیں۔ کیونکہ شادی شدہ بلکہ شادی زدہ مرد دنیا کی مظلوم اور کمزور ترین مخلوق ہیں۔ انہیں محض اپنے حقوق کی آگاہی کے لئے قیامت کے بعد ایک نئی دنیا بسانے تک کا عرصہ درکار ہوگا۔۔۔ کچھ کالج صرف گریجویٹ طلباء کو داخلہ دیتے ہیں۔ اور نو جوان طلباء کے ناز نخرے اٹھانے سے محفوظ رہتے ہیں۔۔۔ چند کالج ایسے بھی ہیں جو تمام مضامین میں داخلہ نہیں دیتے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی خاص مضمون میں داخلے کے خواہشمند طلباء و طالبات کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً چرچل کالج سائنس اور انجینئرنگ کے امیدواران کو داخلے میں ترجیح دیتا ہے۔ لیکن زیادہ تر کالج ہر شعبے کے طلبا و طالبات کو داخلہ دے کر ایک توازن کی فضا قائم کرنے کی

UrduDost Library UrduDost.com

کوشش کرتے ہیں۔ غیر رسمی طور پر کچھ کالج دیگر رجحانات یا تعصّبات بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً کنگز کالج کا جھکاؤ بائیں بازو کے خیالات کی طرف سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ کالج اپنی تاریخی روایات کی بنا پر مذہبی رجحانات کے حامل بھی سمجھے جاتے ہیں۔ تمام کالجوں کے اپنے اپنے نشانات اور سکارف کے رنگ بھی ہیں۔ تقریباً تمام کالج مختلف کھیلوں اور ادبی وغیر ادبی سرگرمیوں کے اپنے اپنے کلب بھی رکھتے ہیں۔ اسوقت سب سے کم سٹوڈنٹس یعنی ۱۵۵ 'کلیئر کالج' میں اور سب سے زیادہ 'ہومرٹن کالج' میں ہیں جن کی تعداد ۱۸۱۱ ہے۔

کیمبرج کے شمال میں 'ایلی' نام کا ایک شہر ہے۔ ۱۲۸۴ء میں اس شہر کے بشپ نے کیمبرج یونیورسٹی کے قدیم ترین کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ سٹوڈنٹس کی تعداد کے اعتبار سے، یہ کالج کیمبرج کے روایتی کالجوں میں نسبتاً چھوٹا تصور کیا جاتا ہے۔ ابتداء میں ایک ماسٹر، چودہ مفلس و نادار طلباء اور دو گھر کرائے پر لے کر پیٹر ہاؤس کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ کیمبرج کالجوں میں ماسٹر انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ماسٹر بننے کے لئے بہت ساری چھلنیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر ماسٹر کے لئے کیمبرج سے ڈگری یافتہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ بالعموم ماسٹر وہی شخص تعینات کیا جاتا ہے جس کا پروفائل نہایت اعلیٰ درجے کا ہو۔ اسے پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ممتاز ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ماسٹر کی تعیناتی کیلئے امیدوار کی کالج کے لئے خدمات کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ وہ کالج کے اکثر انتظامی امور کو سرانجام دینے کا پابند ہوتا ہے۔ کچھ کالجوں مثلاً ٹرینٹی کالج کے ماسٹر کی تعیناتی وزیرِاعظم کی سفارش پر ملکہ برطانیہ کرتی ہے۔۔۔ حد ہوگئی ہے۔ ماسٹر کی تعیناتی وزیرِ اعظم اور ملکہ کے حکم کی محتاج ہے۔ ہمارے سکول میں تو ایسے ماسٹر صاحبان بھی ہوتے تھے جو بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے آٹھ جماعتیں پاس کر رکھی ہیں۔ ویسے انکے تلفظ اور لہجے سے یوں لگتا تھا جیسے انہیں آٹھویں جماعت پاس کرنے کی سند بھی اعزازی طور پر دی گئی ہوگی۔ اور انکی تعیناتی کس نے کی تھی۔ امکان غالب ہے کہ انہیں خود بھی اس بارے میں علم نہیں ہوگا۔ لیکن وہ ایسے شاندار طریقے سے اسباق ازبر کروایا کرتے تھے کہ طلباء بغیر سمجھ آئے کتاب کا ایک ایک صفحہ مع صفحہ نمبر فر فر سنایا کرتے تھے۔۔۔ عام طور پر کالج ماسٹر کی رہائش بھی کالج کے اندر

UrduDost Library UrduDost.com

ہی ہوتی ہے۔اس بنا پر وہ ہر وقت طلباء کے سر پر سوار رہتا ہے۔ ویسے ہم کیمبرج میں جتنے طلباء سے ملے،ان سب کا خیال تھا کہ ان کی کارکردگی صرف اسی صورت میں بہتر ہوسکتی ہے کہ کالج ماسٹر کی رہائش گاہ فرانس یا سکاٹ لینڈ منتقل کر دی جائے اور اسے سال کے بعد کالج آنے جانے کا ایک ٹکٹ مفت فراہم کر دیا جائے۔ بشرطیکہ ماسٹر یہ حلف دے کہ وہ جس دن کالج آئے گا،اسی روز واپس چلا جائے گا۔اور کسی ناگہانی صورت میں بھی کالج کے احاطے میں رات بسر نہیں کرے گا۔کالج کی تعلیمی فضا میں بہتری پیدا کرنے کے لئے اس طرح کے معمولی نوعیت کے اقدامات بہت ضروری ہیں۔۔۔ابتداء میں سینٹ پیٹر چرچ میں طلباء و سکالرز قیام پذیر رہے لیکن انہیں آمدورفت کے لئے اس کا بڑا دروازہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ پیٹر ہاؤس کے بانی بشپ ۱۲۸۶ء میں رحلت فرما گئے۔انہوں نے ترکہ میں تین سو مارک چھوڑے تھے جنہیں استعمال کر کے چرچ کے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا گیا جس پر کالج کا ہال تعمیر کیا گیا۔اس کالج کے ابتدائی برسوں کے ریکارڈ سے اسکی بے سروسامانی کا پتہ چلتا ہے۔۱۳۵۵ء میں ایک ٹرسٹ فنڈ قائم کیا گیا۔جس کی بدولت کالج قریباً سترا ایکڑ اراضی خریدنے کے قابل ہوا۔ یہ کالج صدیوں کے سفر کے دوران مذہبی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا رہا۔۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہ کالج اس وقت کی وزیرِ اعظم مارگریٹ تھیچر کی پالیسیوں کا حامی بنا رہا۔اسی لئے اسے عام طور پر دائیں بازو والے رجحانات والا کالج سمجھا جاتا ہے۔اس کالج کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ کیمبرج یونیورسٹی میں پہلا کالج تھا جس میں ۱۸۸۴ء میں روشنی کے لئے بجلی کے بلب نصب کئے گئے تھے۔ یہ بلب کالج کی چھ سوویں سالگرہ منانے کے لئے اس کے مرکزی ہال اور کمبی نیشن روم میں لگانے کے لئے 'لارڈ کیلون' نے فراہم کئے تھے۔کیلون کے نام سے سائنس کے سب طالبعلم آگاہ ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کے نام سے درجہ حرارت کا کیلون سکیل منسوب ہے۔کیلون نے ہی سائنس کو 'مطلق صفر' درجہ حرارت اور 'حرکی توانائی' کے تصورات دیے تھے۔اس نے فزکس اور انجینئرنگ میں پڑھائے جانے والے 'تھرموڈائی نیمکس کے قوانین' وضع کئے تھے۔جنہیں ہم 'تھرموڈائی نیمکس کا پہلا اور دوسرا قانون' کے نام سے پڑھتے ہیں۔ بلکہ طلبا کو رٹاتے ہیں۔ان کے بغیر جدید

UrduDost Library UrduDost.com

مکینیکل اور کیمیکل انجینئرنگ پڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیلون ۱۸۲۴ء میں شمالی آئر لینڈ میں بل فاسٹ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ۱۸۴۱ء میں پیٹر ہاؤس میں داخل ہوا اور ۱۸۴۵ء میں امتیاز کے ساتھ یہاں سے تعلیم مکمل کر گیا۔ وہ اپنے زمانہ طالبعلمی میں ہی سائنسی تحقیق کے لئے معروف ہو گیا تھا۔ کیمبرج میں اپنے قیام کے دوران وہ کھیلوں میں بھرپور حصہ لیتا۔ اس کے علاوہ اسے ادب اور موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا۔ وہ پیٹر ہاؤس کالج کا فیلو بھی منتخب ہوا۔ اسے سائنس میں ریاضی، طبیعات اور بالخصوص برقیات سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ اسے بحری سفر اور سائنس سے بھی دلچسپی تھی۔ اور وہ سائنسی تاریخ میں اپنے 'بحری قطب نما' کے کام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس نے بے شمار ایجادات کیں۔ اور بہت سے سائنسی معمے حل کئے۔ اس کے سائنسی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ جس میں 'جاؤل۔ تھامسن ایفیکٹ'۔ 'کیلون مساوات'۔ 'کیلون برج'۔ 'سٹوک کا قانون'۔ 'مر رگیلوانو میٹر'۔ 'سائفن ریکارڈر'۔ 'کیلون ویؤ اور نجانے کیا کچھ شامل ہے۔ وہ گلاسگو یونیورسٹی میں محض بائیس برس کی عمر میں پروفیسر بن چکا تھا۔ وہ برطانیہ کا پہلا سائنسدان تھا جسے ہاؤس آف لارڈز کا رکن بننے کا شرف ملا۔ گلاسگو میں اس کی تجربہ گاہ کے قریب سے گزرنے والے دریا کو اسی کے نام سے موسوم کر کے 'دریائے کیلون' کا نام دیا گیا ہے۔ اسے دنیا بھر کی یونیورسٹیوں سے پروفیسر بننے کی پیشکش ہوتیں رہیں لیکن اس نے گلاسگو یونیورسٹی میں ہی کام کرنے کو ترجیح دی اور مسلسل پچاس برس تک وہاں تعلیم و تحقیق سے منسلک رہا۔ گلاسگو یونیورسٹی کے 'ہنٹیرین میوزیم' میں اس کے تحقیقی مقالہ جات اور ایجادات کی مستقل نمائش کی گئی ہے۔

پیٹر ہاؤس نے کیلون کے علاوہ بھی بہت سارے نامور لوگ پیدا کئے ہیں۔ جن میں سے ایک نام چارلس بیبج ہے جو ریاضی، تجزیاتی فلسفہ اور کمپیوٹر سائنس کا ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۷۹۱ء میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۸۱۰ء میں کیمبرج ٹرینٹی کالج میں داخل ہوا۔ وہ ریاضی کا ایک انتہائی سنجیدہ طالبعلم تھا۔ اسے ٹرینٹی کالج میں ریاضی پڑھنے اور سیکھنے کے حوالے سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ۱۸۱۲ء میں ٹرینٹی کالج خیر باد کہہ کر پیٹر ہاؤس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی برس اس نے تجزیاتی سوسائٹی کی بنیاد بھی رکھی۔ وہ پیٹر ہاؤس کالج سے گریجویٹ نہ کر سکا، البتہ اسے یہاں

UrduDost Library UrduDost.com

سے۱۸۱۴ء میں اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔۔۔ترقی یافتہ اور پڑھے لکھے معاشروں میں شرف انسانیت کا جس قدر خیال رکھا جاتا ہے۔وہ اسی واقعے سے مترشح ہے۔یعنی جو طالبعلم ایک کالج کے ماحول کو غیر سنجیدہ قرار دے کر دوسرے میں داخل ہو جائے اور وہاں بھی امتحانات میں کامیابی کی بنیاد پر ڈگری حاصل نہ کر سکے۔اس کے لئے اعزازی ڈگری کا راستہ کھلا ہے۔ہم اور ہمارے بہت سارے احباب اپنے اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو یہی اصول منوانے کی جدوجہد میں اپنی نصف زندگی ضائع کر بیٹھے ہیں۔ کہ ہمیں آپ کا تعلیمی ماحول 'غیر سنجیدہ' معلوم ہوتا ہے۔اور ہم آپ کے امتحانات کو بھی چنداں اہمیت نہیں دیتے۔آپ کیمبرج کے پیٹر ہاوس کالج کی نظیر سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ڈگری عطا کر دیں۔لیکن ہمارے تعلیمی ادارے اپنی پسماندگی کی وجہ سے اس اصول کو قبول کرنے سے کتراتے رہے ہیں۔لیکن ہم پر امید ہیں کہ ایک نہ ایک دن ہماری جدوجہد رنگ لائے گی۔۔۔چارلس بیج کے دور میں کیلکو لیٹر اور کمپیوٹر نہیں تھے۔طویل اور پیچیدہ جمع،تفریق یعنی کیلکولیشن کرنے کے لئے مختلف ٹیبل مثلاً لوگرتھم وغیرہ کے ذریعے جمع،تفریق کی جاتی تھی اور اس عمل میں انسان قدرتی طور پر غلطیوں کا ارتکاب بھی کرتے۔ چارلس نے جمع، تفریق اور دیگر پیچیدہ کیلکولیشن کرنے کے لئے ۱۸۲۰ء میں ایک مشین بنانے کا منصوبہ بنایا۔ایسی مشین جس کے ذریعے فوراً اور غلطی سے پاک کیلکولیشن کی جا سکے۔وہ اس مشین کو 'ڈفرنس انجن' کا نام دیتا تھا۔ یہ مشین دراصل ریاضی کے ایک طریقے جسے 'فائی نائٹ ڈفرنسز' کہا جاتا ہے کی بنیاد پر بنائی جاتی تھی۔اس پندرہ ٹن وزنی مشین کے پچیس ہزار پرزے بننے تھے۔ چارلس اس مشین کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔اس مشین کے کچھ حصے آجکل آکسفورڈ میوزیم آف ہسٹری آف سائنس میں موجود ہیں۔اس کے بعد اس نے اسی مشین کی ایک ترقی یافتہ شکل پر کام کرنا شروع کیا۔لیکن دوسری مشین بھی مکمل نہ ہو سکی۔اس کی دوسری مشین ۱۹۹۰ء میں عین چارلس کے اصلی ڈیزائن کے مطابق بنائی گی ہے اور اس مشین نے حیرت انگیز طور پر انتہائی پیچیدہ کیکولیشن درست طریقے سے مکمل کی ہے۔جس سے چارلس کے اصلی ڈیزائن کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا ہے۔

دو مشینوں کو مکمل کئے بغیر، چارلس نے تیسری مشین پر کام کرنا شروع کیا۔جس کا نام اس

UrduDost Library UrduDost.com

نے تجزیاتی انجن رکھا۔اس مشین میں سوراخوں والے کارڈز کے استعمال سے کیلکولیشن کی جاسکتی تھی۔دراصل یہ مشین ابتداء میں بنائے گئے مکینیکل کیلکو لیٹر کی بنیاد بنی تھی اوراسی کی بنیاد پر کمپیوٹر کے ابتدائی ڈیزائن بنائے گئے تھے۔اس لئے بجا طور پر چارلس بیبج کو کمپیوٹر کا بانی کہا جاسکتا ہے۔اسکے علاوہ اس نے ڈائنیمو میٹر کار بھی ایجاد کی تھی۔ جو ریلوے نظام میں استعمال کی جاتی تھی۔ چارلس اپنے عہد میں 'لیوکاسین پروفیسر آف میتھ میٹکس' بھی رہا ہے۔ یہ پروفیسرشپ دنیا بھر میں انتہائی ممتاز سمجھی جاتی ہے اور پوری دنیا کے پروفیسروں کا خواب ہوتی ہے۔ یہ پروفیسر شپ ۱۶۶۳ء میں برٹش پارلیمنٹ کے رکن ہنری لوکاس نے کیمبرج میں قائم کی تھی۔لوکاس نے مرتے وقت اپنی چار ہزار کتابیں بھی یونیورسٹی کو عطیہ کردی تھیں اور وصیت کی تھی کہ لوکاسین پروفیسرشپ کے عہدیدار کو چرچ یعنی مذہبی زندگی کے حوالے سے متحرک نہیں ہونا چاہیے۔لیکن بعد میں اس وصیت پر عمل نہ کیا جاسکا۔اسی پروفیسرشپ کی آسامی پر ۱۶۶۹ء میں آئزک نیوٹن تعینات ہوا تھا۔اورحال ہی میں سٹیفن ہاکنگ اسی پروفیسرشپ سے ریٹائرڈ ہوا ہے۔۔۔چارلس بیبج کوایک اور بھی اعزاز حاصل ہے جو اسکے باقی تمام اعزازات پر بھاری ہے۔اس بھاری ترین اعزاز کا سائنسی تاریخ اور کیمبرج میں کسی کو علم نہیں۔حتیٰ کہ خود چارلس کو بھی نہیں۔آپ پہلے شخص ہیں جنہیں چارلس کے اس اعزاز کا علم ہورہا ہے۔جو بلا شبہ آپ کے لئے بھی بڑے اعزاز کی بات ہے۔وہ یہ ہے کہ چارلس کی موت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد یعنی حال ہی میں مغربی کیمبرج میں ایک ذیلی سڑک کا نام چارلس بیبج روڈ رکھا گیا ہے۔اعزاز یہ نہیں کہ ایک سڑک چارلس کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔اعزاز یہ ہے کہ اسی سڑک پر واقع انسٹیٹیوٹ فار مینوفیکچرنگ میں ہم اس وقت مطالعہ وتحقیق میں مصروف ہیں۔یقیناً چارلس کی روح اس اعزاز پر ازحد مسرور ہوگی۔۔۔

چارلس کی کئی عادات بڑی عجیب وغریب اور دلچسپ تھیں۔وہ عام لوگوں اور ہجوم کو سخت ناپسند کرتا تھا۔بات صرف ناپسندیدگی تک رہتی تو قابلِ ذکر نہ ہوتی۔اس نے ایک تحقیقی پرچہ گلی، محلے کے بدتہذیبی پرمبنی واقعات پرتحریر کیا۔جس میں اس نے ساٹھ ایام میں اپنے مشاہدے میں آنے والے اسّی چھوٹے موٹے واقعات تحریر کئے ہیں۔ جو سائنس میں لطیفے ٹانکنے کے مترادف ہے۔ وہ گلی،

UrduDost Library UrduDost.com

محلے میں بجنے والی موسیقی کا بھی شاکی تھا اور گاہے بگاہے گلیوں میں گانے بجانے والوں سے جھگڑتا رہتا تھا۔'ہُوپ رولنگ' یعنی گلی محلوں میں لکڑی اور دھات کے گول پہیے چلانا، بچوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ عام طور پر گلیوں میں بچے پرانی سائیکلوں وغیرہ کے پہیے بھگاتے پھرتے ہیں۔ اس کھیل کے بارے میں ہم غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ یہ ایک ناشائستہ قسم کا کھیل ہے جو ہمارے ہاں ان پڑھ اور پسماندہ گھروں کے بچے گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کھیل یورپ، افریقہ، ایشیا سمیت پوری دنیا کے بچے کھیلتے ہیں۔ اور یہ قدیم چین اور یونان کے زمانے سے کھیلا جانے والا کھیل ہے۔ چارلس نے ۱۸۶۰ء میں اس کھیل کے خلاف ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ بچوں پر الزام لگاتا تھا کہ وہ یہ کھیل کھیلتے ہوئے اپنے گول پہیے سڑکوں پر چلنے والے گھوڑوں کی ٹانگوں کے درمیان دھکیل دیتے ہیں جس سے گھڑ سوار نیچے گر سکتا ہے اور گھوڑے کو چوٹیں آسکتی ہیں۔ اسے اس مہم سے کافی 'شہرت' حاصل ہوئی اور نوبت ایں جا رسید کہ ہاؤس آف کامنز میں ۱۸۶۴ء میں اس کو اس مہم کے حوالے سے ملعون کیا گیا۔ چارلس اس عزت افزائی کے بعد بھی خاموشی سے نہیں بیٹھا۔ پھر اس نے مشہور شاعر 'الفریڈ ٹائی سن' کو اسکی مشہور نظم 'تصورِ گناہ' کے بارے میں خط لکھا۔ جس میں اس نے شاعر سے ارشاد فرمایا۔ کہ تمہاری یہ نظم شاندار ہے مگر اس کے ایک شعر میں تم سے سہو ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ تم نے لکھا ہے کہ ہر لمحہ ایک شخص اس جہان میں آتا ہے اور ایک شخص یہاں سے چلا جاتا ہے۔ اگر تمہاری بات درست مان لی جائے تو دنیا کی کل آبادی میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ایک آ گیا اور دوسرا چلا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی آبادی میں تھوڑا سا، زیادہ نہیں، اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے میں تمہیں تجویز کروں گا کہ اگلی اشاعت میں اپنی نظم میں تم ایک ترمیم کر لو۔ وہ یہ کہ اس جہان سے ہر لمحہ ایک شخص جاتا ہے اور ایک جمع ایک بٹا سولہ اشخاص آتے ہیں۔ اس ایک جمع ایک بٹا سولہ کہنے سے تمہاری بات درست کہلائے گی۔۔۔۔ لاحول ولا قوہ، یعنی شاعری نہ ہوئی شماریاتِ آبادی کا گوشوارہ ہوا۔ شاعری تو بہترین تخیل کا شاندار طرزِ بیان ہوا کرتی ہے نہ کہ ریاضی کا سمجھ میں نہ آنے والا خشک کلیہ۔ خوش قسمتی سے چارلس مغرب میں پیدا ہوا۔ اگر کہیں اس کا پالا مشرقی شعری روایات

UrduDost Library UrduDost.com

سے پڑا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ کیسے محبوب کے کالک سے لدے ہوئے چہرے کو رشکِ ماہتاب قرار دے کر اس پر موجود پیدائشی موکے کو حاصل کائنات قرار دیا جاتا ہے۔

پیٹر ہاؤس کے ایک اور مایہ ناز سپوت کا نام ہنری کیونڈِش ہے۔ وہ ۱۷۳۱ء میں فرانس میں ایک متمول اور ممتاز گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں پیٹر ہاؤس میں داخل ہوا اور چار سال وہاں گزارنے کے بعد بغیر ڈگری حاصل کئے رخصت ہو گیا۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جس نے دنیائے سائنس میں عظیم کارنامے سرانجام دیے ہیں، وہ اپنے کالج میں ناکام ہی رہا ہے۔ لیکن یہ شرط تو ہمارے کئی احباب بھی پوری کر چکے ہیں جو کم از کم موجودہ جنم میں سائنس تو کیا کسی بھی کام میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پائے لیکن امکان غالب ہے کہ وہ مزید سات جنم تک دنیا میں بھیجے جائیں گے تاوقتیکہ وہ کوئی ڈھنگ کا کام سرانجام دے دیں یا پھر۔۔۔ ان کے جنموں کا کوٹہ ہی پورا ہو جائے۔۔۔ کیونڈِش خاموش طبع، تنہائی پسند اور شرمیلا انسان تھا۔ شرمیلا اس قدر کہ وہ اپنی گھریلو خواتین ملازماؤں سے لکھ کر بات چیت کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے پچھواڑے میں بالائی منزل میں جانے کے لئے زینہ بنوایا ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی گھریلو ملازماؤں کے ساتھ زیادہ تعامل سے گھبراتا تھا۔۔۔ گوروں میں اس طرح کی نظیر شائد ہی کہیں اور ملے گی۔ وگرنہ عام طور پر گھریلو ملازمائیں تو کیا، وہ راہ چلتی ہوئی خواتین کے ساتھ ایسی گفت وشنید اور حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں کہ شرفاء کے کانوں کی لوویئں لال ہو جاتی ہیں۔۔۔ کیونڈِش نے کئی سائنسی کارنامے سرانجام دیے۔ اس نے سب سے پہلے ہائیڈروجن گیس دریافت کی۔ اس گیس کو وہ آتش گیر ہوا کا نام دیتا تھا۔ وہ مشہورِ زمانہ 'کیونڈِش تجربہ' کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے۔ اسی تجربے کے ذریعے سب سے پہلے کششِ ثقل کا پتہ چلا تھا۔ اسی تجربے کی بنیاد پر اس نے زمین کی ثقافت اور کمیت معلوم کی تھی۔ اس نے برقیات کے میدان میں بھی بنیادی نوعیت کی دریافتیں کی تھیں۔ جس کی ایک مثال کپیسٹر (Capacitor) ہے۔ اس نے 'اوہم، چارلس اور کولمب کے قوانین' بھی وضع کر لئے تھے مگر اپنی شرمیلی فطرت کے باعث، اس نے اپنے قریبی رفقاء سے بھی ان کا ذکر نہ کیا۔۔۔ ہمارے ہاں پروفیسر اور سائنسدان دھڑلے سے دوسروں کی دریافتوں، ایجادات اور

UrduDost Library UrduDost.com

تحقیقی مقالہ جات کا سرقہ کرتے ہیں۔انہی کی بنیاد پر ترقیاں اور انعامات بھی وصول کرتے ہیں۔ کاش یہ تکنیک کیونڈِش کو بھی معلوم ہوتی۔اور وہ بھی ہمارے سائنسدانوں اور پروفیسروں جیسا صاحبِ علم وفن ہوتا۔۔۔کیونڈِش کے نام ہی سے کیمبرج یونیورسٹی میں مشہورِ زمانہ 'کیونڈِش لیبارٹری' قائم کی گئی تھی۔اس کے بہت سارے سائنسی وعلمی کارناموں کے بارے میں بہت برسوں بعد کلرک میکس ویل نے دنیا کو آگاہ کیا تھا۔۔۔کلرک میکس ویل کا نام سنتے ہی ہمیں اپنے ہاں قدم قدم پر پائے جانے کلرک یاد آتے ہیں۔وہ تمام کلرک جنہیں مل کر آپ کا عذابِ جہنم پر ایمان پختہ ہوجاتا ہے۔جنھوں نے محض سو، پچاس روپے ہتھیانے کے لئے نظامِ عالم میں رخنہ اندازی ڈالنے کی قسم اٹھا رکھی ہوتی ہے۔وہ جو میر وغالب کی غزل پر بھی اعتراضی تحریر لکھ کر اسے دائرہ شاعری سے خارج کرواسکتے ہیں۔۔۔کلرک میکس ویل کا پورا نام جیمز کلرک میکس ویل تھا۔

وہ ۱۸۳۱ء میں انڈیا سٹریٹ۔سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔کیونڈِش کی طرح وہ بھی پیٹر ہاؤس کالج سے وابستہ رہا۔لیکن تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ فیلوشپ حاصل کرنے کی غرض سے ٹرینٹی کالج منتقل ہوگیا تھا۔میکس ویل کا سب سے بڑا سائنسی کارنامہ 'برقی مقناطیسیت کا نظریہ' ہے۔اس نظریے سے پہلے طبیعات کے مختلف مشاہدات، تجربات اور مساواتوں کا آپس میں تعلق معلوم نہیں تھا۔اس نظریے نے مختلف طبیعاتی مظاہر کے درمیان تعلق واضع کیا تھا۔میکس ویل نے ۱۸۶۱ء میں پہلی مرتبہ رنگین تصویر بھی ایجاد کی تھی۔اس کے علاوہ اُس نے 'گیسوں کا حرکی نظریہ' اور 'میکس ویل۔بولٹز مین تقسیم' بھی وضع کی تھی۔جس کی بنیاد پر بیسویں صدی میں 'کوانٹم میکینکس' اور 'مخصوص اضافیت' کے نظریات بنے تھے جنھوں نے پوری سائنسی دنیا ہی بدل کر رکھ دی تھی۔سائنسی تاریخ کے ماہرین کے مطابق میکس ویل سائنس کے میدان میں نیوٹن اور آئن سٹائن کے برابر اہمیت رکھتا ہے۔

کیلون، بیبج، کیونڈِش اور میکس ویل کے تذکرے کے بعد آپ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ پیٹر ہاؤس دراصل سائنسدانوں کی آماجگاہ ہے جس میں رہتے ہوئے آپ سائنس جیسی محیرالعقل چیز سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔لیکن اسی پیٹر ہاؤس نے غیر سائنسی میدانوں میں بھی قابل

UrduDost Library UrduDost.com

قدر شخصیات پیدا کی ہیں۔ مثال کے طور پر گرافٹن کا تیسرا ڈیوک، آگسٹس فٹزوری جو ۱۷۶۸ء میں محض تینتیس برس کی عمر میں وزیرِاعظم برطانیہ بنا۔ اس کے علاوہ ماضی قریب کا مشہور ناول نگار، شاعر، تنقید نگار اور استاد 'کنگسں لے ایمس' بھی پیٹر ہاؤس کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ اس نے بیس عدد ناول، چھ شاعری کی کتابیں، متعدد افسانے، کہانیاں اور یادداشتیں تحریر کی ہیں۔ وہ ٹی۔ وی کے لئے سکرپٹ بھی لکھتا رہا ہے۔ ادبی دنیا میں پیٹر ہاؤس کا ممتاز شاگرد 'تھامس گرے' ہے۔ وہ ۱۷۱۶ء میں لندن میں پیدا ہوا اور حصول تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی کے کئی کالجوں سے وابستہ رہا۔ اسے انگریزی ادب میں اعلیٰ پائے کا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت کم لکھنے کو ترجیح دی۔ دراصل وہ غیر معیاری چیز لکھے جانے کے خوف میں مبتلا رہتا تھا۔ اسی لئے گمان ہے کہ اُس نے اپنی لکھی ہوئی کئی تحریریں منظرِ عام پر نہیں آنے دیں۔۔۔ ہمارے ہاں بھی ادب میں ایسی شخصیات موجود ہیں جنہوں نے کم لکھا۔ لیکن اسقدر معیاری لکھا کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ غالب کے اردو اشعار تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ نہیں ہیں، لیکن شائد ہی کوئی دوسرا شاعر اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اسی طرح پطرس بھی تھے۔ ان کے لکھے ہوئے مزاحیہ مضامین تعداد میں کم مگر معیار میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔۔۔ تھامس گرے کی نظم 'دیہاتی گرجا گھر کے قبرستان میں لکھا گیا نوحہ' انگریزی ادب کا شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ یہ نظم اسقدر مقبول ہے کہ انگریزی اور دوسرے یورپی ادب میں متعدد بار اسکی تقلید کی گئی ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں پیٹر ہاؤس کے بعد دوسرا قدیم ترین کالج 'کلیئر کالج' ہے۔ اسکی بنیاد ۱۳۲۶ء میں یونیورسٹی کے چانسلر نے رکھی تھی۔ بنیادی طور پر یہ کالج صرف دو لوگوں کی رہائش گاہ کے طور پر ایک عمارت میں بنایا گیا تھا اور اسے یونیورسٹی ہال کا نام دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں برطانیہ کے مشہور بادشاہ ایڈورڈ اول کی پڑپوتی نے اس کالج کے لئے عطیہ کے طور پر رقم دی تھی جس کی مدد سے اس کالج میں توسیع ممکن ہوئی تھی۔ جس کے بعد اس میں بیس فیلوز اور دس طلباء کے قیام پذیر ہونے کی گنجائش بن گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا نام کلیئر ہال کالج رکھ دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں ہال کا لفظ اس کے نام سے ہٹا دیا گیا تھا اور اس کا نام صرف کلیئر کالج ہو گیا تھا۔ کیمبرج

UrduDost Library UrduDost.com

یونیورسٹی میں اس وقت بھی ایک کلئیر ہال کالج موجود ہے۔ جو دراصل کلئیر کالج نے ہی پوسٹ گریجویٹ کالج کے طور پر ۱۹۶۶ء میں بنایا تھا۔کلئیر کالج کی موجودہ عمارت سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں بنائی گئی تھی۔ اس عمارت کی تکمیل قریباً اسّی برس میں ہوئی تھی۔ کیونکہ اسی دور میں برطانیہ میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی۔کلئیر کالج کا دریائے کیم پر موجود پُل کیمبرج میں موجود تمام پلوں میں سب سے پرانا ہے۔ یہ پُل کیمبرج کی پرانی عمارت، جسے اولڈ کورٹ کہا جاتا ہے،کو ایک نئی عمارت جسے میموریل کورٹ کہا جاتا سے ملاتا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۹ء میں ایک نئی عمارت بھی تعمیر کی گئی ہے جس کا نام لرنر کورٹ رکھا گیا ہے۔کلئیر کالج کو عام طور پر قدرے ترقی پسند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ان کالجوں میں سے ہے جنہوں نے خواتین کے داخلے کے حوالے سے ستر کی دہائی میں اقدامات کئیے تھے۔اس کے علاوہ یہ کالج اپنے 'کوائر' کے وجہ سے بہت معروف ہے۔ کوائر دراصل گرجا گھروں میں مذہبی گیت گانے کے لئے ہوتا ہے اور اس میں بہت سارے گلوکار بیک وقت گیت گاتے ہیں۔اس کو ہم گوروں کی قوالی کہہ سکتے ہیں۔کلئیر کالج سے تعلیم پانے والے ممتاز لوگوں میں تھامس ٹاؤنشنڈ، فرسٹ وسکاؤنٹ سڈنی شامل ہے۔ سڈنی ۱۷۳۳ء میں پیدا ہوا اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں، جب سلطنت برطانیہ اپنے عروج پر تھی، کئی انتہائی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہا۔آسٹریلیا کے مشہور شہر سڈنی کا نام اسی کے نام پر رکھا گیا تھا۔اس کے علاوہ کینیڈا میں نو واسکاٹیا نامی صوبے میں بھی سڈنی نام کا شہر آباد ہے جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کا تیسرا اقدیم ترین کالج 'پمبروک کالج' ہے۔ یہ کالج ۱۳۴۷ء میں کرسمس کے موقع پر ایڈورڈ سوئم کے اجازت نامے کے بعد قائم ہوا تھا۔ابتدائی دنوں میں اس کالج میں ان طلبآ کو داخلے میں ترجیح دی جاتی تھی جو فرانس میں پیدا ہوئے ہوں لیکن انہوں نے تعلیم برطانیہ میں حاصل کی ہو۔اس کے علاوہ طلباء کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ اپنے ساتھی طلباء پر نظر رکھیں کہ وہ زیادہ مے نوشی نہ کریں اور بدنام گلی محلوں کا رخ نہ کریں۔اس کالج کا چیپل یعنی گرجا گھر ۱۳۵۵ء میں تعمیر ہوا تھا۔اس کالج کی عمارت وقت کے ساتھ ساتھ ازسرِنو تعمیر کی جاتی رہی ہے۔لیکن اسکا گیٹ ہاؤس آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔اس میں ۱۸۷۱ء میں فرانسیسی طرز کی سرخ

UrduDost Library UrduDost.com

عمارات بھی تعمیر ہوئی ہیں۔اس کالج کا امتیاز یہ ہے کہ یہ بین الاقوامی طلباء کو مختصر مدت یعنی ایک ٹرم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔اس قسم کی سہولت اب ترقی یافتہ دنیا کی اکثر یونیورسٹیاں فراہم کررہی ہیں۔لیکن کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کا طریقہ کار مختلف ہے۔کیونکہ یہ دونوں آج بھی بنیادی طور پر رہائشی یونیورسٹیاں ہیں۔پمبروک کالج سے تعلیم حاصل کرنے والا ’چارلس فریر اینڈریوز‘ جسے سی۔ایف۔اینڈریوز بھی کہا جاتا ہے،آزادیِ ہندوستان کے حوالے سے بہت معروف ہے۔اینڈریوز ۱۸۷۱ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا۔وہ پیشے کے لحاظ سے پادری تھا۔وہ ۱۹۰۴ء میں سینٹ سٹیفنز کالج دہلی میں پڑھانے کے لئے آیا۔وہ طبعی طور پر انسان دوست آدمی تھا۔اپنے قیامِ دہلی میں اس نے اپنی آنکھوں سے انگریز حکمرانوں کا دیسی رعایا کے ساتھ ناروا سلوک دیکھا۔وہ اس صورتحال پر کڑھتا رہتا تھا۔رفتہ رفتہ اس نے کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔وہ گوکھلے کے کہنے پر ہندوستانیوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے کے لئے جنوبی افریقہ چلا گیا۔وہاں اسکی ملاقات گاندھی سے ہوگئی۔وہ گاندھی کے فلسفہ عدمِ تشدد سے بے حد متاثر ہوا۔گاندھی کی عیسائیت کے بارے میں وسیع معلومات نے اینڈریوز کو مزید حیران کردیا۔عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے گاندھی کی ہندوستان واپسی کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کیا۔اس دوران پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر گاندھی نے سلطنتِ برطانیہ کے لئے ہندوستان سے سپاہی بھرتی کرنے کا کام شروع کردیا۔جس بناء پر اینڈریوز کے گاندھی کے ساتھ تعلقات متاثر ہوگئے۔کیونکہ اس کے خیال میں جنگ کے لئے سپاہی بھرتی کرنا عدمِ تشدد کے فلسفے کی نفی تھا۔بعدازاں اس کے گاندھی کے ساتھ تعلقات معمول پر آگئے۔اس کے علاوہ اینڈریوز آل انڈیا ٹریڈ یونین کا صدر بھی رہا۔لندن میں منعقدہ پہلی گول میز کانفرنس میں اینڈریوز نے ہندوستان کے حقِ آزادی کے حوالے سے گاندھی کی معاونت بھی کی تھی۔۱۹۳۵ء میں گاندھی نے اینڈریوز سمیت دوسرے ایسے انگریزوں کو،جو ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشاں تھے، مشورہ دیا کہ وقت آگیا ہے کہ وہ لوگ ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے لاتعلق ہوجائیں اور آزادی کی باقیماندہ جنگ صرف ہندوستانیوں کو لڑنے دیں۔اینڈریوز نے گاندھی کے مشورے پر عمل

UrduDost Library UrduDost.com

کرتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں اپنا زیادہ وقت انگلینڈ میں گزارنا شروع کر دیا۔لیکن ہندوستان سے محبت ۱۹۴۰ء میں اسے دوبارہ کھینچ کر یہاں لے آئی جہاں وہ اپنے دورہ کلکتہ کے دوران فوت ہو گیا اور وہیں دفن ہو گیا۔ ہندوستان میں آج بھی اسے انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پمبروک کالج کے ایک اور سپوت کا نام 'ولیم پِٹ۔ دی ینگر' ہے۔وہ ۱۷۸۳ء میں محض چوبیس سال کی نوخیز عمر میں وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا اور اب تک برطانیہ کا سب سے کم سن وزیراعظم سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ۱۷۷۳ء میں چودہ سال کی عمر میں پمبروک کالج میں داخلہ لیا اور فلسفہ، ریاضی، کیمیا اور تاریخ کے مضامین میں تعلیم حاصل کی۔اس کے عہد میں انقلابِ فرانس برپا ہوا تھا جس کے اثرات پورے یورپ پر مرتب ہوئے تھے۔پمبروک کالج نے انیسویں صدی میں ایک ایسے طالبعلم کی تعلیم و تربیت بھی کی جس نے آنے والوں برسوں میں کیمبرج یونیورسٹی کی شان و شوکت میں بے حد اضافہ کیا۔اس طالبعلم کا نام سر جارج سٹوک ہے۔سٹوک ایک ممتاز ماہر ریاضی و طبیعات تھا۔وہ کیمبرج یونیورسٹی کا واحد شخص ہے جو بیک وقت لیوکاسین پروفیسر آف میتھ میٹکس، ممبر برطانوی پارلیمنٹ اور رائل سوسائٹی کا صدر رہا ہے۔اس کے علاوہ یہ اعزاز نیوٹن کے پاس بھی ہے لیکن نیوٹن ایک ہی وقت میں ان تینوں عہدوں پر فائز نہیں رہا۔میکس ویل، کیلون اور سٹوک تین ایسے افراد ہیں جنہوں نے اپنی بے پناہ سائنسی خدمات کی بناء پر کیمبرج کا نام روشن کیا ہے۔سٹوک نے مائع حرکیات، روشنی، پولرائزیشن اور انجینئرنگ کے میدانوں میں حیرت انگیز انکشافات کیے۔اس کے بنائے ہوئے کلئے آج بھی سائنس اور انجینئرنگ میں اعتماد کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔ پمبروک کالج نے انگریزی ادب کو 'ایڈمنڈ سپنسر' جیسا شاعر بھی دیا ہے۔سپنسر سولھویں صدی کے وسط میں لندن میں پیدا ہوا۔اسے انگریزی کا مایہ ناز شاعر تسلیم کیا جاتا ہے جس نے جدید انگریزی نظم کی آبیاری کی ہے۔اس نے انگریزی نظم کو ایک نئی ساخت دی تھی۔اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ انگریزی زبان میں محاوروں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ اس کی ایک اور وجہِ شہرت بھی ہے۔اس نے اپنی زندگی میں ایک نثری مسودہ تحریر کیا تھا۔ یہ مسودہ آئرلینڈ پر انگریزوں کے تسلط کے موضوع پر تھا۔مسودے کے مندرجات انتہائی

UrduDost Library UrduDost.com

اشتعال انگیز تھے اسی لیے اسکی اشاعت سپنسر کی موت کے بعد کی گئی تھی۔ اُس نے اپنے مسودے میں تجویز کیا تھا کہ آئر لینڈ پر برطانوی انگریزوں کا تسلط صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ آئر لینڈ کی دیسی زبانوں اور رسوم ورواج کو صفحہ ہستی سے کلیتاً مٹا دیا جائے۔ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کے لئے ہر قسم کے ظالمانہ اقدامات بروئے کار لانا چاہیے جن میں وسیع پیمانے پر مقامی آبادی کا قتل عام بھی شامل ہے۔ بعد میں آنے والے مورخین اور تجزیہ نگاروں نے سپنسر کے تجزیے کو ناقص اور سطحی قرار دیا تھا۔۔۔ انسانی تاریخ کے ہر موڑ پر طاقتور اور تسلط جمانے کی خواہشمند قوتیں ایسے ہی اقدامات کرتی رہی ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کا چوتھا قدیم ترین کالج 'گونویل اینڈ کیز کالج' ہے۔ اس کالج کی بنیاد ۱۳۴۸ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ کالج کیمبرج یونیورسٹی کے امیر ترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیمبرج شہر کی بیشتر اراضی اور سڑکیں وغیرہ اسی کالج کی ملکیت ہیں۔ اس کالج کو عام طور پر روایت پسند تصور کیا جاتا ہے۔ آج بھی اس کالج کی رسمی ضیافتوں میں طلباء کی حاضری لازمی قرار دی جاتی ہے۔ ضیافتیں عام طور پر دو مراحل پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جن میں دوسرا مرحلہ زیادہ رسمی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں گاؤن پہننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کھانے سے قبل فیلوز کی آمد پر تمام طلباء کو اپنی نشستوں پر احتراماً کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ہر تعلیمی ٹرم کے اختتام پر تمام سٹوڈنٹس کو تعطیلات کے لئے کالج چھوڑنے سے پہلے اپنے اساتذہ سے رخصت لینا ہوتی ہے۔۔۔ معاشیات، انگریزی ادب اور بالخصوص طب کے میدان میں یہ کالج عالمی شہرت کا حامل ہے۔ آج تک اس کالج سے منسلک بارہ افراد نوبل انعام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کیمبرج یونیورسٹی میں سوائے ٹرینیٹی کالج کے باقی تمام کالجوں سے زیادہ تعداد ہے۔ کالج کی لائبریری کا شمار کیمبرج میں موجود بہترین کتب خانوں میں کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے معروف صنعت کار سر دراب جی ٹاٹا گونویل اینڈ کیز کالج میں زیرِ تعلیم رہے ہیں۔ وہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ کیمبرج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ گئے اور اپنے خاندانی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے ہندوستان میں سٹیل اور توانائی کی

UrduDost Library UrduDost.com

پیداوار کی صنعتوں کی بنیاد رکھی تھی۔ عہدِ حاضر میں موجود عظیم ٹاٹا انڈسٹریل ایمپائر انہی کی قائم کی گئی صنعتوں سے وجود میں آئی ہے۔ کارخانے لگانے کے علاوہ وہ سائنسی تحقیق، کھیلوں کے فروغ اور دیگر فلاحی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے انڈین اولمپک ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور ۱۹۲۴ء میں پیرس میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی اولمپک کھیلوں میں شرکت کے لئے ہندوستانی دستے کو وسائل فراہم کئے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا شہرہ آفاق انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس، بنگلور بھی انہی کا قائم کردہ ہے۔ دراب جی ٹاٹا نے اپنی بیوی کی یاد میں دراب جی ٹاٹا ٹرسٹ قائم کیا تھا جو سائنسی تحقیق اور دیگر فلاحی کاموں کے لئے وقف ہے۔ گونویل اینڈ کیز کالج سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں ممتاز ہندوستانی سائنسدان ہومی۔ جے۔ بھابھی شامل ہیں۔ جو جوہری طبیعات کے ماہر تھے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ممتاز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے قائدِ اعظم کے خاندان کے ساتھ قریبی روابط تھے۔ انہوں نے مکینیکل انجینئرنگ اور ریاضی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیوِنڈِش لیبارٹری سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کے ایٹمی کمیشن کی بنیاد بھی رکھی تھی جس بناء پر انہیں ہندوستان کے ایٹمی پروگرام کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۶۶ء میں بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی کی ایک میٹنگ میں شرکت کی غرض سے آسٹریا جارہے تھے کہ ان کا جہاز حادثے کا شکار ہوگیا جس میں وہ فوت ہوگئے۔ ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ہندوستانی جوہری تحقیقی مرکز کو بھابھا جوہری تحقیقی مرکز کا نام دے دیا گیا تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں الیکٹرونکس، خلائی تحقیق، مائیکرو بیالوجی اور دیگر جدید موضوعات پر تحقیق کے آغاز کے لئے جدوجہد کی تھی۔ گونویل اینڈ کیز کالج کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے والے 'ہیرالڈ جیلیز' نے پہلی مرتبہ دنیا میں پلاسٹک سرجری متعارف کروائی تھی۔ جیلیز ۱۸۸۲ء میں نیوزی لینڈ میں پیدا ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران وہ رائل آرمی میڈیکل کور میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اس نے کیمبرج کے کوئینز ہسپتال میں جنگی محاذوں پر زخمی ہونے والے سپاہیوں کے چہروں کی پلاسٹک سرجری کر کے انہیں اپنی اصلی حالت میں بحال کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اس نے ۱۹۴۶ء میں دنیا کا پہلا تبدیلیِ جنس

UrduDost Library UrduDost.com

کا آپریشن کیا تھا۔اس آپریشن کے ذریعے ایک خاتون کو مرد بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔اسی طرح اُس نے ۱۹۵۱ء میں ایک دوسرے تبدیلیِ جنس کے آپریشن کے ذریعے ایک مرد کو عورت بنانے کا بیڑہ بھی اٹھایا تھا۔۔۔جیلیز اپنے تبدیلیِ جنس کے انقلابی آپریشنوں میں کس قدر کامیاب ہو سکا۔ اس کا علم اسے خود ہو یا نہ ہو لیکن ان افراد کو ضرور ہو گا جو پہلی مرتبہ اس کے نشتر کی زد میں آئے ہوں گے۔ پلاسٹک سرجری ایک شاندار ایجاد ہے۔پوری دنیا میں شوبز سے منسلک افراد طرح طرح کے آپریشن کروا کر اپنے آپ کو جوان، پرکشش اور خوبصورت بنانے اور خوبصورتی قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے اداکار اور اداکارائیں بھی چوری چھپے دبئ، یورپ، امریکہ وغیرہ سے پلاسٹک سرجری کروانے کے بعد محض ساٹھ سے ستر برس کی عمر میں ہیرو اور ہیروئن کے طور پر اداکاری کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ناک، ہونٹ، پلکیں، ٹھوڑی، رخسار اور بعض اوقات پورے چہرے کی سرجری بغرضِ خوبصورتی کروائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ کچھ افراد اپنے پیٹ، ٹانگیں اور سینہ بھی اسی تکنیک کے ذریعے پرکشش بناتے ہیں۔۔۔دورِ حاضر میں جس سائنسدان کو شہرت کی معراج نصیب ہوئی ہے، اس کا نام سٹیفن ہاکنگ ہے۔ ہاکنگ، گونویل اینڈ کیز کالج کا فیلو ہے۔ وہ ۱۹۴۲ء میں آکسفورڈ، انگلینڈ میں پیدا ہوا۔اس نے ۱۹۶۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔اس کا بنیادی میدانِ تعلیم ریاضی اور طبیعات ہے۔ اس کی تعلیم و جستجو کا مرکز کائنات اور اس کی تخلیق و ارتقاء رہا ہے۔وہ مزید تعلیم حاصل کرنے آکسفورڈ سے ٹرینیٹی ہال، کیمبرج آ گیا۔ اسے ابھی کیمبرج آئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ وہ amyotrophic lateral sclerosis نامی بیماری کا شکار ہو گیا۔اس بیماری نے رفتہ رفتہ اسے مکمل طور پر مفلوج کر دیا ہے۔وہ خود چل پھر سکتا ہے نہ کھا پی سکتا ہے۔ جب بیماری زیادہ بگڑی تو اسکی قوتِ گویائی بھی ختم ہو گئی۔کیمبرج یونیورسٹی کے ایک سائنسدان نے اس کے لئے ایک خاص کمپیوٹر بنایا ہے جس کی مدد سے اسکے بولے ہوئے لفظوں کو لکھا جا سکتا ہے۔اس نے کائنات کی تخلیق کے معمے کو سلجھانے کے لئے 'بگ بینگ نظریہ' وضع کیا ہے۔جس کے مطابق کائنات ایک بہت بڑے دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔اس نے کائنات میں موجود 'بلیک ہولز' کی

UrduDost Library UrduDost.com

ماہیت پر بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اسکی کتاب 'وقت کی مختصر تاریخ' سب سے زیادہ بکنے والی کتاب رہی ہے۔ وہ۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۹ء تک تیس سال تک کیمبرج یونیورسٹی میں لیو کاسین پروفیسر آف میتھ میٹکس رہا ہے۔ ہاکنگ نے ۱۹۶۵ء میں پہلی شادی کی تھی۔ ۱۹۹۱ء میں اسکی بیوی نے اسکی شہرت اور معذوری سے تنگ آکر اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ہاکنگ کی دیکھ بال کے لئے کئی نرسیں متعین رہی ہیں۔ اس نے اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی کے بعد انہی نرسوں میں سے ایک کے ساتھ شادی کرلی۔ اُس نرس کی یہ دوسری شادی ہے۔ یہ نرس ہاکنگ سے پہلے اُس کمپیوٹر سائنسدان کی بیوی تھی جس نے ہاکنگ کے لئے مخصوص کمپیوٹر بنایا تھا جس کی مدد سے وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں ہاکنگ نے اپنی دوسری بیوی سے طلاق کی خاطر عدالت سے رجوع کیا تھا کیونکہ اسکی دوسری بیوی کا اس کے ساتھ رویہ درست نہیں ہے اور وہ اسے گالیاں دیتی ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں وبائی امراض پھوٹ پڑے تھے۔ دراصل یہ وبا وسطی ایشیاء سے یورپ منتقل ہوئی تھی۔ ان وبائی امراض کی وجہ سے یورپ کی تقریباً نصف آبادی لقمہ ءاجل بن گئی تھی۔ اس واقعے کو برطانیہ میں بلیک ڈیتھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وبائی امراض کی وجہ سے صرف یورپ میں دس سے بارہ کروڑ افراد موت کا شکار ہوئے تھے۔ دیگر یورپی شہروں کی طرح کیمبرج میں بھی وسیع پیمانے پر انسانی اموات ہوئی تھیں۔ اسی واقعے کی وجہ سے کیمبرج میں ایک درسگاہ بند ہوگئی تھی۔ جس کے ردِعمل کے طور پر ۱۳۵۲ء میں مقامی آبادی نے کیمبرج میں ایک نئے کالج کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام 'کورپس کرسٹی کالج' ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی اسی نام سے ایک کالج ہے۔ یہ دونوں کالج آپس میں 'سسٹر کالج' کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان دونوں کالجوں کے فٹ بال، رگبی، کشتی رانی اور دیگر کھیلوں میں بڑے پُر جوش مقابلے ہوتے ہیں۔ ابتداء میں اس کالج میں بے سروسامانی کا عالم تھا۔ ۱۳۷۶ء میں کالج کے پاس صرف پچپن کتابیں موجود تھیں۔ ۱۳۸۱ء میں برطانوی کسانوں نے بغاوت کردی تھی۔ اس باغیانہ تحریک کے دوران کورپس کرسٹی کالج کی عمارت کو نقصان پہنچایا گیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ کالج مذہبی خیالات

UrduDost Library UrduDost.com

کا حامل رہا ہے۔اس سے منسلک افراد عملی زندگی میں مذہبی علماء کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔۱۶۸۸ء میں عیسائی کیتھولک فرقے کے خلاف ایک ہجوم نے جلوس نکالا جس کے دوران اس کالج پر دھاوا بول دیا گیا کیونکہ ہجوم میں موجود افراد کا خیال تھا کہ اس کالج کے عہدیداران کیتھولک فرقے سے ہمدردی رکھتے ہیں۔وکٹورین عہد میں اس کالج میں چرچ آف انگلینڈ کی رسومات کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔۱۸۸۲ء میں اس کالج نے اپنے فیلوز کو شادی کرنے کی اجازت دے دی جبکہ اس سے پہلے وہ فیلوشپ کے دوران شادی نہیں کر سکتے تھے۔۱۹۶۰ء میں خواتین کو کالج کوائر میں حصہ لینے اور ڈائننگ روم میں کھانا کھانے کی اجازت مل گئی جبکہ ۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ خواتین کو اس کالج میں داخلہ دیا گیا تھا۔جس کے بعد خواتین کو بطور ریسرچ سکالرز اور فیلوز قبول کیا جانے لگا۔کورپس کرسٹی کالج میں چند دلچسپ کہانیاں بھی پائی جاتی ہیں۔مشہور ہے کہ یہاں کئی بھوت یا ارواح بھی رہتی ہیں۔پہلی روح 'ہنری بٹ' کی ہے۔جو ۱۶۳۰ء میں اس کالج کا ماسٹر اور یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی رہا ہے۔اس کے عہد میں یہاں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی جس کے نتیجے میں کثیر تعداد میں لوگ مارے گئے تھے۔اس بناء پر ہنری نے دلبرداشتہ ہو کر اس کالج میں خودکشی کی تھی۔خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی روح آج بھی کالج کے احاطے میں گھومتی پھرتی ہے۔۱۹۰۴ء میں کالج کے تین طلباء نے ہنری کی روح کو یہاں سے بھگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہے۔کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں انہوں نے ہنری کی آدھے انسانی جسم سے مشابہ روح کو کالج کی نئی اور پرانی عمارت کے درمیان موجود راستے پر دیکھا تھا۔اسی طرح ایک اور روح کی موجودگی کی داستان بھی سنائی جاتی ہے۔۱۶۶۷ء میں اس کالج کے ماسٹر کا نام 'جان سپنسر' تھا۔اس کی کالج میں موجود رہائش گاہ میں اس کی بیوی اور خوبرو بیٹی جس کا نام الزبتھ سپنسر تھا، بھی مقیم تھیں۔اس زمانے میں کالج میں کسی خاتون کا مقیم ہونا ایک غیر معمولی واقعہ ہوتا تھا۔'جیمز بٹس' نامی کالج کا ایک طالب علم الزبتھ کو دل دے بیٹھا۔جیمز کالج ماسٹر سے چھپ کر اس کی بیٹی سے ملنے اسی کے گھر جایا کرتا تھا۔جہاں محبّ و محبوب خوش گپیوں کے ساتھ ساتھ چائے پیا کرتے تھے۔ایک دن جیمز کی قسمت کا ستارہ چمکا۔کالج کا ماسٹر کسی کام کے

UrduDost Library UrduDost.com

سلسے میں لندن چلا گیا۔ گروہِ محبان کے نزدیک ایسے مواقع صدیوں میں نہیں بلکہ حیاتِ کائنات میں شاذ ہی آیا کرتے ہیں۔ چنانچہ جیمز دیدار و صحبتِ یار کے لئے چمنستانِ محبوب یعنی ماسٹر لاج چلا گیا۔ اسے وہاں پہنچے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ الزبتھ نے اپنے باپ کے قدموں کی چاپ سنی۔ اس کا باپ گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ وہ حد درجہ خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے فوراً جیمز کو حکم دیا کہ وہ الماری میں گھس جائے۔ بیچارہ عاشق اذنِ محبوب پر تو شائد عمل پیرا نہ ہوتا لیکن خوفِ والدِ محبوب اُس پر طاری ہو گیا اور وہ نہایت شرافت سے الماری میں گھس گیا۔ الزبتھ نے الماری کو تالا لگا دیا۔ اگلی صبح موقع پا کر جب اس نے الماری کا تالا کھولا تو جیمز کا بت اور روح جدا ہو چکے تھے۔ الزبتھ سخت دل گرفتہ ہوئی اور اس نے بالائی منزل سے زمین پر چھلانگ لگائی اور اپنے محبوب کے پاس پہنچ گئی۔ آج بھی کالج کے باسیوں کا خیال ہے کہ جیمز اور الزبتھ کرسمس کے موقع پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کالج کے احاطے اور باغیچے میں سیر کرتے ہیں۔۔۔ زمانہِ طالبعلمی میں ہمارے ہاسٹل میں بھی خودکشی کے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ہم سالِ اول کے طالب علم تھے کہ سالِ آخر کے ایک طالب علم نے فراقِ محبوب کی تاب نہ لا کر اپنے کمرے کے پنکھے سے جھول کر جان دے دی تھی۔ اس کا کمرہ آج تک ہاسٹل میں مقدس حیثیت کا حامل ہے۔ اور ہر سال آنے والا نیا گروہِ عاشقاں بروز جمعرات اس کمرے میں حاضری دیتا ہے، چراغ جلائے جاتے ہیں۔ شیرینی بانٹی جاتی ہے، آنسو بہائے جاتے ہیں۔ مکیش کے گانے سنے جاتے ہیں۔ والدین اور اعزاء واقرباء عرف سماج کے خوب لتے لئے جاتے ہیں اور پھر یہ گروہ، میس سے طعامِ شب تناول کرنے کے بعد، سینماؤں میں المیہ فلمیں دیکھ کر آہیں بھرتا ہوا اپنے کمرے میں سو جاتا ہے۔ اس گروہ کے نزدیک اس سارے عمل کے نتیجے میں اگلے ایک ہفتے کے اندر انہیں قربِ محبوب حاصل ہو جانا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہی عمل اس وقت تک دہرایا جاتا ہے۔ تاوقتیکہ انہیں محبوب مل جائے یا پھر ان کے چال چلن کی وجہ سے کالج ان سے چھٹکارا پا لے۔۔۔ کورپس کرسٹی کالج کی بیرونی دیوار میں ڈیڑھ میٹر قطر کا ایک گھڑیال نصب کیا گیا ہے۔ اس گھڑیال کو زمانہِ حاضر کی بہترین ایجاد قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی رسمِ نقاب کشائی اسی کالج کے شہرہِ آفاق ریاضی و طبیعات دان سٹیفن ہاکنگ

UrduDost Library UrduDost.com

نے کی تھی۔ یہ سٹیل کے اوپر چوبیس قیراط سونے کی ملمع کاری کر کے بنایا گیا ہے۔اس پر دس لاکھ پاونڈ سے زائد لاگت آئی ہے۔اس کے بنانے میں دوسو سے زائد انجینئر، کاریگر، مصور اور دیگر ماہرین نے حصہ لیا تھا۔اس میں سیکنڈوں، منٹوں اور گھنٹوں کو ظاہر کرنے کے لئے سوئیاں نصب نہیں کی گئی ہیں۔سوئیوں کی جگہ پر تین گول پرتیں ایک دوسرے کے اوپر چڑھائی گئی ہیں جو ایک دوسرے کے لحاظ سے حرکت کرتی ہیں، اور وقت ظاہر کرنے کے لئے اس میں سے روشنی نکلتی ہے۔ اس کے گول ڈھانچے کے اوپر ایک گھاس پر اچھلنے والا جھینگر نصب کیا گیا ہے۔ یہ جھینگر اپنا منہ کھول کر اگلی طرف حرکت کرتا ہے۔اس کی ایک حرکت دراصل ایک سیکنڈ کے برابر رکھی گئی ہے۔حرکت کے اختتام پر یہ اپنا کھلا منہ بند کر لیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے منہ سے افسردگی ظاہر ہوتی ہے۔اس کے موجد کے مطابق یہ 'وقت کھانے والا' ہے۔موجد نے اس جھینگر کے منہ میں وقت جاتا ہوا دکھانے کی کوشش کی ہے۔اور جھینگر کی اداسی و افسردگی یہ دکھاتی ہے کہ گیا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ کورپس کرسٹی کالج نے بے شمار مذہبی علماء، ناول وتنقید نگار، شاعر، سیاستدان اور دیگر شعبوں کے معروف لوگ پیدا کئے ہیں۔انہی میں 'جان فلیچر' بھی شامل ہے جو شیکسپیئر کا ہم عصر ہے۔وہ ڈرامہ نگاری میں شیکسپیئر کا ہم پلہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں رونما ہونے والے 'بلیک ڈیتھ' کے سانحے میں انگلینڈ کی قریباً نصف آبادی ہلاک ہوگئی تھی۔اس زمانے میں یورپ میں عیسائی مذہب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد چرچ اور عیسائی مذہب سے متعلق سرگرمیوں سے منسلک رہتی تھی۔عام لوگوں کی طرح، بلیک ڈیتھ کے دوران کثیر تعداد میں مذہبی علماء بھی فوت ہوئے تھے جس کے نتیجے میں زندہ رہ جانے والے مذہبی علماء میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ نئے سرے سے لوگوں اور بالخصوص نوجوانوں کو مذہبی تعلیم وتربیت دی جائے تاکہ آنے والے وقت میں مذہبی سکالرز کی کمی دور کی جاسکے۔اسی نظریے کے تحت کیمبرج میں ۱۳۵۰ء میں ایک نئے کالج کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام ٹرینیٹی ہال رکھا گیا۔ٹرینیٹی ہال، ٹرینیٹی کالج سے علیحدہ کالج ہے۔ٹرینیٹی ہال میں یہ تصور بھی عام ہے کہ ٹرینیٹی کالج کا نام اسی سے مستعار لیا گیا تھا۔

UrduDost Library UrduDost.com

بلیک ڈیتھ کے مخصوص پس منظر کی وجہ سے ٹرینیٹی ہال کا جھکاؤ مذہب کی جانب رہا ہے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی قوانین کی تعلیم پر بھی زور دیا جانے لگا۔پھر مذہبی قوانین کا دائرہ بڑھ کر قانون کی تعلیم تک جا پہنچا۔اور ٹرینیٹی ہال صدیوں تک قانون کی تعلیم کے لئے معروف ہوگیا۔زمانۂ حال میں بھی اس کی شہرت قانون کی تعلیم کی وجہ سے ہی ہے۔دورِ حاضر میں ٹرینٹی ہال سے تعلیم حاصل کرنے والے مشہور لوگوں میں 'ہانس بلکس' کا نام بھی آتا ہے۔ بلکس کا تعلق سویڈن سے ہے۔وہ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوا۔اور سویڈن کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا۔اس نے ستر کی دہائی میں سویڈن کے وزیرِ خارجہ کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں۔ بلکس کی شہرت اس وقت عروج پر پہنچی جب اسے اقوام متحدہ نے جوہری ہتھیاروں کے کمیشن کا سربراہ بنایا۔اس کو ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ عراق کے جوہری پروگرام اور وسیع ترین پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی یا عدم موجودگی کے بارے میں اقوامِ متحدہ میں اپنی رپورٹ پیش کرے۔عام خیال کیا جاتا تھا کہ امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کا عراق پر لشکر کشی کا منصوبہ بلکس کی رپورٹ پر منحصر ہوگا۔اس نے نہایت جانفشانی سے کام کرتے ہوئے ایک غیر جانبدار رپورٹ پیش کی تھی۔جسے پوری دنیا کے میڈیا نے نشر کیا تھا۔اس کی پیش کردہ رپورٹ اسکی پیشہ ورانہ قابلیت اور ایمانداری کا منہ بولتا ثبوت تھی۔بلکس نے اپنی رپورٹ میں عراق میں وسیع ترین پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔لیکن اتحادی افواج نے اس کے باوجود عراق پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ٹرینیٹی ہال سے تعلیم حاصل کرنے والا بی۔بی۔سی۔کا نمائندہ 'مارک ٹیلی' بھی ہندوستان و پاکستان میں بہت معروف رہا ہے۔پاکستان میں اس کی شہرت ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف ہونے والے احتجاج کی رپورٹنگ کی وجہ سے ہوئی۔اُس زمانے میں پورے پاکستان میں بچہ بچہ مارک ٹیلی کے نام سے واقف ہوگیا تھا۔اس نے کئی دہائیوں تک انڈیا میں سکونت اختیار کئے رکھی اور پاکستان کے علاوہ انڈیا کے متعدد انتہائی اہم واقعات کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پوری دنیا تک پہنچایا۔ ان واقعات میں ۱۹۸۴ء میں امرتسر میں سکھوں کے مقدس مذہبی مقام اکال تخت پر ہونا والا آپریشن

UrduDost Library UrduDost.com

بلیو سٹار، ھندوستان کے دو وزرائے اعظم ، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی، کا قتل اور سانحہ بابری مسجد بھی شامل ہے۔ مارک ٹیلی نے ہندوستان کی سیاست وسماجیات پر متعدد کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔اسے ہندوستان کے دواعلیٰ سول اعزازات یعنی پدم شری اور پدم بھوشن سے نوازا گیا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ماڈلین کالج کی بنیاد ۱۴۲۸ء میں رکھی گئی۔ابتداء میں یہ کالج عیسائی راہبوں اور درویشوں کے ہاسٹل کے طور پر بنایا گیا تھا۔اور اسے منصوبہ بندی کے تحت ٹاؤن سنٹر سے دور رکھا گیا تھا تا کہ یہاں قیام پذیر رہنے والے راہب اور طالبعلم خلوت نشینی کی زندگی بسر کر سکیں۔ بعد میں اس کالج کو بکنگھم کالج کے نام سے بھی جانا جاتا رہا۔۱۵۴۲ء میں اس کالج کی ازسرِنو بنیاد رکھی گئی اور اس کا نام بکنگھم کالج سے ماڈلین کالج تبدیل کر دیا گیا۔۱۷۱۴ء میں ڈینئیل واٹر لینڈ کو اس کالج کا ماسٹر تعینات کیا گیا۔اس نے اپنے عہد میں کالج کے نصاب میں کئی بنیادی تبدیلیاں کیں۔اور ریاضی۔منطق۔سائنس۔طب کے مضامین نصاب میں شامل کئے۔جس کی وجہ سے یہ کالج روایتی مذہبی مدرسے سے ترقی کر کے ایک روشن خیال درسگاہ بننے کی طرف گامزن ہوا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں افریقی باشندوں کو غلام بنا کر بیچنا کاروبار بن چکا تھا۔انگریز افریقہ سے انسانوں کو قید کر کے لاتے اور انہیں منڈیوں میں فروخت کر دیا جاتا۔جبری مشقت لینے کے علاوہ ان پر سخت ترین تشدد بھی کیا جاتا تھا۔۱۷۸۱ء میں انگریزوں نے افریقہ سے لائے گئے غلاموں کے ایک بحری جہاز کا قتلِ عام کیا تھا۔جو ایک نہایت وحشیانہ اور دل دہلا دینے والا اقدام تھا۔اسی سال ماڈلین کالج میں ایک نئے ماسٹر کا تقرر ہوا تھا جس کا نام ’پیٹر پیکرڈ‘ تھا۔ پیٹر نے افریقی غلاموں کے قتل کی مخالفت کرنا شروع کر دی اور وہ غلامی کے ادارے کی مخالفت کرنے والے ہراول دستہ میں شامل ہو گیا۔اس نے اپنی تقاریر اور تحریروں میں غلامی کے خلاف مؤثر آواز بلند کی۔اس کی بصیرت کے طفیل ماڈلین کالج ایک قدرے روشن خیال کالج بن گیا۔اسی کالج نے سب سے پہلے یہودی اور جنوب ایشیائی طالب علموں کو داخلہ دینا شروع کیا تھا۔لیکن اس کے باوجود یہاں بھی خواتین کو داخلہ نہیں دیا جاتا تھا۔ماڈلین کالج نے کیمبرج کے باقی تمام کالجوں کے بعد ۱۹۸۶ء میں پہلی مرتبہ خواتین کو کالج میں داخلہ اور رہائش فراہم کی۔ اس تاریخی واقعے کا

UrduDost Library UrduDost.com

استقبال یہاں کے طلباء نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ کر اور کالج کا پرچم سرنگوں کر کے کیا تھا۔
کیمبرج کے کئی کالجوں میں سال کے مختلف اوقات میں 'بال' کے نام سے تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ بال دراصل ایک فن فیئر یا میلہ نما تقریب ہوتی ہے۔ جس میں رسمی رقص بھی کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ رقص جوڑوں کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ ایک بڑے ہال میں بہت سارے جوڑے گھوم گھوم کر رقص کرتے ہیں۔ یہ رقص انگریزی تہذیب میں شائستگی اور آداب کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اس رقص کی تربیت لیتے ہیں اور بہتر رقص کرنے والے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ماڈلین کالج کا 'بال' کیمبرج میں بہت معروف ہے۔ اس رقص میں شرکت کے لئے سفید رنگ کی نکٹائی پہننا ضروری ہے۔ عام طور پر کیمبرج میں 'بال' کی تقریبات میں شرکت کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے جو کافی مہنگا ہوتا ہے۔۔۔ طالب علموں کا خیال ہے کہ بال میں شرکت کرنے سے علمی و روحانی سکون و بالیدگی میسر آتی ہے لیکن ان کے پاس پیسے کیمبرج کے کالجوں میں بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ تو اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ کئی انوکھی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ وہ کالجوں کی بلند و بالا دیواروں کو پھلانگتے ہیں۔ گوریلا اور جوکروں کے ملبوسات پہن کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ تقریب میں کوئی آئٹم پرفارم کرنے کے لئے مدعو کئے گئے ہیں۔ کتابی کیڑے طالبعلم، صحافی بن کر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند منچلے کالجوں کے پچھواڑے میں موجود دریائے کیم میں تیراکی کرتے ہوئے بال میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ تیراکی کے دوران اپنے ساتھ پلاسٹک کے لفافوں میں پارٹی کے ملبوسات بھی لے جاتے ہیں۔ جونہی وہ کالج کے پچھواڑے میں پہنچے، دریا سے باہر نکل کر سرِ عام لباس تبدیل کیا، اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو اسی پلاسٹک بیگ میں بند کر کے دریا میں بہایا اور کامل شریف آدمی بن کر کالج بال میں داخل ہو گئے۔ ہمارے ہاں بزرگ اور سنجیدہ لوگ خوامخواہ ان نوجوانوں کو کوستے رہتے ہیں جو کسی بھی شادی کی تقریب میں بن بلائے شرکت کرتے ہیں۔ دلہن والے انہیں باراتی اور بارات والے دلہن کا سگا بھائی سمجھتے ہیں۔ وہ بڑے مزے سے کھانا کھاتے ہیں۔ دولہا، دلہن کے ساتھ تصاویر بنواتے ہیں۔ مہمانوں اور میزبانوں سے گپ شپ کرتے ہیں

UrduDost Library UrduDost.com

اور انہیں تقریب کے انتظامات کے حوالے سے مشورے بھی دیتے ہیں۔

ماڈلین کالج سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں معروف انگریز کوہ پیما جارج میلوری بھی شامل ہے۔ وہ برطانیہ کی طرف سے مونٹ ایورسٹ سر کرنے والی پہلی تین مہمات میں شامل رہا۔ ۱۹۲۴ء میں تیسری مہم کے دوران، وہ مونٹ ایورسٹ کی چوٹی کے قریب گم ہوگیا تھا۔ اسے آخری مرتبہ چوٹی سے چند سو میٹر کے فاصلے پر دیکھا گیا تھا۔ پچھتر سال تک اس کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہ ہوسکیں۔ ۱۹۹۹ء میں برطانیہ نے ایک ٹیم مونٹ ایورسٹ روانہ کی تھی جس کا مقصد جارج اور اس کے ساتھ گم ہونے والے لوگوں اور ان کی اشیاء کی تلاش کرنا تھا۔ اس ٹیم نے بالآخر جارج کی نعش تلاش کر لی تھی۔ جارج نے ۱۹۲۴ء میں مونٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کی تھی یا نہیں، یہ موضوع ایک طویل عرصے تک کوہ پیمائی حلقوں میں زیر تحقیق رہا ہے۔ ماڈلین کالج کا ایک اور اہم شاگرد کلائیو لیوس تھا۔ وہ ایک مشہور ناول نگار اور نقاد تھا۔ اس نے بڑے عمدہ مضامین لکھے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا پروفیسر بھی رہا۔ اس کالج کو ایک اور شاگرد بھی میسر آیا جس نے اس کی شہرت میں اضافہ کیا۔ اس شاگرد کا نام انٹونی گرے ہے۔ وہ ہم جنس پرستی کا علمبردار تھا۔ اور ساری عمر ہم جنس پرستوں کے حقوق کے لئے لڑتا رہا۔ وہ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ہم جنس پارٹنر کے ساتھ پچاس برس گزارے۔ وہ اس زمانے میں ہم جنس پرستی کا قائل اور مبلغ تھا جب یورپ میں اس کی ممانعت تھی۔ اس نے برطانیہ اور پورے یورپ میں ہم جنس پرستی کے موافق قوانین بنوانے کے لئے انتھک جدوجہد کی۔ تقاریر اور تحریروں کے ذریعے لوگوں کو بدفعلی پر اکسایا۔ اس خبیث فعل کی حمایت میں قوانین بنوانے کے لئے اراکینِ پارلیمنٹ کی لابنگ کی۔ دراصل اس کے خیال میں یہ ساری جدوجہد انسانی حقوق کی جدوجہد تھی۔ وہ نظریاتی اعتبار سے ہم جنس پرستی کو انسانی حق سمجھتا تھا۔ ہم جنس پرستی کے مقبول جریدے پنک پیپر نے اسے ایواڈ سے بھی نوازا تھا۔۔۔ یورپ نے انسانی تہذیب کو آزادیِ افکار کا تصور دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزادی افکار کے بطن سے ایسے سودمند مظاہر نے جنم لیا ہے جو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے اہم ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آزادیِ افکار کے نام پر انسانی قدروں اور اجلے نظریات

کی توہین کی گئی جس سے سوائے تباہی کے انسانوں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔اسی لئے آزادیِ افکار کو ابلیس کی ایجاد کہا گیا تھا۔ماڈلین کالج کے ایک اور دلچسپ شاگرد کا نام 'نانا ویرا ٹھیرا' ہے۔اس کا اصلی نام ہیرالڈ ایڈورڈ تھا۔وہ ۱۹۲۰ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا۔اس کا باپ شاہی فوج میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا۔اس نے ۱۹۴۱ء میں ملٹری میں کمیشن حاصل کیا اور اٹلی میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔فوجی ملازمت اختیار کرنے کے باوجود، وہ جنگ وجدل اور سپاہیانہ زندگی سے سخت نفرت کرتا تھا۔دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر اس نے فوجی ملازمت ترک کر دی۔اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ انسان کو جنگ وظلم سے دور رہنا چاہیے۔انہی خیالات کے زیرِ اثر اس نے بدھ مت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔اس نے بدھوں کے بھکشوؤں سے روابط استوار کر لئے۔ اور ان کی اجازت اور آشیر باد سے برطانیہ سے سری لنکا ہجرت کر گیا۔وہاں اس نے ایک دور دراز جنگل میں تنہائی کی زندگی گزارنا شروع کر دی۔جس کے دوران وہ گہرے غور وخوض میں مشغول رہا۔ بھکشوؤں کے طریق کے مطابق، اس کے کوئی ذرائع آمدنی نہیں تھے۔وہ کسی کے سامنے دستِ سوال بھی دراز نہیں کر سکتا تھا۔اپنی روزمرہ کی خوراک صرف عام لوگوں سے لے سکتا تھا۔وہ بھی ایسی صورت میں کہ وہ خود کسی سے کچھ نہیں مانگ سکتا تھا۔اور یہ کہ دینے والے کو اس کے مقام و مرتبے کا علم نہ ہو اور وہ اسے عامی سمجھ کر کھانے پینے کے لئے کچھ دے دے۔رفتہ رفتہ اس نے اس طریق سے بھی کنارہ کر لیا اور بھوک کی وجہ سے صرف پنتالیس برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔ بدھ مذہب کے پیروکاروں میں اس کی شہرت اس کی تصانیف کی وجہ سے ہے۔اس نے سری لنکا کے جنگلوں میں قیام کے دوران بدھ فلسفے اور خیالات پر اپنے خطوط کی شکل میں کلام کیا ہے جو بدھ حلقوں میں بیسیویں صدی میں لکھے جانے والے لٹریچر میں انتہائی اہم تصور کیا جاتا ہے۔

کنگز کالج کیمبرج اپنی پُرشکوہ عمارت اور محلِ وقوع کی وجہ سے پورے کیمبرج میں نہایت نمایاں نظر آتا ہے۔اس کا چیپل یعنی گرجا گھر کیمبرج شہر اور یونیورسٹی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کالج کی بنیاد ہنری ششم نے ۱۴۴۱ء میں رکھی تھی۔اور اس کو شروع سے ہی شاہی سرپرستی حاصل رہی ہے۔کنگز کالج کے قیام سے پہلے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں موجود نیو کالج اور ونچسٹر کالج کے

UrduDost Library UrduDost.com

درمیان ایک خاص تعلق موجود تھا۔ ونچسٹر کالج بنیادی طور پر ایک پبلک سکول ہے۔ جو برطانیہ میں اپنے تعلیمی معیار اور غیر نصابی سرگرمیوں کی بنا پر ایک ممتاز ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ونچسٹر کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد طلباء نیو کالج آکسفورڈ یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ہنری ششم ونچسٹر کالج اور نیو کالج کے ماڈل سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اسی طرز پر ایٹن کالج اور کنگز کالج بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ۱۸۶۵ء تک کنگز کالج میں داخلہ صرف ایٹن کالج کے فارغ التحصیل طلباء کو ہی ملتا تھا۔ اس سال کے بعد کنگز کالج میں داخلے کے لئے ایٹن کالج سے تعلیم یافتہ ہونے کی شرط ختم کر دی گئی تھی۔ کالج کی ابتدائی عمارت یعنی اولڈ کورٹ کی تکمیل میں قریباً ایک صدی کا عرصہ لگا۔ اور یہ ہنری ہشتم کے عہد میں مکمل ہوئی۔ کنگز کالج میں موجود چیپل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اسی طرح کیمبرج میں رہ کر کنگز کالج چیپل کا دیدار نہ کرنا اپنی پیدائش مشکوک بنانے کے مترادف ہے۔ یہ چیپل گوتھک اندازِ تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ یہ چیپل ایک صدی پر پھیلے تین مراحل میں بنایا گیا تھا۔ اس کی لمبائی ۲۸۹ فٹ، چوڑائی ۴۰ فٹ اور بیرونی اونچائی ۹۴ فٹ ہے۔ اس کی چھت نہایت خوبصورت محراب کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ اس کی لمبائی کے رخ والی دیواروں میں بارہ بارہ کھڑکیاں بنائی گئی ہیں۔ ان تمام کھڑکیوں پر رنگین نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ یہ نقوش یا تصویریں دراصل عیسیٰؑ و مریمؑ اور عیسائی مذہب کی مختلف روایات کے عکاس ہیں۔ ہر تصویر کسی خاص واقعے کو اجاگر کر رہی ہے۔ اس چیپل میں آج بھی باقاعدگی سے عیسائی عبادات منعقد ہوتی ہیں۔ کالج کا اپنا کوائر ہے جو روزانہ مذہبی گیت گاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیپل مختلف تقریبات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کنگز کالج کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہاں بائیں بازو کے رجحانات والے لوگ زیادہ ہیں۔ کالج کے بار روم میں موجود ہتھوڑے اور درانتی کی پینٹنگ اسی رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ اسّی کی دہائی میں کنگز کالج نے جنوبی افریقہ میں سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ جبکہ اس دور میں جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز پر مبنی قوانین رائج تھے۔ کالج کے طلباء نے اپنے کالج کی جنوبی افریقہ میں سرمایہ کاری کے خلاف ایک کامیاب ہڑتال کی تھی۔ کنگز کالج کیمبرج میں منعقد ہونے

UrduDost Library UrduDost.com

والی متعدد کھیلوں کی میز بانی بھی کرتا ہے، اگر چہ اس کالج کی اپنی ٹیمیں کھیلوں میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتیں۔ لیکن اس کا کشتی رانی کلب کامیابیوں کی تاریخ رکھتا ہے۔

کنگز کالج نے برطانوی تاریخ میں معروف کئی شخصیات کو تعلیم و تربیت فراہم کی ہے۔ برطانوی تاریخ میں رابرٹ والپول کو عام طور پر پہلا وزیرِ اعظم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر چہ اس کے عہد میں وزیرِ اعظم کا عہدہ موجود نہیں تھا۔ لیکن وہ کابینہ کے وزراء کا لیڈر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور تمام ریاستی امور اور معاملات میں کلیدی کردار کا حامل تھا۔ وہ ۱۶۷۶ء میں پیدا ہوا۔ اس نے برطانوی بادشاہوں جارج اول اور دوئم کے زمانے میں خدمات سرانجام دیں۔ کنگز کالج کا ایک ممتاز شاگرد جارج سنٹیانہ ہے۔ ہر وہ شخص جسے بیسویں صدی کے اہل فلسفہ سے دلچسپی ہے وہ اس نام سے واقف ہے۔ سنٹیانہ فلاسفر ہونے کے علاوہ شاعر، ناول نگار، مضمون نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ وہ ۱۸۶۳ء میں میڈرڈ، سپین میں پیدا ہوا۔ اسکی پرورش اور تعلیم و تربیت امریکہ میں ہوئی تھی۔ اس نے انیس کتابیں تحریر کیں۔ وہ مشہور فلاسفر برٹرنڈ رسل کے ساتھ گفت و شنید بھی کرتا رہا۔ رسل نے کئی مواقع پر اس کی تحسین کی ہے۔ اگر چہ ان دونوں کے نظریات میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ کنگز کالج سے تعلیم پانے والوں میں 'جان مے نارڈ کینیز' جیسا مایہ ناز ماہر معاشیات بھی شامل ہے۔ جس کے خیالات نے جدید میکرو اکنامکس پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ وہ ۱۸۸۳ء میں کیمبرج میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کیمبرج یونیورسٹی میں لیکچرار تھا۔ اس کے نظریات کو معاشیات میں کینیز ین معاشیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پچھلی صدی کی پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں یورپ اور امریکہ کی ریاستی معاشی پالیسیوں کی تشکیل میں اس کے نظریات کا کردار اہم رہا ہے۔ ستر کی دہائی میں بدلتی ہوئی معاشی صورتِ حال میں اس کے نظریات قدرے پس منظر میں چلے گئے تھے۔ لیکن امریکہ میں باراک اوباما اور برطانیہ میں گورڈن براؤن کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ایک دفعہ پھر اس کے نظریات کی روشنی میں معاشی مسائل کے حل ڈھونڈنے کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ کینیز کے معاشی نظریات کارل مارکس کے خیالات سے مختلف بنیادوں پر استوار ہوئے ہیں۔ اس بناء پر بہت سارے ماہرینِ معاشیات اس کے خیالات سے متفق نہیں ہیں۔ سائنس کی

UrduDost Library UrduDost.com

دنیا میں کنگز کالج کے 'ایلن ٹیورنگ' کا نام اہم ہے۔ وہ ریاضی، منطق اور کمپیوٹر سائنس کا ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر سائنس کی ابتدائی ترقی و تحقیق کے حوالے سے وہ ایک معتبر حیثیت کا حامل ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے پہلے، اس کا باپ انڈین سول سروس کے حوالے سے اڑیسہ، انڈیا میں تعینات تھا۔ اسکے ماں باپ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی اولاد کی برطانیہ میں پرورش کریں۔ جس بنا پر اس کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل اس کی ماں لندن چلی گئی تھی۔ وہ زمانہ طالبعلمی میں اپنی صلاحیت کی بنیاد پر غیر معمولی کارکردگی کا حامل رہا تھا۔ اس نے کمپیوٹنگ کے میدان میں بنیادی نوعیت کا کام کیا تھا۔ جدید کمپیوٹر سائنس کی ایک شاخ 'مصنوعی ذہانت' کہلاتی ہے۔ اس شاخ کی ابتدائی نوک پلک سنوارنے میں ٹیورنگ کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔ اسی لئے اسے کمپیوٹر سائنس کے بانیوں میں تصور کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ ہم جنس پرستی میں ملوث ہو کر سزا کا مستحق ٹھہرا تھا کیونکہ اس کے زمانے میں یہ فعل برطانیہ میں جرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعدازاں اس نے صرف اکتالیس برس کی عمر میں خودکشی کر لی۔ اگر وہ ان برائیوں سے اپنا دامن بچاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ مزید سائنسی کارنامے سرانجام دے دیتا۔ بیسویں صدی کے انگریزی ادب میں اگر ناول کا ذکر کیا جائے تو ای۔ ایم۔ فاسٹر کا نام لئے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ فاسٹر نے ناول نگاری کے علاوہ افسانے اور مضامین بھی تحریر کئے۔ وہ ۱۸۷۹ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۱ء تک کنگز کالج سے منسلک رہا۔ اس نے جرمنی، مصر اور انڈیا کی سیاحت کی۔ اور اپنا پہلا ناول انڈیا پر برطانوی حکومت اور مقامی تحریکِ آزادی کے موضوع پر لکھا۔ اس کے پسندیدہ موضوعات میں انسان دوستی، طبقاتی تفریق اور بدقسمتی سے جنسی معاملات اور بالخصوص ہم جنس پرستی شامل ہے۔ زندگی کے آخری سالوں میں اسے یونیورسٹی نے ایک رہائش گاہ مہیا کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اسے معقول مشاہرہ بھی دیا جاتا تھا۔ ان مراعات کے بدلے میں اس سے صرف یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ طلباء سے کبھی کبھار ملاقات اور تبادلہ خیال کر لیا کرے۔ کیونکہ اس کی صحبت سے طلباء بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ علم دوست معاشروں میں اہلِ علم کی اسی طرح قدرومنزلت کی جاتی ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج یونیورسٹی کا کوئینز کالج، کنگز کالج کا ہم عصر ہے۔ اس کی بنیاد پہلی مرتبہ برطانوی بادشاہ ہنری ششم کی ملکہ نے ۱۴۴۸ء میں رکھی تھی۔ بعدازاں اس کی از سرِ نو بنیاد ۱۴۶۶ء میں بادشاہ ایڈورڈ چہارم کی ملکہ نے بھی رکھی تھی۔ اسی لئے اسے 'ملکہ کا کالج' کہنے کی بجائے 'ملکاؤں کا کالج' کہا جاتا ہے۔ یہ کالج دریائے کیم کے دونوں اطراف واقع ہے۔ اور دریا پر موجود مشہور پُل 'میتھ میٹیکل برج' کالج کے دونوں حصوں کو ملاتا ہے۔ اس کالج کی قدیم ترین عمارت جسے اولڈ کورٹ کہا جاتا ہے ۱۴۴۸ء سے ۱۴۵۱ء کے درمیانی عرصے میں تعمیر کی گئی تھی جبکہ اس کا چیپل ۱۸۹۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں مختلف ادوار میں کئی عمارات تعمیر کی گئی ہیں اور سب سے آخر میں تعمیر کی جانے والی عمارت کا نام کرپس کورٹ ہے جسے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیانی عرصے میں بنایا گیا ہے۔ یہ نئی عمارت طلباء اور فیلوز کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کی جارہی ہے۔

کنگز کالج کے رابرٹ نامی منتظم نے ۱۴۷۳ء میں سینٹ کیتھرین کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ عیسائی مذہب کی تاریخ میں چھ شخصیات سینٹ کیتھرین کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ لیکن کیمبرج کا سینٹ کیتھرین کالج، اسکندریہ کی سینٹ کیتھرین کے نام سے منسوب ہے۔ جو چوتھی صدی عیسوی کی عیسائی مذہبی عالمہ اور شہید مانی جاتی ہے۔ روایات کے مطابق وہ ایک کافر گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس نے عالمِ نوجوانی میں اپنے والدین سے کہا تھا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو سب سے زیادہ خوبرو، متمول، ذہین اور اعلیٰ سماجی مرتبے کا حامل ہوگا۔ دراصل اس کی یہ خواہش عیسیٰؑ کی جستجو سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے جلد ہی یہ راز پالیا تھا کہ یہ تمام خوبیاں صرف عیسیٰؑ میں ہی یکجا ہوسکتی ہیں۔ اس نے کفر ترک کیا اور عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ وہ اپنے عہد کے رومی شہنشاہ سے ملنے کے لئے اس کے دربار گئی۔ وہ رومی شہنشاہ عیسائیوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کردیا کرتا تھا۔ کیتھیرین نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس کی تبلیغ کی بدولت شہنشاہ کی زوجہ ایمان لے آئی۔ شہنشاہ نے اپنے درباری فلسفیوں کو کیتھرین کے ساتھ مباحثے کی ذمہ داری سونپی لیکن وہ ناکام رہے۔ ان میں سے کچھ فلسفیوں نے کیتھیرین کی رائے سے اتفاق کرلیا۔ بعدازاں اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ جہاں بہت سارے لوگ اسے ملنے کے لئے آتے اور ایمان کی دولت سے

UrduDost Library UrduDost.com

فیضیاب ہوتے رہے۔اس صورتحال سے پریشان ہوکر شہنشاہ نے اسے پھانسی دے دی تھی جس بناء پر اسے شہید تسلیم کیا گیا۔سینٹ کیتھرین کالج ابتداء میں ایک چھوٹا سا ادارہ تھا جو چند فیلوز کے لئے بنایا گیا تھا۔لیکن سولہویں صدی میں اس کالج میں طلباء کی آمد شروع ہوچکی تھی۔اس کالج کی موجودہ عمارت ۱۶۷۵ء سے ۱۷۵۷ء کے درمیانی عرصے میں بنائی گئی تھی۔یہ تین اطراف میں بنی ہوئی عمارت ہے جس کے درمیان میں ایک خوبصورت لان موجود ہے۔سترہویں صدی میں اس کالج کے ساتھ ملحق گھوڑوں کا ایک اصطبل تھا۔جس کے مینجر کا نام 'تھامس ہابسن' تھا۔وہ اپنی عجیب وغریب منتظمانہ عادات کی وجہ سے معروف تھا۔لوگ اس کے اصطبل سے کرائے پر گھوڑے لینے آتے تھے۔وہ اپنے اصطبل میں موجود سب سے لمبے گھوڑے کو کرائے پر دیتا تھا۔اس طرح کرائے پر لینے والے لوگوں کے پاس چوائس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی مرضی کا گھوڑا کرائے پر لے سکیں۔اس عجیب وغریب صورتِ حال سے انگریزی زبان میں مشہور کہاوت 'ہابسن زچوائس' وجود میں آئی تھی۔جس کا مطلب ہے کہ کوئی چوائس موجود نہیں ہے۔۱۸۸۰ء میں سینٹ کیتھرین کالج کو کنگز کالج میں ضم کرنے کی تحریک شروع ہوگئی تھی۔جس پر کافی گفتگو ہوئی لیکن کالج کے ماسٹر نے اس سے اتفاق نہ کیا اور اس کالج کی شناخت کو محفوظ رکھا۔۱۹۷۹ء میں پہلی مرتبہ اس کالج میں خواتین کو داخلہ دیا گیا تھا جبکہ ۲۰۰۶ء میں پہلی خاتون ماسٹر کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا ہے۔یہ کالج ہاکی اور ٹینس کی کھیلوں میں بہت معروف رہا ہے۔اس کالج کی ادبی سوسائٹی،جس کا نام شرلے سوسائٹی ہے،کو کیمبرج میں موجود قدیم ترین ادبی سوسائٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔یہ سوسائٹی سال کے مختلف مہینوں میں ادبی تقریبات کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔

کیمبرج میں ایڈن بروک نامی ہسپتال اپنے بہترین علاج معالجے اور طب کی اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی سہولیات وروایات کی بدولت پوری دنیا میں مشہور ہے۔اس کالج کا بانی جان ایڈن بروک نامی ڈاکٹر تھا جس نے سینٹ کیتھرین کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔وہ ۱۶۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۱۹ء میں اپنی وفات کے وقت اس نے ساڑھے چار ہزار پاؤنڈ کی خطیر رقم ہسپتال کی تعمیر کی لئے عطیہ کی تھی۔اس نے متعدد نایاب طبی کتابیں بھی سینٹ کیتھرین کالج کی لائبریری کے لئے عطیہ کر

UrduDost Library UrduDost.com

دیں تھیں۔ ایڈن بروک کے علاوہ سینٹ کیتھرین سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں ہندوستان کے پانچویں صدر فخر الدین علی احمد بھی شامل ہیں۔ وہ ۱۹۰۵ء میں آسام میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور لاہور میں وکالت کرتے رہے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں برطانیہ میں جواہر لال نہرو سے ملاقات کے بعد انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے آزادیِ ہند کے لئے بہت جدوجہد کی اور تحریکِ آزادی میں بے شمار قربانیاں پیش کیں۔ اندرا گاندھی نے ۱۹۷۴ء میں انہیں بطور صدر ہندوستان منتخب کیا تھا۔ وہ ابوالکلام آزاد کے بعد دوسرے مسلمان تھے جو ہندوستان کی صدارت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں وفات پائی۔ سینٹ کیتھرین کالج سے تعلیم حاصل کرنے والی عالمی شہرت کی حامل شخصیات میں ملائشیاء کے تنکو عبدالرحمٰن کا نام بھی شامل ہے۔ وہ ۱۹۰۳ء میں ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں سینٹ کیتھرین کالج سے بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپسی پر وہ سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے ملایا کی آزادی کی تحریک میں نہایت جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اور آزادی کے بعد قریباً تئیس برس تک وہ ملائشیاء کے وزیرِ اعظم رہے۔ انہوں نے عالمی مقابلہ قرآن خوانی کا آغاز بھی کیا تھا جو اب ایک توانا روایت بن چکا ہے۔ وہ کھیلوں میں بھی بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ایشین فٹ بال فیڈریشن کے صدر بھی رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا تھا۔

کیمبرج کے ایک اور اہم اور تاریخی کالج کا نام 'جیسس کالج' ہے۔ یہ کالج ۱۴۹۶ء میں بنایا گیا تھا۔ کالج بننے سے پہلے، یہ عیسائی خواتین راہباؤں کی رہائش گاہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رہائش گاہ اعلیٰ کردار سے کنارہ کش ہونے لگی اور عیاشی کا اڈہ بن گئی تھی۔ اس صورتحال سے نبٹنے کے لئے اس کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کالج کی قدیم عمارات وہی ہیں جو خواتین راہباؤں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ کیمبرج کے بیشتر کالجوں کے احاطوں میں بے حد خوبصورت لان موجود ہیں۔ صدیوں پرانے یہ لان، بے حد محنت اور محبت سے تیار کئے گئے ہیں۔ عام طور پر ان گھاس کے قطعات پر صرف متعلقہ کالج کے فیلوز اور لان کی حفاظت پر مامور مالی چل پھر سکتے ہیں۔ لیکن جیسس کالج سال کے مخصوص اوقات میں اپنے طلباء

UrduDost Library UrduDost.com

کو بھی ان سر سبز قطعات پر چلنے کی اجازت دیتا ہے۔ جو کیمبرج کے ماحول میں غیر معمولی تصور کیا جاتا ہے۔اس کالج نے اپنی پانچ صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں کئی قدآور شخصیات پیدا کی ہیں۔ معروف شاعر، تنقید نگار اور فلسفی 'سیموئیل ٹیلر کالرج' ۱۷۹۱ء سے ۱۷۹۴ء تک اس کالج کے ساتھ منسلک رہا ہے۔سیموئیل معروف انگیریزی شاعر 'ورڈز ورتھ' کے ہمراہ انگریزی ادب کی رومانوی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ رومانوی تحریک، یورپ کے سائنسی اور صنعتی انقلاب کے پس منظر میں کارفرما نظریات کے ردِعمل کے طور پر سامنے آئی تھی۔ سیموئیل اور ورڈز ورتھ قریبی دوست رہے ہیں۔اور انگریزی شاعری کے کئی نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ سیموئیل نے ورڈز ورتھ کے شاعرانہ خیالات کو متاثر کیا ہے۔

کرائسٹ کالج کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز ترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کنگز کالج چیپل کی موجودہ جگہ پر ۱۴۳۷ء میں خدائی گھر نامی کالج قائم کیا گیا تھا۔اس کالج کو ۱۵۰۵ء میں برطانوی بادشاہ ہنری ہفتم کی والدہ کی معاونت سے موجودہ چارٹر ملا تھا۔اور اسی سال اس کا نام تبدیل کر کے کرائسٹ کالج رکھ دیا گیا۔ عہدِ حاضر میں یہ کالج کیمبرج شہر کے وسط میں سینٹ اینڈریو سٹریٹ پر واقع ہے۔ سٹی سنٹر میں اس کالج کے پاس چودہ عمارات ہیں جو مختلف ادوار میں بنائی گئی ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے والے کئی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے انسانی تاریخ و تہذیب کو نئے زاویے عطا کئے ہیں۔ ایسے افراد جنہیں کسی خاص عہد، طبقے یا معاشرت سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ ان کی بصیرت تمام عالمِ انسانیت کے لئے ہے۔ انہی میں ایک معتبر نام 'چارلس ڈارون' ہے۔ ڈارون ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۱ء تک کرائسٹ کالج کا طالبعلم رہا تھا۔ وہ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔اس کا باپ ڈاکٹر تھا اور وہ اپنے بیٹے کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔اس مقصد کے لئے ڈارون کو ایڈنبرا میڈیکل سکول میں داخل کروایا گیا۔لیکن وہ طب میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔اس نے اپنی طبی تعلیم ادھوری چھوڑ دی جس کی وجہ سے اسکے والدین اس کے مستقبل کے حوالے سے متفکر تھے۔ بعد ازاں اسے بی۔اے۔ کرنے کے لئے کیمبرج بھجوا دیا گیا۔ جہاں اسکی دلچسپی کا میدان ارضیات اور حیاتیات تھا۔اسے پودوں اور کیڑوں مکوڑوں کے بارے میں جاننے کا بے حد اشتیاق

UrduDost Library UrduDost.com

تھا۔۱۸۳۱ء کے آخری ایام میں اسے ایک ایسا موقع میسر آیا جس نے حیاتیاتی سائنس کی دنیا بدل کرر کھ دی۔ وہ ایک بحری جہاز پر دنیا کی سیاحت کے لئے نکلا۔ یہ جہاز برطانیہ سے جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، اورافریقہ کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اس جہاز کو واپس برطانیہ پہنچنے میں پانچ سال لگے تھے۔ اس مہم میں ڈارون نے ساحلی وارضی حیات کے بے شمار نایاب نمونے اکٹھے کئے۔ اس نے انتہائی احتیاط اور عرق ریزی سے ان نمونوں کا مطالعہ کیا۔ وطن واپس پہنچ کر اس نے کئی ماہرین حیاتیات وارضیات کے ساتھ مل کر اپنے جمع کئے ہوئے نمونوں پر تحقیق کی۔ اوراپنی تھیوری جسے وہ 'قدرتی انتخاب' کا نام دیتا تھا، تخلیق کی۔ اس کی تحقیق کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ حیات دراصل کسی ایک جرثومہ زندگی سے ارتقاء پذیر ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے نتائج تک پہنچنے میں اسے کئی دہائیوں تک سخت محنت کرنا پڑی تھی۔ چونکہ اس کی تھیوری کا ایک نتیجہ سادہ زبان میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انسان کی پیدائش بندر سے ارتقاء پذیر ہوئی ہے جس سے مذاہب کو اختلاف ہے۔ اس لئے اسے بعض مذہبی حلقوں میں معتبر خیال نہیں کیا جاتا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ڈارون خود عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ انسان کی بندر سے پیدائش اسکی تھیوری کا بنیادی نکتہ نہیں ہے، البتہ اس کی تحقیق کے نتائج سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے۔ مزید یہ کہ حیاتیاتی سائنس میں قدرتی مظاہر کے شواہد کی بنیاد پر نظریات تراشے جاتے ہیں، قوانین نہیں۔ اور یہ نظریات کسی بھی طبعی مظہر کی ممکنہ تشریح ہوتے ہیں۔ کیا یہ واقعی حقیقت بھی ہیں؟ اس پر علمائے سائنس حتمی رائے دینے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ ڈارون ۱۸۸۲ء میں فوت ہوگیا۔ اس کی سائنسی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اس کو شاہی اعزاز کیساتھ معروف سائنسدان نیوٹن کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی میں شاہی خاندان کے علاوہ صرف پانچ افراد ایسے ہیں جنہیں یہ اعزاز نصیب ہوا تھا۔ ڈارون کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے کئی جگہوں کو اس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ انہی میں آسٹریلیا میں واقع شہر ڈارون بھی ہے۔

انگریزی ادب کا ہر طالبعلم مشہورِ زمانہ شاعر 'جان ملٹن' کے نام سے واقف ہے۔ ملٹن ۱۶۰۸ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام بھی جان ملٹن ہی تھا۔ وہ ۱۶۲۵ء میں کرائسٹ

UrduDost Library UrduDost.com

کالج میں داخل ہوا۔اس نے ۱۶۲۹ء میں بی۔اےاور۱۶۳۲ء میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ مذہب،فلسفہ،تاریخ، سیاست،ادب اور سائنس کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔اسے انگریز شاعروں میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا تصور کیا جاتا ہے۔اسے انگریزی، لاطینی، یونانی، عبرانی،فرانسیسی،اسپینی اوراطالوی زبانوں پرعبورحاصل تھا۔ملٹن کی وجہ شہرت اس کی مشہورِزمانہ نظم' پیراڈائزلاسٹ' ہے۔ یہ نظم ۱۶۶۷ء میں دس جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔اس کی دس ہزار سے زائد لائنیں یعنی مصرعے ہیں۔اس کا موضوع آدم وحوا کا جنت سے نکالے جانے کا واقعہ ہے۔دراصل یہ نظم مذہب اوراس کے مخالف نظریات کے درمیان فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہے۔اس نظم کو انگریزی نقادوں نے رومانوی تحریک سے بھی جوڑا ہے۔ملٹن کے بعد آنے والے بہترین شعراء ورڈزورتھ، ولیم بلیک، جان کیٹس وغیرہ نے ملٹن کوخراجِ تحسین پیش کیا ہے۔کرائسٹ کالج سے منسلک رہنے والوں میں معروف ہندوستانی ماہر طبیعات وحیاتیات جگدیش چندرابوس بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ ہندوستان میں آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اسی کالج سے تعلیم یافتہ تھا۔

کیمبرج کے ایک اور تاریخی کالج کا نام سینٹ جان کالج ہے۔یہ کالج ۱۵۱۱ء میں قائم کیا گیا تھا۔اس کا صدر دروازہ اور فرسٹ کورٹ نامی قدیم عمارت سرخ اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔فرسٹ کورٹ دراصل ایک ہسپتال کی عمارت تھی جس میں ردوبدل اور اضافے کے بعد اسے کالج کی عمارت میں تبدیل کیا گیا تھا۔کالج کے قیامِ کے ابتدائی زمانے میں ایک ڈائننگ ہال کا اضافہ بھی کیا گیا۔اس کالج میں فیثا غورث کا سکول نامی عمارت بھی شامل ہے جو ۱۲۰۰ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر کیمبرج یونیورسٹی کے وجود میں آنے سے پہلے کی گئی تھی۔۱۶۲۴ء میں کالج لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔اُس زمانے میں کالج لائبریری پر تین ہزار پاؤنڈ کی خطیر رقم خرچ کی گئی تھی۔ یہ عہدِ حاضر میں بھی ایک عمدہ لائبریری تصور کی جاتی ہے۔اس کالج کا چیپل ۱۸۶۹ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ چیپل کنگز کالج چیپل کی طرح قابلِ دید عمارت ہے۔سینٹ جان کالج کا کوائر کیمبرج یونیورسٹی میں بہت معروف ہے۔ یہ کوائر دنیا کے کئی ممالک میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

انگلینڈ میں دریاؤں اور ندی نالوں میں جا بجا خوبصورت بطخیں تیرتی پھرتی ہیں۔ یہ بطخیں نشان زدہ اور غیر نشان زدہ ہوتی ہیں۔ غیر نشان زدہ وہ بطخیں ہیں جو کسی فرد یا ادارے کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ یہاں کے قانون کے مطابق غیر نشان زدہ بطخیں برطانوی بادشاہ یا ملکہ کی ملکیت ہیں۔ اور انہیں شکار کرنے کا اختیار شاہی خاندان کے پاس ہے۔ شاہی خاندان کے علاوہ یہ اختیار صرف سینٹ جان کالج کے فیلوز کے پاس ہے۔ جو کیمبرج میں ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے۔۔۔ حیرت ہے سینٹ جان کالج جس اعزاز پر نازاں ہے، وہ ہمارے ہاں بچے بچے کے پاس ہے۔ غیر نشان زدہ بطخیں تو رہیں ایک طرف۔ یہاں تو نشان زدہ مرغیاں، بکرے، بھیڑیں جو پکڑ سکتا ہے پکڑ لے اور پھر جو چاہے، سلوک کرے۔ لیکن نشان لگانے والوں سے بچ کر یا پھر مقامی معززین اور پولیس کے زیرِ سایہ نشان لگانے والوں کے عین سامنے۔ آزادیِ عمل کے پیمانے سے دیکھا جائے تو برطانوی سماج ہم سے پیچھے بلکہ بہت ہی پیچھے ہے۔۔۔ سینٹ جان کالج کھیلوں میں نہایت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کالج کی رگبی ٹیم، یہاں منعقد ہونے والے اکثر مقابلوں میں فاتح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کالج کا 'مئی بال' یعنی مئی میں ہونے والی ڈانس پارٹی کو پوری دنیا میں ہونے والی پارٹیوں میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حال ہی میں ایک عالمی جریدے نے اس پارٹی کو عالمی سطح پر ساتویں بہترین پارٹی قرار دیا ہے۔ اس میں آتش بازی کا مظاہرہ قابلِ دید ہوتا ہے۔

انگریزی ادب اور شاعری سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص ولیم ورڈز ورتھ کے نام سے آگاہ ہے۔ ورڈز ورتھ سینٹ جان کالج سے تعلیم یافتہ تھا۔ وہ ۱۷۷۰ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا۔ اس نے ۱۷۸۷ء میں سینٹ جان کالج میں داخلہ لیا اور ۱۷۹۱ء میں یہاں سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے نوجوانی میں فرانس کا سفر اختیار کیا۔ وہ فرانس میں انقلابی تحریک سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اسی سفر کے دوران اس نے ایک فرانسیسی خاتون سے شادی بھی کی تھی۔ اس نے برطانیہ میں ایک اور شادی بھی کی تھی۔ برطانیہ واپسی پر اس نے اپنی شاعری شائع کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ انگریزی ادب میں رومانوی تحریک کا روحِ رواں مانا جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے نہایت خوبصورت علاقے لیک ڈسٹرکٹ میں سکونت پذیر رہا۔ اس نے قدرتی مناظر اور مظاہر کی ایسی تصویر کشی کی

UrduDost Library UrduDost.com

ہے کہ آج تک انگریزی شاعری میں اس کا بدل نہیں ہے۔ وہ برطانوی شاہی دربار میں ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۰ء تک ملک الشعراء کے عہدے پر فائز رہا۔لیکن وہ واحد شاعر ہے جس نے اس منصب پر فائز ہونے کے باوجود درباری شاعری نہیں کی۔ اس نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔

سینٹ جان کالج سے تعلیم پانے والوں نے نسلِ انسانی کے لئے غلامی کے خاتمے جیسا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس مہم میں اس کالج کے دو سپوت 'تھامس کلارک سن' اور 'ولیم ولبر فورس' پیش پیش رہے ہیں۔ کلارک سن ۱۷۶۰ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے سینٹ جان کالج آیا۔ دورانِ تعلیم، اس نے برطانیہ میں انسانی غلامی کے موضوع پر ایک مقابلہ مضمون نویسی میں حصہ لیا۔ اس کا مضمون انعام کا مستحق ٹھہرا۔ اس موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے اس نے کافی مواد اکٹھا کیا تھا جس سے اس کی غلامی کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوا۔ کیمبرج سے انعام پانے کے بعد اس نے اپنے مضمون کو شائع کروادیا۔ غلامی کے خلاف کام کرنے والے حلقوں میں یہ مضمون کلارک سن کا تعارف ثابت ہوا۔ بعدازاں اُس نے غلاموں کے حالات جاننے کے لئے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر پورے برطانیہ کا دورہ کیا۔ اس نے گھوڑے پر قریباً پینتیس ہزار میل کا سفر طے کیا۔ وہ مختلف شہروں، قصبات اور دیہات گیا۔ جہاں وہ غلاموں سے ملا۔ اس نے ان بحری جہازوں کا بھی دورہ کیا جو افریقہ سے دھڑا دھڑ غلام بھر کر سلطنت برطانیہ لاتے اور انہیں یہاں غلاموں کی خرید وفروخت کے لئے سجائی گئی منڈیوں کی زینت بناتے۔ اس نے غلاموں کی تصاویر اور دیگر شہادتیں اکٹھی کیں۔ اس نے برطانیہ کے طول وعرض میں غلامی کے خلاف تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ اس مہم کے دوران اس پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ اس نے غلامی کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی اور پارلیمنٹ کے ارکان کے ساتھ مکالمہ شروع کیا تاکہ اراکینِ پارلیمنٹ غلامی کے خلاف قانون سازی میں مدد کریں۔ اسی سلسلے میں اس کا رابطہ ولیم ولبرفورس سے ہوا جو اس کا ہم مدرسہ بھی تھا۔ ولیم ولبرفورس نے پارلیمنٹ میں لابنگ کرنے اور غلامی کے خلاف محاذ تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں غلامی کا بل متعدد بار پیش کیا گیا اور سال ہا سال شکست کھانے کے بعد بالآخر ۱۸۳۳ء میں یہ بل

UrduDost Library UrduDost.com

منظور کرلیا گیا۔جس سے پوری دنیا میں غلامی کے خاتمے کی راہ ہموار ہوئی۔کلارک سن نے غلامی کے خاتمے کے لئے فرانس اور دوسرے یورپی ممالک کا دورہ بھی کیا تھا۔اس نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں لیک ڈسٹرکٹ میں قیام کیا تھا جہاں اس کی ملاقات مشہور زمانہ شاعر ولیم ورڈز ورتھ سے ہوئی۔ورڈز ورتھ،کلارک سن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے کلارک سن کی مدح میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔

سینٹ جان کالج سے تعلیم پانے والے نو افراد نوبل انعام حاصل کر چکے ہیں جبکہ چھ افراد وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچے ہیں جن میں چار وزیرِ اعظم برطانیہ رہ چکے ہیں۔چھ وزرائے اعظم میں موجودہ ہندوستانی وزیر اعظم من موہن سنگھ بھی ہیں۔من موہن سنگھ پاکستانی شہر چکوال میں پیدا ہوئے اور تقسیمِ ہندوستان کے بعد ہجرت کر کے امرتسر چلے گئے تھے۔سینٹ جان کالج ان کے نام سے پی۔ایچ۔ڈی کے ایک سکالر کو وظیفہ بھی دیتی ہے۔اس کالج کے طلباء سیاست،سائنس،ادب اور مذہب کے میدانوں میں نہایت اہم خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ان میں سٹیم ٹربائن کا موجد چارلس پارسن،نیپچون سیارہ دریافت کرنے والا جان ایڈم،زمین کا مقناطیسی میدان دریافت کرنے والا ولیم گلبرٹ اور دیگر ممتاز افراد شامل ہیں۔اس کالج کے گریجوایٹس نے تاریخ میں اتنے اہم کام کئے ہیں کہ ان پر ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں ٹرینیٹی کالج کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس کالج میں طلباء و طالبات کی تعداد باقی تمام کالجوں سے زیادہ ہے۔شاہی خاندان کے لوگ کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ٹرینیٹی کو فوقیت دیتے ہیں۔اسی لئے اس کالج کو امراء و اشرافیہ کا کالج بھی تصور کیا جاتا ہے۔اس کالج سے منسلک بتیس افراد نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں۔نوبل پرائز کے مساوی اہمیت کا حامل ایک اور انعام بھی ہے جسے فیلڈز میڈل کہا جاتا ہے۔یہ میڈل ہر چار سال بعد ریاضی کے مضمون میں عطا کیا جاتا ہے۔اس انعام کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ انعام حاصل کرنے والے کی زیادہ سے زیادہ عمر چالیس برس ہونا چاہئے۔کیونکہ اس میڈل کا مقصد جوان ریاضی دانوں کے کارناموں کی تحسین کے ذریعے انہیں مزید تحقیق کی تحریک دینا ہے۔ٹرینیٹی کالج

UrduDost Library UrduDost.com

کے چار افراد یہ میڈل بھی حاصل کر چکے ہیں۔اس کالج میں آج تک چھ برطانوی وزرائے اعظم تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔اس کالج کی بنیاد ۱۵۴۶ء میں برطانوی بادشاہ ہنری ہشتم نے رکھی تھی۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کالج میں متعدد عمارات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ کالج پورے برطانیہ میں ایک انتہائی امیر تعلیمی ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔اس کالج کے بڑے دروازے کو 'گریٹ گیٹ' کا نام دیا گیا ہے۔اس گیٹ سے گزر کر آپ اس کالج کی قدیم عمارت 'گریٹ کورٹ' میں داخل ہوتے ہیں۔ ہر سال نئے طلباء و طالبات کے داخلے کے موقع پر ایک دلچسپ روایت بھی موجود ہے۔ نئے سٹوڈنٹس میں سے انتہائی تیز رفتار طلباء گریٹ کورٹ کے لان کے گرد ریس لگاتے ہیں۔ یہ ریس بارہ بجے منعقد ہوتی ہے۔ جب کالج کے گھڑیال کی منٹوں والی سوئی گھنٹوں والی سوئی پر چڑھتی ہے۔ ریس والے لان کا محیط ۳۶۷ میٹر ہے اور اس کے گرد چکر لگانے کے لئے تینتالیس سیکنڈ کا وقت دیا جاتا ہے۔عام طور پر یہ دورانیہ چکر مکمل کرنے کے لئے ناکافی ہوتا ہے اور سٹوڈنٹس کو اس سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔اس کالج کی ایک اور روایت یہ ہے کہ جون کے مہینے کے کسی ایک اتوار کو کالج کوائر کھلی فضا میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔کوائر کے آدھے ارکان گریٹ گیٹ کی بالائی منزل اور بقیہ آدھے کالج کے گھنٹہ گھر کی بالائی منزل پر چڑھ کر اپنے اپنے ساز بجاتے ہیں۔ اِن دونوں جگہوں کا باہمی فاصلہ ساٹھ میٹر ہے۔ پھر اسی روز یہ دریائے کیم میں کھڑی کشتیوں میں بھی موسیقی الاپتے ہیں۔اس کالج کے بانکے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔کالج کے احاطے میں ایک درخت ہے۔سٹوڈنٹس اس درخت کے اوپر والے سرے کے قریب پتوں اور شاخوں میں ایک سائیکل لٹکا دیتے ہیں۔ پت جھڑ میں جب درخت کے پتے گرتے ہیں تو سائیکل نظر آتا ہے۔ جسے کالج انتظامیہ بڑی مشکل سے نیچے اتارتی ہے۔اگلے سال طلباء پھر سائیکل لٹکا دیتے ہیں، انتظامیہ پھر اسے اتارنے کے جتن کرتی ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔بس لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ۔سینٹ جان کالج اور ٹرینٹی کالج ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ان دونوں کالجوں کا کھیلوں میں بھرپور مقابلہ ہوتا ہے اور مقابلے کی فضا تقریباً سارا سال قائم رہتی ہے۔

ٹرینٹی کالج نے مختلف ادوار میں جتنے اہم افراد پیدا کئے ہیں، اتنے شائد ہی کسی اور

UrduDost Library UrduDost.com

ادارے نے پیدا کئے ہوں گے۔اس کالج سے تعلیم حاصل کرنے والے ممتاز افراد میں سرِ فہرست سر آئزک نیوٹن ہے۔علمِ سائنس کی پیدائش اور ارتقاء میں بے شمار قابل اور ذہین افراد نے دن رات محنت کی ہے لیکن جو شہرت اور پذیرائی نیوٹن کے حصے میں آئی وہ شائد کسی اور کو نہیں ملی۔ وہ ۱۶۴۳ء میں برطانیہ میں پیدا ہوا۔اس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔اس کی پیدائش وقت سے پہلے ہوئی تھی جس بناء پر وہ ایک انتہائی کمزور بچہ تھا۔اس کی ماں نے اس کی پیدائش کے بعد دوسری شادی کر لی تھی اور اسکی نگہداشت اسکی نانی نے کی تھی۔اسکی ماں اسے کسان بنانا چاہتی تھی لیکن اس کا میلان پڑھائی کی طرف تھا۔وہ ۱۶۶۱ء میں ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخل ہوا۔اس زمانے میں ریاضی اور فلسفہ کے میدانوں میں ارسطو کا طوطی بولتا تھا۔ نیوٹن اپنے زمانۂ طالبعلمی میں ارسطو کی بجائے گیلیلیوؔ کے نظریات کی طرف راغب رہا۔اس نے ریاضی، طبیعات، کیمیا گری، بصریات و روشنی کے میدانوں میں بیش بہا تحقیقات کیں۔اس نے کششِ ثقل اور حرکت کے قوانین وضع کئے۔اس کے قوانین کی بنیاد پر ہی طبیعات و ریاضی کی شاخ 'کلاسیکل میکینکس' استوار ہوئی تھی۔۔۔عہدِ حاضر میں ہر وہ بچہ جو سکول میں سائنس اور طبیعات پڑھتا ہے، وہ نیوٹن کی اس حرکت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس نے قوانینِ حرکت بنائے تھے۔ان قوانین کو رٹا لگائے بغیر کوئی طالب علم دین و دنیا میں فلاح نہیں پا سکتا،شائد کسی بچے کو یہ قوانین سمجھ بھی آجاتے ہوں لیکن آج تک ایسا بچہ مشاہدے میں نہیں آیا۔ ہمارے ہاں سکول کے تمام طالبعلم نیوٹن کے قوانین یاد کرتے وقت اپنے اپنے اساتذہ کرام کی عارضی آزمائش یعنی زندگی کے خاتمے کی دعا کے ساتھ ساتھ نیوٹن کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرتے ہیں۔کیونکہ جس قسم کے گھناونے جرم کا ارتکاب نیوٹن نے کیا تھا، یعنی کوئی ایک قانونِ حرکت نہیں۔اکٹھے تین قوانین جن کا عقلِ سلیم سے کوئی تعلق آج تک نیوٹن ثابت کر سکا نہ ہمارے عاقبت نااندیش اساتذہ کرام،اس قسم کے جرم کی بخشش کے لئے تا قیامت دعا کی جانی چاہیے۔شائد نیوٹن کے گناہ بخشے جائیں،اگرچہ اس بات کی کوئی تمنا ہے نہ امکان۔۔۔کششِ ثقل کے حوالے سے درخت سے سیب گرنے کی داستان نیوٹن نے خود کئی مرتبہ بیان کی تھی۔جس جگہ یہ سیب کا درخت واقع تھا، عین اسی جگہ کیمبرج میں

UrduDost Library UrduDost.com

'بوٹینک گارڈن' میں ایک سیب کا درخت موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نیوٹن کے زمانے کے سیب کے درخت کی اولاد ہے۔ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سائنسدان مذہب کے قائل نہیں ہوتے۔ لیکن نیوٹن اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ پکا مذہبی آدمی تھا۔ اس نے مذہب اور عیسائیت کے بارے میں کئی تصنیفات بھی کیں تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ عیسائیت کے معروف عقیدۂ تثلیث، جس کے تحت خدا، جبرائیل، اور عیسیٰؑ کی عبادت کی جاتی ہے، کو درست تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ موحد اور صرف ایک معبود کا قائل تھا۔۔۔ عام مشاہدہ ہے کہ پکے مذہبی خیالات کے حامل لوگ جتنا مذہب پر یقین رکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ شادیوں کے قائل ہوتے ہیں اور جتنا شادیوں کے حامی ہوتے ہیں اس سے بہت زیادہ کثرتِ اولاد کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن نیوٹن عجیب آدمی تھا۔ تعددِ ازواج اور کثرتِ اولاد تو کجا، راسخ العقیدہ مذہبی ہونے کے باوجود اس نے شادی ہی نہیں کی۔ گویا صرف طلباء سائنس ہی نہیں مذہبی حلقے بھی اس کے طرزِ عمل کے شاکی ہیں۔ ان کی عزت کو بھی ساری عمر بٹا لگاتا رہا ہے۔۔۔ وہ برطانیہ کا ممبر پارلیمنٹ رہا۔ اس کے علاوہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں لیوکاسین پروفیسر آف میتھ میٹکس کے عہدے پر بھی فائز رہا۔ اس نے ۱۷۲۷ء میں وفات پائی اور لندن میں شاہی اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا۔

سائنس کی بنیاد ترتیب دینے کے حوالے سے ٹرینیٹی کالج کے سر فرانسس بیکن (۱۵۶۱۔۱۶۲۶) کا نام بہت اہم ہے۔ بیکن وہ شخص ہے جس نے 'سائنسی طریقہ کار' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سے پہلے سائنسی مطالعہ و تحقیق کا طریقہ کار غیر منظّم تھا اور مختلف محققین اپنے اپنے انداز میں مطالعہ و تحقیق کرتے تھے۔ لیکن بیکن نے 'مشاہدہ، تجربہ اور نظریہ' پر مبنی سائنسی طریقہ کار متعارف کروایا تھا۔ جس کی بنیاد پر آنے والے زمانوں میں سائنسی تحقیق نے قابلِ بھروسہ علم فراہم کیا۔ بیکن کی موت بھی اپنے ایک تجربے کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ وہ گوشت محفوظ کرنے کے لئے ٹھنڈک کے اثرات کا مطالعہ و مشاہدہ کر رہا تھا کہ ٹھنڈک کے اثرات سے اسے نمونیا ہو گیا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ اس کے علاوہ فوٹو گرافی کا موجد ولیم ٹالبوٹ، مشہور ریاضی وطبعیات دان چارلس ببیج، برقی مقناطیست معلوم کرنے والا میکس ویل، ایٹمی ڈھانچہ دریافت کرنے والا نیل

UrduDost Library UrduDost.com

بوہر، معروف جوہری طبیعات دان ردرفورڈ، کیمیائی عنصر 'آرگن' دریافت کرنے والا لارڈ ریلے، مشہور ہندوستانی ماہر معاشیات امرتا سین، بیسیویں صدی کا مشہور فلسفی، ریاضی دان، مورخ، حقوق انسانی کا علمبردار، اور جنگ کے وجود کے خلاف جنگ کرنے والا برٹرنڈ رسل بھی ٹرینیٹی کالج سے وابستہ رہا ہے۔

ادب کے میدان میں ٹرینیٹی کالج نے متعدد معروف لوگ پیدا کئے ہیں۔ لارڈ بائرن کا نام انگریزی ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ۱۸۰۵ء میں ٹرینیٹی کالج میں داخل ہوا۔ وہ اپنی شاعری، معاشقوں، قرض، خود ساختہ جلا وطنی اور خلافتِ عثمانیہ کے خلاف جنگ کی وجہ سے مشہور ہوا۔ بائرن اور غالب میں شاعری، عشق، اور قرض مشترک ہیں۔۔۔ قرض کے معاملے میں غالب بائرن سے آگے بلکہ بہت ہی آگے ہے۔ بحث یہ نہیں کہ غالب نے زیادہ قرض لے رکھا تھا یا بائرن نے۔ کیونکہ یہ معاملہ دونوں کے ہاں فروعی ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرض لیا جائے اور تسلسل سے لیا جائے۔ قرض کی مقدار و تعداد کے حساب کا جھنجٹ قرض خواہ کے ذمے ہے، مقروض اس قضیے میں نہیں پڑتے۔ غالب کو میدانِ قرض میں فوقیت یہ ہے کہ اس نے قرض سے گھبرا کر کبھی سکونت تبدیل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ البتہ اس کے قرض خواہ قرض دینے سے جان چھڑانے کے لئے مکان تو کیا دنیا چھوڑنے کے بارے میں غور و خوض کرتے رہے۔ غالب نہایت دھڑلے سے دلّی میں مقیم رہے جبکہ بائرن اس معاملے میں 'تھوڑ دل' اور کم حوصلہ واقع ہوا۔ وہ قرض خواہوں کے خوف سے فرار رہا۔ لیکن اس نے دوسرے کئی معاملات میں غالب کو پچھاڑا ہے۔ وہ جہاں جہاں مفرور رہا وہاں پر نئے سے نئے عشق کرتا رہا۔ حضرت غالب تو بس ایک ڈومنی کے معاملے میں ہی ڈھیر ہو گئے حالانکہ ان کے بدخواہ یہ تہمت بھی لگاتے ہیں کہ ان کا عشق بڑا شرعی قسم کا تھا۔ بس کہیں دل ہی میں تھا، کوئی عملی اظہار اور اس سے حاصل ہونے والی بدنامی سامنے نہ آ سکی۔ ایسے عشق سے تو ان کا جوا کھیلنا ہی بہتر تھا جس میں کم از کم قید تو ہوئی اور ہم عصر جواریوں کو تسلی بھی۔ بائرن اور غالب کے تقابل کا تیسرا میدان شاعری ہے۔ دونوں کے مداح ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور تنقید نگار منصبِ تنقید و تشنیع و تعریض سے معزول

UrduDost Library UrduDost.com

ہونے کے ڈر سے ان کے کلام میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ بائرن خلافت عثمانیہ کے خلاف برسرِ پیکار بھی رہا۔ اسی بناء پر یونان میں وہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد جب انگریز اس کی نعش برطانیہ لانے کے درپے تھے تو یونانیوں نے تبرکاً اس کے جسم سے کچھ اعضاء نکال لئے تھے۔ اس نے بہت کم عمر پائی اور چھتیس برس کی عمر میں فوت ہوگیا۔ اگر زندگی مہلت دیتی تو نجانے اورکون سے گُل کھلاتا۔۔۔ لارڈ بائرن انگریزی ادب کی رومانوی تحریک میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کی نظمیں انگریزی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ ادب اور سائنس کے علاوہ کارزارِ سیاست میں بھی ٹرینیٹی کالج کے شاگردوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ برطانوی بادشاہ ایڈورڈ ہفتم اور جارج ششم اسی کالج سے تعلیم یافتہ تھے۔ ہندوستانی سیاست کے ایک بہت قدآور کردار، پنڈت جواہر لال نہرو بھی ٹرینیٹی کالج سے فارغ التحصیل تھے۔

صدیوں پہلے یورپ میں عیسائی مذہب کے حوالے سے کیتھولک چرچ کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن برطانوی بادشاہوں نے سیاسی مقاصد کی وجہ سے کیتھولک مذہب کو خیرباد کہہ کر چرچ آف انگلینڈ کی بنیاد رکھی تھی۔ کیتھولک سے اختلاف اور علیحدگی اختیار کرنے والے پروٹسٹنٹ یا 'احتجاجیے' کہلائے۔ کیتھولک فرقے کے برعکس احتجاجیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہت کم ادارے قائم ہوئے۔ کیمبرج میں احتجاجیوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے عمانویل کالج کا قیام ۱۵۸۴ء میں عمل میں لایا گیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کالج مذہبی رجحانات اور دنگا فساد سے آگے بڑھ گیا اور اس نے دیگر جدید مضامین کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کرلیا۔ کیمبرج میں عمانویل کالج ایک دوستانہ ماحول رکھنے والے ادارے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کالج میں کشتی رانی، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، رگبی، سکوائش اور نجانے اور کتنے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔۔۔ پڑھائی بھی کھیل کے طور پر کی جاتی ہے۔۔۔ اس کے صحن میں موجود تالاب میں نئی نئی قسم کی بطخیں لا کر بسائی جاتی ہیں۔ جن کی نسل پر یہاں کے تمام طلباء و فیلوز نہایت نازاں ہیں۔ ایک اور اہم امتیاز جو اس کالج کے باسی قابلِ ذکر سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس میں لانڈری یعنی کپڑوں کی دھلائی مفت کی جاتی ہے جو کسی اور کالج میں نہیں ہوتی۔ تو اگر آپ کیمبرج میں پڑھائی کئے بغیر اپنی آوارہ

UrduDost Library UrduDost.com

گردی کو نامکمل تصور کرتے ہیں اور اکثر اپنے کپڑے بھی گندے کرتے رہتے ہیں تو آپ کے داخلے کے لئے سب سے عمدہ یہی کالج ہے۔۔۔اس کالج سے تعلیم پانے والوں نے شمالی امریکہ کی تاریخ کے ابتدائی ایام میں نہایت شاندار خدمات سرانجام دی ہیں۔امریکہ کی شہرہ آفاق ہاورڈ یونیورسٹی کا نام انگریز پادری جان ہاورڈ کے نام پر رکھا گیا تھا جس نے اُس یونیورسٹی کی ابتدائی تعمیر و ترقی کے لئے نقد رقم اور اپنی چار ہزار کتابوں پر مشتمل لائبریری عطیہ کی تھی۔جان ہاورڈ نے کیمبرج یونیورسٹی کے عمانویل کالج سے تعلیم پائی تھی۔اس کے علاوہ مشہور ریاضی دان اور انجینئر تھامس ینگ بھی اسی کالج کا شاگرد رہا ہے۔عمانویل کالج کی طرح سڈنی سسکس کالج بھی پروٹسٹنٹ فرقے سے متعلق لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا۔اس کی بنیاد ۱۵۹۶ء میں رکھی گئی تھی۔سڈنی سسکس کالج طلباء کی تعداد کے لحاظ سے نسبتاً چھوٹا کالج تصور کیا جاتا ہے۔اس کالج کا سب سے مشہور شاگرد کروم ویل ہے۔وہ برطانوی تاریخ کا مشہور کردار ہے۔جس سے مختلف حلقے بیک وقت محبت اور نفرت کرتے ہیں۔اس نے برطانوی کامن ویلتھ تشکیل دی تھی۔وہ چونکہ ایک فوجی آمر تھا اور اس نے بادشاہ کو قتل کیا تھا جس بناء پر اس سے نفرت کی جاتی ہے۔اس کی موت طبعی تھی لیکن مرنے کے دو تین سال بعد اس کی نعش کھود کر، اسے پھانسی دی گئی تھی۔اس کا سر نعش سے جدا کر دیا گیا تھا جو مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا اپنی مادرِ علمی سڈنی سسکس کالج پہنچا اور کالج کے چیپل کے نیچے دفن کیا گیا تھا۔۔۔انسان چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، اپنوں کا دامن اس کے لئے وسیع ہی رہتا ہے۔

کیمبرج میں طلباء کو رہائش اور دیگر نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کے لئے کالجوں میں داخلہ لینا پڑتا ہے جبکہ پڑھائی کی بنیادی ذمہ داری یونیورسٹی کے اکیڈیمک ڈیپارٹمنٹس کی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کچھ طلباء، جو کالج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پرائیویٹ رہائش کا بندوبست کرنا چاہتے تھے، نے ایک کلب قائم کیا۔اس کلب کے قیام کا مقصد یونیورسٹی کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ انہیں کسی بھی کالج سے وابستہ ہوئے بغیر یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے دی جائے۔اس کلب کے طلباء نے اپنے لئے 'فٹز ولیم' کا نام پسند کیا تھا اور ۱۸۸۷ء

UrduDost Library UrduDost.com

میں کیمبرج یونیورسٹی نے ٹرمپنگٹن روڈ پر واقع عمارت کو فٹز ولیم ہال کا نام دے کر طلباء کو تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ جسے بعد ازاں ۱۹۶۳ء میں ایک شاہی اجازت نامے کے ذریعے باقاعدہ کالج کی شکل دے دی گئی۔ اس وقت یہ کالج شہر کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف رہائشی عمارات، چیپل، لائبریری اور آڈیٹوریم کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کالج کے میوزک کی پورے کیمبرج میں دھوم ہے۔ برصغیر کے حوالے سے اس کالج کے شاگردوں میں ایک بڑا نام سبھاش چندرا بوس کا ہے۔ وہ اڑیسہ، انڈیا میں ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک انقلابی رہنما تھے۔ اگرچہ برصغیر کی آزادی میں ان کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں لیکن ان کا طرزِ سیاست متنازعہ رہا ہے۔ وہ آل انڈیا کانگریس کے صدر بھی رہے۔ لیکن وہ گاندھی کی عدمِ تشدد کی سیاست سے بیزار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عدمِ تشدد کے ذریعے آزادیٔ ہند کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے گاندھی اور کانگریس کے موقف کی کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی تھی۔ اور اپنی الگ سیاسی جماعت بنائی تھی جس کا نام آل انڈیا فارورڈ بلاک تھا۔ دوسری جنگ عظیم کو انہوں نے ایک اہم موقع جانتے ہوئے برطانیہ کے عالمی سطح کے حریف ملکوں، جن میں روس، جرمنی اور جاپان شامل تھے، کے ساتھ روابط استوار کئے۔ انہوں نے جاپان کی مدد سے ایک جلاوطن حکومت بھی بنائی تھی۔ وہ بھگت سنگھ سے متاثر تھے اور ہندوستان کی آزادی مسلح جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نعرہ تھا 'تم مجھے خون دو، میں تمہیں آزادی لے کر دوں گا'۔ وہ ہندوستان کی آزادی سے پیشتر ۱۹۴۵ء میں تائیوان کے قریب ایک فضائی حادثے میں وفات پا گئے۔ فٹز ولیم کالج سے تعلیم پانے والوں میں عالمی شہرت کے حامل سنگاپور کے بانی و معمار لی کوان یو بھی ہیں۔ وہ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سنگاپور کو آزاد کروانے اور معاشی طور پر مستحکم ملک بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ وہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک سنگاپور کے وزیرِ اعظم رہے۔ دنیا کا کوئی دوسرا شخص اتنا عرصہ کسی بھی ملک کا وزیرِ اعظم نہیں رہا ہے۔ سنگاپور ایک گمنام اور پسماندہ جزیرہ تھا جسے انہوں نے ایک انتہائی ترقی یافتہ اور اہم ملک میں بدل دیا۔ انہوں نے سنگاپور کے دفاع کے لئے مؤثر حکمتِ عملی اپنائی۔ سنگاپور شائد دنیا کا واحد ملک ہے جہاں گورنمنٹ سیکٹر کے

UrduDost Library UrduDost.com

ملازمین کی تنخواہیں اور مراعات پرائیویٹ سیکٹر کے برابر ہیں۔ اور گورنمنٹ سیکٹر میں کام کرنے والے کسی بھی صورت میں پرائیویٹ سیکٹر سے پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے کم نہیں ہیں۔ یہ صورتِ حال روایتی سوشلزم و کیمونزم اور سرمایہ دارانہ نظام سے مختلف ہے اور قابلِ توجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں متعدد مما لک میں سنگاپور کا ماڈل اپنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔۔۔ لی کوان یو کی ایک دلچسپ پالیسی سنگاپور میں جسمانی سزا کا تصور ہے۔ مسلح افواج، دفاتر، سکول اور دیگر اداروں میں غلطی کا ارتکاب کرنے والوں کو بید کی چھڑی سے پیٹا جاتا ہے۔ بقول لی کوان یو کے ،معلوم نہیں دنیا کے اکثر مہذب مما لک میں غلطیوں کے ازالے کے لئے مار پیٹ کے نظام کو کیوں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، حالانکہ اس عمل کے بہترین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لی کہتے ہیں کہ ان کے برطانیہ کے زمانہ طالبعلمی میں انہیں اور ان کے ہم جماعتوں کو بید کی چھڑی سے پیٹا گیا تھا کیونکہ وہ کالج وقت پر نہیں پہنچتے تھے۔ اُس پٹائی کے بعد وہ کبھی تاخیر سے نہیں پہنچے۔ لیکن افسوس برطانیہ میں ایسی سنہری روایات دم توڑ چکی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ برطانیہ عہدِ حاضر میں ترقی کی معراج نہ پا سکا۔ ہمارے سرکاری سکولوں میں پڑھائی ہو نہ ہو، لی کوان یو کی پالیسی پر عمل ضرور ہوتا ہے اور یہی اور صرف یہی راز ہے ہمارے سرکاری سکولوں کی قابلِ رشک ترقی کا۔ چونکہ سنگاپور کے سکولوں میں پٹائی پر زور کم اور پڑھائی پر زیادہ ہے۔ اس لئے وہاں کے سکولوں کو ہمارے معیار تک پہنچنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔

کیمبرج کی تاریخ کے مختلف ادوار میں جو کالج بنائے گئے، ان میں صدیوں تک صرف مردوں کو ہی تعلیم دی گئی۔۔۔ جس کی بنیادی وجہ شائد یہ ہے کہ مردوں کے مردانہ پن کو ٹھکانے لگانے کے لئے انہیں تعلیم دینا ازحد ضروری تھا۔ یا شائد یہ کہ خواتین کے بارے میں ان کی پختہ رائے تھی کہ تعلیم اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی لہذا توانائی، وسائل اور وقت کو مردوں پر ہی ضائع کرتے رہنا چاہیئے۔ آپ اپنی طبع و صنف کے مطابق بدگمانی کرنے کی پوری آزادی رکھتے ہیں۔۔۔ خواتین کو کیمبرج کے کالجوں میں حقِ طالبعلمی ملنے میں صدیاں لگیں۔ لیکن انہوں نے بھی کچھ نہ کچھ بدلہ لے ہی لیا ہے، وہ ایسے کہ انہوں نے ۱۸۶۹ء میں اپنے ایک الگ کالج کی بنیاد رکھی

UrduDost Library UrduDost.com

جس کا نام گِرٹن کالج ہے۔اس کالج میں مردوں کو داخلہ لینے میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔اور پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں اس کالج نے مردوں کو اس قابل جانا کہ انہیں بھی تعلیم دی جاسکتی ہے۔۔۔ہمارے ہاں اب بھی لاتعداد کالج ایسے ہیں جہاں مرد وخواتین کو علیحدہ علیحدہ تعلیم دی جاتی ہے۔کیونکہ ان کالجوں کے منتظمین کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ تعلیم کی ترویج صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں 'اجناسِ' انسان کو علیحدہ رکھا جائے کیونکہ ان کے اختلاط کے بعد انہیں تعلیم نہیں دی جاسکتی، ہاں تنبیہ کی جاسکتی ہے۔جس کا تعلیم کی طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہمارے مردانہ کالجوں میں پڑھنے والے لڑکے تعلیم کے معیار کو مقابلے کے ذریعے بلند کرنے کی خاطر ہمیشہ زنانہ کالجوں کی لڑکیوں کو اپنی کلاسوں میں دیکھنے کے خواہشمند رہے ہیں۔دوسری قسم کے لڑکے وہ ہیں جن کا شجرہِ نسب محمد شاہ رنگیلا سے بلاواسطہ جاملتا ہے۔یہ لڑکے، لڑکیوں کو ہرگز اپنے کالجوں میں لانے کے متمنی نہیں ہوتے۔ بلکہ خود ان کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کو اصلِ حیات سمجھتے ہیں۔اس طرح سے ان کو اپنے کالج کے لڑکوں کے شر سے مکمل چھٹکارا مل سکتا ہے اور اُن کی تمام توجہ اپنے مقصد کے حصول پر مرکوز ہوسکتی ہے۔مردانہ اور زنانہ کالجوں میں طلباء و طالبات کی ایک تیسری قسم بھی پائی جاتی ہے جسے 'زنانہ لڑکے' اور 'مردانہ لڑکیاں' کہا جاسکتا ہے۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے حضرات وخواتین کا اس ساری بحث سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔کیونکہ ان کے جدِ امجد بقراط وسقراط ہیں۔ یہ اپنی خشک طبائع سے مجبور ہوکر پڑھنے لکھنے میں وقت ضائع کرتے ہیں اور پہلی دو اقسام کے طلباء کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

گرِٹن کالج سے تعلیم حاصل کرنے والی نمایاں شخصیات میں اردن کے شاہ حسین کی پہلی بیوی دینا بنت عبدالحمید شامل ہیں۔ وہ قاہرہ، مصر میں پیدا ہوئیں۔ان کی شاہ حسین سے برطانیہ میں پہلی ملاقات ہوئی تھی جہاں دونوں زیرِ تعلیم تھے۔ بعد میں وہ رشتہِ ازدواج میں بندھ گئے۔مصر کے جمال عبدالناصر، عرب نیشنلزم کے جذبے میں سرشار، اس شادی کے پرجوش حامی تھے۔شادی کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن تھوڑا عرصہ بعد ہی ان کی طلاق ہوگئی تھی۔ملکہ دینا کو کئی سال اپنی بیٹی سے بھی نہیں ملنے دیا گیا تھا۔گرٹن سے تعلیم پانے والوں میں ڈنمارک کی ملکہ

UrduDost Library UrduDost.com

مارگریٹ دوئم بھی شامل ہیں۔گرامر کے غنڈوں کی بدکلامی کی وجہ سے لوگ انہیں ملکہ کہنے پر مجبور ہیں حالانکہ وہ بادشاہ ہیں۔کیونکہ وہ بلا شرکتِ خاوند گذشتہ چار دہائیوں سے ڈنمارک کے تخت پر قابض ہیں اور اپنی سلطنت سے دودھ کی نہریں نکالے ہوئے ہیں۔

کیمبرج میں پہلی کشتی رانی ریس جو ۱۸۲۹ء میں منعقد ہوئی تھی۔اس میں ایک ملاح کا نام جارج آگسٹس سیلون تھا جو اس وقت یونیورسٹی میں انڈر گریجویٹ سٹوڈنٹ تھا۔سیلون عملی زندگی میں عیسائی مذہب کی جانب راغب ہو گیا تھا اور بعدازاں وہ نیوزی لینڈ کا آرچ بشپ بنا۔نیوزی لینڈ میں اسکی خدمات بہت زیادہ ہیں۔سیلون کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ۱۸۸۲ء میں کیمبرج میں ایک کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کا نام سیلون کالج ہے۔یہ کالج سخت مذہبی تعصّبات کا حامل رہا ہے۔ابتداء میں اس کالج میں داخلے کے لئے صرف عیسائی طلباء ہی اہل سمجھے جاتے تھے۔اس کے علاوہ ان طلباء کو داخلہ دیا جاتا تھا جو پادریوں کی اولاد ہوتے تھے یا جو عملی زندگی میں پادری بن کر عیسائی مذہب کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔لیکن رفتہ رفتہ یہ تمام تعصّبات بھلا دیے گئے اور اس کالج میں مذہب وجنس کے تفریق کئے بغیر تعلیم کا حق دے دیا گیا۔آج اس کالج کا شمار کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز کالجوں میں ہوتا ہے۔

کیمبرج میں اس وقت تین کالج ایسے ہیں جو مردوں کو نا قابلِ تعلیم وتربیت جانتے ہوئے، خواتین کی تعلیم کے لئے مختص ہیں۔یہ نیونیم، مرے ایڈورڈ اور لوسی کیونڈش کالج ہیں۔موجودہ خواتین کالجوں میں سب سے قدیم نیونیم کالج ہے۔جو ۱۸۷۱ء میں قائم کیا گیا تھا۔انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں کیمبرج یونیورسٹی میں خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولت میسر آ گئی تھی لیکن یونیورسٹی میں ان کا مقام ومرتبہ طلباء کے برابر نہ تھا۔۔۔بیرونِ پاکستان اور بالخصوص ترقی یافتہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں طلباء اور طالبات کا مقام ومرتبہ وہی ہوتا ہے جو ہماری یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کا ہے۔یعنی پڑھائی لکھائی ،جس کے نتیجے میں بدہضمی ہوتی ہے،جس سے چھٹکارہ پانے کے لئے وہ کلاس رومز اور سیمیناروں میں تقاریر کرتے ہیں۔اس کا نتیجہ خواری کی شکل میں اور کبھی کبھی نوکری سے برخاستگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔۔۔طالبات کو طلبا کے برعکس کسی قسم

UrduDost Library UrduDost.com

کے انتظامی امور میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ یونین کا الیکشن نہیں لڑ سکتی تھیں اور نہ ہی کسی کو ووٹ دے سکتی تھیں۔۔۔ حیرت ہے پھر بھی طلباء، یونین کے الیکشن لڑا کرتے تھے، حالانکہ کسی بھی قسم کی لڑائی صرف زر، زن، زمین کے لئے جائز ہے۔ ان کے علاوہ کسی کے لئے لڑنا جھگڑنا فتنہ وفساد اور رذالت کی نشانی ہے۔۔۔ بیسویں صدی کے مختلف ادوار میں خواتین طالبات کو طلباء کے برابر حقوق حاصل ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس حد تک کہ نیونیم کالج سے تعلیم مکمل کرنے والی ایلسن رچرڈ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۱۰ء تک کیمبرج یونیورسٹی کی وائس چانسلر رہی ہیں۔ وہ یونیورسٹی کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں، تین سو چوالیسویں وائس چانسلر اور پہلی خاتون وائس چانسلر تھیں۔۔۔ امید ہے چھ سو اٹھاسیویں وائس چانسلر، دوسری خاتون وائس چانسلر ہوں گی جو جلد ہی، لگ بھگ ۲۸۱۰ء میں، اپنا عہدہ سنبھال لیں گی۔ وائس چانسلر بننے کی دوڑ میں خواتین مردوں سے آگے نکل رہی ہیں۔ مردوں کو اس صورتِ حال میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ کیمبرج یونیورسٹی کا دوسرا کالج جو خواتین کے لئے مختص ہے، وہ مرے ایڈورڈ کالج ہے۔ اس کالج کی بنیاد ۱۹۵۴ء میں رکھی گئی تھی۔

پچھلی صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائی میں جب کیمبرج کے زیادہ تر کالجوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی تعلیمی مواقع میسر آنا شروع ہوئے تو یہ بحث شروع ہو گئی تھی کہ برابری کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خواتین کے مخصوص کالجوں کو بھی مردوں کو داخلہ دینا چاہئے۔ قریباً اسی دور میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے خواتین کے لئے مختص کالجوں نے مردوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیے تھے۔ لیکن کیمبرج کے خواتین کے لئے مخصوص کالجوں میں تا دمِ تحریر ایسا نہیں ہوا ہے۔ امکان یہی ہے کہ یہاں بھی ایک نہ ایک دن مردوں کو داخلہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ مرے ایڈورڈ کالج کی ایک تعلیم یافتہ خاتون، بی۔بی۔سی کی نیوز کاسٹر اور اینکر پرسن مشعل حسین ہیں۔ ان کے والدین پاکستان سے ہجرت کر کے برطانیہ آئے تھے۔ مشعل نے مرے ایڈورڈ کالج سے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ موجودہ دور میں بی۔بی۔سی نیوز اور دیگر ٹی۔وی۔ چینلز میں مشعل کو ایک منجھے ہوئے نیوز کاسٹر اور اینکر پرسن کی حیثیت حاصل ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں تیسرا کالج جو خواتین

UrduDost Library UrduDost.com

کے لئے مخصوص ہے، اس کا نام لوسی کیونڈش کالج ہے جو ۱۹۶۵ء میں بنایا گیا تھا۔ یہاں چار کالج ایسے بھی ہیں جو صرف 'میچور سٹوڈنٹس' کے لئے مختص ہیں۔ میچور سٹوڈنٹ ہونے کی شرط یہ ہے کہ داخلے کے وقت سٹوڈنٹ کی طبعی عمر کم از اکیس برس ہو۔۔۔ ذہنی یا جذباتی عمر پر کوئی قید نہیں۔۔۔ یہ کالج ہیوس ہال، سینٹ ایڈ منڈ، وولف سن اور لوسی کیونڈش ہیں۔ پہلے تین کالج مخلوط تعلیم جبکہ لوسی کیونڈش صرف خواتین کے لئے ہے۔ ان کے علاوہ دو کالج ایسے بھی ہیں جو صرف پوسٹ گریجویٹ سٹوڈنٹس کے لئے ہیں۔ یہ کلئیر ہال اور ڈارون کالج ہیں۔

انگلینڈ میں رہنے والا ہر شخص '۱۰۔ ڈاوننگ سٹریٹ' سے آگاہ ہے۔ یہ برطانوی وزیر اعظم کی قیام گاہ ہے۔ یہ سٹریٹ سترھویں صدی کے سپاہی، مدبر، سیاستدان اور سفارتکار سر جارج ڈاوننگ کے نام سے منسوب ہے۔ ڈاوننگ کے پوتے کا نام بھی جارج ڈاوننگ ہی تھا۔ تاریخ میں اسے 'سر جارج ڈاوننگ۔ بیرونٹ سوئم' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ ایک متمول آدمی تھا۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے اپنی وصیت میں کہا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد اسکے کزن کو دے دی جائے اور اگر اس کے کزن کی موت بھی واقع ہو چکی ہو تو اس کی جائیداد سے کیمبرج میں ایک کالج تعمیر کر دیا جائے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے کزن کی بھی جلد ہی موت واقع ہو گئی تھی۔ لیکن ایک طویل عرصہ تک اس کے رشتے دار اسکی وراثت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس دوران جائداد کی وراثت کے لئے قانونی جنگ جاری رہی۔ بالآخر قانونی جنگ تمام ہوئی اور ۱۸۰۰ء میں ڈاوننگ کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کالج نے مختلف عمارات، چیپل، لائبریری اور دیگر سہولیات کا اضافہ کر لیا ہے۔ اور آجکل اس کا شمار کیمبرج کے خوبصورت کالجوں میں ہوتا ہے۔ یہ کالج قانون اور طب کی تعلیم کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کیمبرج کے تمام کالجوں میں سب سے زیادہ سٹوڈنٹس اس وقت 'ہومرٹن کالج' میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ آجکل اس کالج میں سٹوڈنٹس کی تعداد قریباً بارہ سو ہے۔ ہومرٹن کی ابتداء کے بارے میں کوئی حتمی رائے موجود نہیں ہے۔ یہ کالج سترھویں یا اٹھارھویں صدی میں لندن میں ایک آزاد اکیڈمی کی صورت میں بنایا گیا تھا۔ اس عہد میں کوئی کالج مذہبی اداروں کی

UrduDost Library UrduDost.com

سر پرستی کے بغیر کام نہیں کرسکتا تھا۔ اور مذہبی سر پرستی کے زیرِ سایہ تعلیمی اداروں میں آزاد تعلیمی ماحول کا وجود میں آنا ممکن نہ تھا۔ اس صورتِ حال میں ہومرٹن ان اداروں کی شکل میں سامنے آیا تھا جہاں آزادیِ افکار کو اولین اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن اس ادارے کو با قاعدہ کالج کی حیثیت حاصل کرنے میں صدیوں کا سفر طے کرنا پڑا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یہ ادارہ کیمبرج شفٹ ہو گیا تھا۔ جہاں اس کی تعلیمی سرگرمیاں کیمبرج یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہوگئیں۔ اس کو مکمل کالج کا درجہ ۲۰۱۰ء میں ملا ہے۔

بیسویں صدی کی برطانوی تاریخ اور دوسری جنگِ عظیم کا نام ذہن میں آتے ہی سر ونسٹن چرچل کا نام یاد آ جاتا ہے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے ہنگام برطانیہ کے وزیرِ اعظم تھے اور جنگ کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ منسوب چرچل کالج کیمبرج سٹی سنٹر سے دور مغربی کیمرج میں تعمیر کیا گیا ہے۔ آجکل مغربی کیمبرج میں نئے نئے ادارے، انسٹیٹیوٹ کھل رہے ہیں اور یہ جدید کیمبرج کے طور پر ابھر رہا ہے۔ چرچل امریکہ کی مشہور زمانہ یونیورسٹی 'ایم۔ آئی۔ ٹی' کے تعلیمی معیار سے بہت متاثر تھے اور اسی طرز کا ایک تعلیمی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ ایم۔ آئی۔ ٹی کی بنیادی شہرت سائنس اور انجینئر نگ کے میدان میں ہے۔ ابتداء میں چرچل انہی مضامین کی تعلیم کے لئے کالج بنانا چاہتے تھے لیکن کافی غور و خوض کے بعد طے یہ پایا کہ اس نئے کالج میں باقی مضامین کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے۔ اگرچہ اس میں سائنسی مضامین کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اور ستر فیصد سٹوڈنٹس کا تعلق سائنس سے متعلق مضامین سے ہوتا ہے۔ چرچل کالج میں کیمبرج یونیورسٹی کے روایات کے مطابق ایک چیپل کی تعمیر بھی کی گئی ہے۔ اس کالج سے منسلک ایک فیلو، جس کا نام فرینسس کرک ہے، نے چیپل کی تعمیر کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تھا۔ کرک ایک معروف سائنسدان ہے جس کا میدانِ تحقیق مائیکرو بائیالوجی ہے۔ اس نے ۱۹۵۳ء میں ڈی۔ این۔ اے کے مالیکیول کی ساخت تلاش کرنے میں معاونت کی تھی جس بنیاد پر اسے ۱۹۶۲ء میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔ اس قدر اہم سائنسدان کا کالج سے استعفیٰ دینا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ کرک نے کہا تھا کہ کالج میں چیپل بنانے سے بہتر ہے کہ قحبہ خانہ کھول لیا جائے۔ کالج انتظامیہ نے کرک کو

UrduDost Library UrduDost.com

استعفیٰ واپس لینے کے لئے چیپل کے نام میں تبدیلی کی تھی۔اب اسے 'چرچل کالج چیپل' کہنے کی بجائے 'چیپل ایٹ چرچل کالج' کا نام دیا گیا ہے اور چیپل کے انتظامی امور نبٹانے میں بھی ترامیم کی گئی ہیں۔ چرچل کالج کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اس نے اپنے مختصر عرصے میں ہی قریباً بارہ نوبل انعام یافتہ سائنسدان پیدا کئے ہیں جو یقیناً چرچل کی روح کے ایصالِ ثواب کے لئے کافی ہیں۔انٹرنیٹ کا مشہور سرچ انجن 'ایلٹا وسٹا' مائیکل بروز نامی انجینئر نے بنایا تھا جو اپنی پی۔ایچ۔ڈی کے دوران چرچل کالج کا رکن رہا ہے۔کیمبرج میں رابنسن کالج کی بنیاد ۱۹۷۷ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ کالج سر ڈیوڈ رابنسن کے نام سے منسوب ہے۔رابنسن کیمبرج میں پیدا ہوا تھا۔ وہ گھڑ دوڑ کے کاروبار سے منسلک ہوگیا۔اس نے اس کاروبار سے بے تحاشا دولت کمائی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی تاریخ میں سب سے زیادہ عطیہ دینے والا شخص ہے۔اس نے کیمبرج میں کالج بنانے کے لئے اٹھارہ ملین پاونڈ چندہ دیا تھا۔آج یہ کالج ایک توانا ادارہ بن چکا ہے اور اعلیٰ تعلیمی معیار قائم رکھے ہوئے ہے۔ برطانیہ کے موجودہ نائب وزیرِ اعظم 'نک کلیگ' اسی کالج سے تعلیم یافتہ ہیں۔

UrduDost Library UrduDost.com

نوبل انعام یافتگان

عہدِ حاضر میں نوبل انعام پوری دنیا میں انتہائی اہم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ انعام سویڈن کے مشہور انجینئر اور کیمیا دان 'الفریڈ نوبل' کے نام سے منسوب ہے۔ وہ سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہوم میں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان میں کئی افراد انجینئر تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں ایجادات کے انبار لگا دیے تھے۔ اس نے تین سو پچپن ایجادات کیں۔ جن میں سب سے مشہور ایجاد ڈائنا مائیٹ ہے۔ جو دھماکہ خیز مواد میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ایجادات کی بدولت بہت دولت کمائی۔ ۱۸۸۸ء میں نوبل نے ایک فرانسیسی اخبار میں اپنے بارے میں تعزیت نامہ پڑھا۔ جس کا عنوان تھا 'موت کا سوداگر مر گیا'۔ یہ تعزیت نامہ ایک غلط فہمی کی بنیاد پر شائع ہوا تھا۔ دراصل الفریڈ نوبل کے بھائی کی وفات ہوگئی تھی لیکن غلطی سے یہ سمجھا گیا کہ نوبل فوت ہوگیا اور تعزیت نامہ الفریڈ نوبل کے بھائی کے بجائے اسی کے حوالے سے شائع کر دیا گیا۔ تعزیت نامے کی عبارت نے نوبل کو دہلا کر رکھ دیا اور اسے یہ احساس ہوا کہ اُس کے مرنے کے بعد لوگ اسے کس طرح یاد کریں گے۔ اس نے غور وخوض کے بعد طے کیا کہ وہ اپنی دولت، جو اس نے جنگ وجدل کی ترقی کے لئے کی گئی ایجادات سے اکٹھی کی ہے، کو سائنس اور امن کی ترویج کے لئے وقف کر دے گا۔۔۔ گویا تمہی نے درد دیا تمہی دوا دو گے۔

نوبل نے اپنی زندگی میں متعدد بار اپنی وصیت لکھی تھی۔ وہ اپنی جائیداد کسی کے نام کر دیتا۔ لیکن پھر اسے خیال آتا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی وصیت بدل دیتا اور اپنی جائیداد کسی دوسرے کے نام لکھ دیتا۔۔۔ ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں ہے جو پچاس برس کی حد عبور

UrduDost Library UrduDost.com

کرتے ہی اپنی اولاد کو جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ اور اگلے پچاس برس انہی دھمکیوں سے کام چلاتے ہیں۔ ان دھمکی آمیز ولبریز برسوں میں اولاد کی صرف ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ کاش دھمکی سچ ہو جائے اور وہ جائیداد کے ساتھ ساتھ بزرگوں سے بھی ہاتھ دھو لیں۔۔۔نوبل کی آخری وصیت کے مطابق اس کی ۹۴ فیصد دولت سے نوبل انعام کی ابتداء کی گئی تھی۔ نوبل کی دولت میں سے ۳۱ ملین سویڈش کرونا، جو ۲۰۰۸ء میں قریباً ۱۸۶ ملین امریکی ڈالر بنتے ہیں، نوبل انعام دینے کے لئے مہیا کئے گئے تھے۔ اس دولت اور نوبل انعام کے انتظام کے لئے ایک فاؤنڈیشن بنائی گئی تھی جس کا نام نوبل فاؤنڈیشن رکھا گیا تھا۔ اس فاؤنڈیشن کا قیام ۱۹۰۰ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس وقت اس فاونڈیشن کا بنیادی مقصد نوبل انعام کے لئے وسائل مہیا کرنا ہے۔ جس بنا پر اسکی سرگرمیاں زیادہ تر سرمایہ کاری پر مبنی ہیں۔ یہ فاونڈیشن اپنے سرمائے کو مختلف کاروباری سرگرمیوں میں استعمال کر کے منافع کماتے ہیں اور اس منافع سے ہر سال نوبل انعام دینے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نوبل فاؤنڈیشن انعام دینے والے چار اداروں پر مشتمل ہے۔ یہ ادارے رائل سویڈیش اکیڈمی آف سائنسز، نوبل اسمبلی، سویڈیش اکیڈمی اور ناروے کی نوبل کمیٹی ہیں۔

نوبل انعام طبیعات، کیمیا، فزیالوجی اور میڈیسن، ادب اور امن کے مضامین میں عطا کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ان مضامین میں معاشیات کا بھی اضافہ کر دیا گیا اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ نوبل انعام مزید کسی شعبۂ علم و فن میں نہیں عطا کیا جائے گا۔ انسانی زندگی کا ہر فیصلہ، خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، وقت اور عہد کے ساتھ بندھا ہوتا ہے اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ اس میں تبدیلی آسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے زمانوں میں نوبل انعام کے لئے مخصوص علم کے میدانوں میں اضافہ و ترمیم ہو جائے۔ امن نوبل انعام ناروے کی نوبل کمیٹی عطا کرتی ہے جبکہ دوسرے تمام میدانوں میں یہ انعام سویڈن میں موجود نوبل فاؤنڈیشن کے ادارے دیتے ہیں۔ یہ انعام ہر سال دیے جاتے ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ انعام ۱۹۰۱ء میں دیے گئے تھے۔ اس انعام کی تاریخ میں صرف دوسری جنگِ عظیم کا دورانیہ ایسا رہا ہے جس میں یہ سلسلہ معطل ہوا تھا جو جنگ کے بعد پھر

UrduDost Library UrduDost.com

بحال کر دیا گیا تھا۔نوبل انعام دینے کے لئے ہر سال نوبل فاؤنڈیشن قریباً تین ہزار افراد کو نامزدگی فارم بھیجتی ہے۔ یہ افراد متعلقہ میدان علم وتحقیق میں ماہر ہوتے ہیں۔عام طور پر یہ افراد دنیا کے مختلف تعلیمی وتحقیقی اداروں کے پروفیسر ہوتے ہیں۔نوبل امن انعام کے لئے نامزدگی حکومتوں، بین الاقوامی امن وانصاف کی عدالتوں، سابقہ امن نوبل انعام پانے والوں اور دیگر افراد واداروے کرتے ہیں۔ان نامزدگیوں کی بنیاد پر نوبل کمیٹی تین سو افراد کو منتخب کرتی ہے۔ پھر ان منتخب افراد کے ناموں کو نوبل فاؤنڈیشن میں بحث وتمحیص، ماہرین کی آراء اور آخری مرحلے میں ووٹنگ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں نوبل انعام جیتنے والوں کے ناموں کو حتمی شکل دی جاتی ہے۔نوبل فاؤنڈیشن کے فیصلوں کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی اور یہ فاؤنڈیشن اپنے فیصلوں کا ریکارڈ پچاس سالوں تک خفیہ رکھتی ہے۔نوبل انعام پانے کے لئے ضروری ہے کہ انعام جیتنے والا زندہ ہو۔نوبل انعام عطا کرنے کے لئے سویڈن اور ناروے میں خصوصی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ یہ تقریبات عام طور پر ۱۰ دسمبر کے روز سویڈن کے شہر سٹاک ہوم اور ناروے کے شہر اوسلو میں منعقد ہوتی ہیں۔سٹاک ہوم میں سویڈن کے بادشاہ اور اوسلو میں نوبل کمیٹی کے چیئرمین، ناروے کے بادشاہ کی موجودگی میں یہ انعام دیتے ہیں۔نوبل انعام سونے کے بنے ہوئے میڈل، ڈپلومہ سرٹیفکیٹ اور نقد رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔نقد رقم کا تعین،نوبل فاؤنڈیشن اپنے سالانہ منافع کے مطابق کرتی ہے۔اور یہ رقم ہر سال مختلف ہوتی ہے۔نوبل انعام ایک فرد کے علاوہ دو یا تین افراد کو مشترکہ طور پر بھی دیا جاسکتا ہے۔جبکہ امن انعام افراد کے علاوہ تنظیموں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔عام طور پر اس تقریب سے پہلے نوبل انعام پانے والوں کے خصوصی لیکچرز کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے۔انعام دینے کی تقریب کے بعد ایک شاندار دعوتِ طعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔جس پر خطیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔۱۹۷۷ء میں مدر ٹریسا کو نوبل امن انعام دیا گیا تھا۔انہوں نے استدعا کی تھی کہ ان کے اعزاز میں دی جانے والی کھانے کی تقریب منسوخ کردی جائے اور جو رقم اس تقریب پر خرچ ہونا ہو، اس کو غریبوں پر خرچ کر دیا جائے۔اور یوں سات ہزار ڈالر کی رقم غریبوں میں تقسیم کی گئی تھی۔۔۔بڑا وہی ہوتا ہے جس کے قول وفعل سے بڑائی ظاہر ہو۔۔۔

UrduDost Library UrduDost.com

نوبل انعام کے حوالے سے بہت سارے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ایک اعتراض یہ ہے کہ اس انعام میں یورپ سے تعلق رکھنے والے لوگوں اوران کے کارناموں کوزیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔خصوصاً یورپ میں ایسے ادیبوں کو بھی یہ انعام مل چکا ہے جنہیں کم ازکم بہترین قرار نہیں دیا جا سکتا۔جبکہ دوسرے خطوں کے باکمال لوگ نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ایک انتہائی اہم مثال حال ہی میں امریکی صدر باراک اوباما کو دیا جانے والا امن نوبل پرائز بھی ہے۔جس وقت ان کی نوبل پرائز کے لئے نامزدگی ہوئی تھی، اس وقت انہیں امریکہ کا صدر بنے صرف گیارہ روز ہوئے تھے۔اُن گیارہ دنوں میں انہوں نے ایسا کونسا کارنامہ سرانجام دے دیا تھا کہ انہیں نوبل انعام دیا گیا۔اس کے علاوہ ۱۹۷۳ء میں نوبل امن انعام مشہور امریکی دانشور اور وزیر خارجہ ہنری کسنجر اور ویت نامی انقلابی سیاستدان لی تھو کو مشترکہ طور پر دیا گیا تھا۔تھو نے یہ انعام لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ویت نام میں اس وقت امن ہوا ہی نہیں تھا تو پھر کیسا کارنامہ اور کیسا انعام۔لیکن آفرین ہے ہنری کسنجر پر کہ وہ اسی انعام پر آج تک اتراتے پھرتے ہیں۔لی تھو کے علاوہ فرانس کے مشہور فلسفی اور ادیب سارتر نے بھی نوبل انعام لینے سے انکار کر دیا تھا۔کچھ افراد ایسے بھی ہیں جنہیں ان کی زندگی میں ایک سے زائد مرتبہ نوبل انعام سے نوازا گیا۔اس کی ایک مثال مادام کیوری ہیں جنہیں ۱۹۰۳ء میں طبیعات اور ۱۹۱۱ء میں کیمیا میں نوبل انعام دیا گیا۔

کیمبرج یونیورسٹی سے منسلک لوگوں نے تادمِ تحریر اٹھاسی نوبل پرائز حاصل کئے ہیں۔یہ لوگ بطور طالب علم، محقق یا استاد کیمبرج کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ان اٹھاسی نوبل انعامات میں انتیس (۲۹) طبیعات، پچیس (۲۵) میڈیکل سائنس، اکیس (۲۱) کیمیا، نو (۹) معاشیات، دو (۲) ادب اور دو (۲) ہی امن کے لئے دیے گئے ہیں۔کیمبرج یونیورسٹی کے اندر سب سے زیادہ نوبل انعام ٹرینیٹی کالج کے حصے میں آئے ہیں جن کی تعداد (۳۲) ہے۔آج تک دنیا میں چار افراد ایسے پیدا ہوئے ہیں جنہیں دو مرتبہ نوبل پرائز ملا ہے۔انہی میں سے کیمبرج کے سینٹ جان اور کنگز کالج کا فریڈرک سینگر نامی سائنسدان بھی ہے جسے ۱۹۵۸ء اور ۱۹۸۰ء میں کیمیا میں یہ

UrduDost Library UrduDost.com

انعام ملا۔ کیمبرج کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کے اکسٹھ گریجویٹس نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں۔ اس قدر بڑی تعداد دنیا کی کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارہ نے پیدا نہیں کی۔ باون افراد ایسے ہیں جو نوبل انعام حاصل کرنے سے پہلے یا انعام ملنے کے وقت کیمبرج کے تدریسی سٹاف میں شامل تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی کا سب سے پہلا نوبل پرائز ۱۹۰۴ء میں لارڈ ریلے نے کیمیائی عنصر آرگن دریافت کرنے پر حاصل کیا تھا۔ ریلے نے ٹرینیٹی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۰۵ء تک کیمبرج میں نیچرل فلاسفی کے پروفیسر رہے۔ وہ رائل سوسائٹی کے فیلو اور صدر بھی رہے۔ اس کے علاوہ وہ ہاؤس آف لارڈز کے رکن کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ ہاؤس آف لارڈز میں صرف سائنسی معاملات کے حوالے سے ہی رائے دیتے تھے۔ کیمبرج میں دوسرا نوبل پرائز جے۔ جے تھامسن کو ۱۹۰۶ء میں طبیعات کے میدان میں دیا گیا۔ وہ بھی ٹرینیٹی کالج کے طالبعلم رہے۔ نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے کالج کے ماسٹر بھی تعینات ہوئے۔ انہوں نے الیکٹران دریافت کیا تھا۔ اُن سے پہلے سائنسدانوں کا خیال تھا کہ ایٹم ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے۔ لیکن انہوں نے اس نظریہ کو الیکٹران کی دریافت کے ذریعے غلط ثابت کر دیا تھا۔ تھامسن کو ایک اور انتہائی منفرد اعزاز حاصل ہے جو شائد کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ اس کے ساتھ بطور معاون سائنسی تحقیق کرنے والے سات افراد نے بعد ازاں نوبل پرائز حاصل کیا کیونکہ تھامسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا استاد تھا اور اُس نے اپنے شاگردوں کو بہترین سائنسی تعلیم دی تھی۔ اس کے علاوہ اسکے بیٹے، جارج تھامسن، کو بھی ۱۹۳۷ء میں طبیعات میں نوبل پرائز ملا تھا۔ جارج تھامسن بھی اپنے باپ کی طرح کیمبرج یونیورسٹی اور ٹرینیٹی کالج سے منسلک رہا۔ کیمبرج کا تیسرے نوبل انعام یافتہ ردرفورڈ تھا۔ عہدِ حاضر میں ہر وہ بچہ جو سائنس کا طالب علم ہے، اسے ردرفورڈ کا ایٹمی نظریہ نصاب میں پڑھایا جاتا ہے۔ ردرفورڈ نیوزی لینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ جوہری طبیعات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اسے ۱۹۰۸ء میں کیمیا میں نوبل پرائز ملا۔ اُس وقت وہ کینیڈا کی مشہور یونیورسٹی میک گل سے وابستہ تھا۔ ردورفورڈ اپنے زمانہ طالبعلمی میں کیمبرج کا طالب علم رہا تھا۔ اس کے علاوہ نوبل پرائز ملنے

UrduDost Library UrduDost.com

کے بعد وہ کیمبرج میں کیونڈش لیبارٹری سے بطور ڈائرکٹر منسلک ہو گیا تھا۔ عام مشاہدہ ہے کہ بڑے باپ کی اولاد کم ہی بڑی ہوتی ہے۔ بالخصوص اگر بڑائی کو علم ودانش اور کردار وعمل کے آئینے میں دیکھا جائے۔لیکن یہاں اس کے برعکس ہوا ہے۔کیمبرج میں چوتھا نوبل پرائز ولیم بریگ اور اس کے بیٹے ولیم لارینس بریگ کو ۱۹۱۵ء میں طبیعات کے میدان میں ملا تھا۔ وہ دونوں کیمبرج کے ٹرینیٹی کالج سے وابستہ تھے۔ ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کی طرح، بنیادی کیمیا پڑھنے والا ہر طالب علم بوہر کے ایٹمی ماڈل سے بھی آگاہ ہے۔ یہ ماڈل نیل بوہر نامی ماہر طبیعات نے بنایا تھا۔ نیل بوہر کو ایٹمی ماڈل اور 'کوانٹم میکنکس' پر تحقیق کے حوالے سے ۱۹۲۲ء میں نوبل پرائز ملا تھا۔اس کا تعلق ڈنمارک سے تھا جہاں سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد وہ کیمبرج یونیورسٹی میں تحقیق کے لئے آیا تھا۔ وہ بھی ٹرینیٹی کالج سے منسلک رہا۔ بوہر نے مشہورِ زمانہ 'مین ہیٹن پراجیکٹ' میں بھی حصہ لیا تھا۔ مین ہیٹن پراجیکٹ وہ منصوبہ تھا جس کے تحت دوسری جنگِ عظیم میں ایٹم بم بنایا گیا تھا جو بعدازاں جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرایا گیا تھا۔

عجب اتفاق ہے کہ ۱۹۲۵ء تک کیمبرج کے دس افراد کو نوبل پرائز ملا۔ اور وہ تمام لوگ ایک ہی کالج یعنی ٹرینیٹی سے کسی نہ کسی حیثیت سے منسلک تھے۔ ٹرینیٹی کے بعد پہلا اور کیمبرج یونیورسٹی کا گیارہواں نوبل پرائز سڈنی سسکس کالج کے حصے میں آیا۔ یہ انعام سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے ماہر طبیعات چارلس ولسن کو ملا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں طبیعات کا نوبل پرائز پال ڈائریک اور ارون شروڈنگر کو مشترکہ طور پر ملا تھا۔ پال کا تعلق کیمبرج اور شروڈنگر کا آسٹریا سے تھا۔ یہ دونوں مشترکہ طور پر طبیعات کی شاخ کوانٹم میکنکس پر تحقیق کرتے تھے۔ پال، کیمبرج میں لیوکاسین پروفیسر آف میتھ میٹکس بھی رہا۔ وہ انتہائی کم گو تھا۔ اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں اور دوستوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں صرف ایک لفظ بولتا ہے۔ اپنی جوانی کے ایام میں، وہ ایک مرتبہ اپنے ایک ساتھی سائنسدان کے ہمراہ بحری جہاز پر سوار تھا۔ وہ دونوں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جاپان جا رہے تھے۔ ان دونوں کی مزاج مختلف تھے۔ پال تنہائی پسند اور اسکا ساتھی عام انگریزوں کی طرح محفل کا دلدادہ۔۔۔ عام طور پر انگریز مردوں کے

UrduDost Library UrduDost.com

نزدیک مجلسِ یاراں سے مراد ایسی مجلس ہوتی ہے جس میں زیادہ تر خواتین ہوں۔ ہم جنسوں کی محفل ہو تو وہ اسے دفتر کا ماحول ہی سمجھتے ہیں اور اگر کوئی انگریز مرد یا عورت واقعی اپنے ہم جنسوں کی انجمن سے لطف اندوز ہو تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک معاملہ ہو سکتا ہے۔۔۔ دورانِ سفر، پال کا دوست محفلِ حسن آباد کئے رکھتا۔ سارا دن گپ شپ سے دل بہلاتا، کبھی رقص کرتا اور کبھی موسیقی سے محظوظ ہوتا۔ پال نے اپنے دوست کی حرکتیں دیکھیں تو اس سے پوچھنے لگا۔ تم ناچتے کیوں ہو۔ اس کے دوست نے جواب دیا، جب مجھے کوئی حسین چہرہ ملتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ رقص کروں۔ پال نے نہایت حیرت سے مزید استفسار کیا۔ لیکن جب کوئی تمہیں ملتا ہے تو تم یہ کیسے جان لیتے ہو کہ وہ حسین ہے کہ نہیں۔۔۔ یونیورسٹی میں ہمارے ایک ہم جماعت تھے۔ ہاسٹل میں بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔ سارا دن پڑھتے رہتے۔ ہمیں یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہر وقت نصاب کی کتابیں کیسے پڑھی جا سکتی ہیں۔ ساری کتابیں پڑھ لیتے تو نئے سرے سے پھر وہی پڑھنا شروع کر دیتے۔ ہمارے دوست ان کا مذاق اڑاتے رہتے، اور وہ سب کو بے وقوف سمجھتے ہوئے پڑھائی جاری رکھتے۔ معلوم نہیں ایک دن اُن کے جی میں کیا آئی کہ ہم سے ایٹم کا ڈھانچہ سمجھنے لگے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ایٹم کے مرکزی حصے کو نیوکلیس کہتے ہیں جس کے گرد الیکٹران نامی ذرات چکر لگاتے ہیں۔ کہنے لگے، الیکٹران کو یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ میں نے گھڑی کی سوئیوں کے رخ پر یعنی (clock-wise) چکر لگانا ہے یا اس کی مخالف سمت میں یعنی (anticlock-wise)۔ یہ سوال سن کر ہم بھونچکے رہ گئے۔ اور ہم نے زندگی میں یہ تہیہ کر لیا کہ زیادہ پڑھنا تو درکنار، ایسا کرنے والوں کے سائے سے بھی بچ کر چلنا چاہئے۔۔۔ پال کی ایک اور دلچسپ عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی سے اپنی بیوی کا تعارف کرواتا تو اپنے برادرِ نسبتی کا نام لے کر کہتا کہ یہ اُن کی بہن ہے۔

عہدِ حاضر میں وٹامن کے تصور سے ہر شخص واقف ہے۔ وٹامن کی دریافت سر فریڈرک ہاپکن نامی سائنسدان نے کی تھی جسے ۱۹۲۹ء میں اسی کارنامے کی بناء پر میڈیسن اور فزیالوجی کا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ فریڈرک کیمبرج یونیورسٹی میں کیمیکل فزیالوجی کا پروفیسر تھا۔ اس نے وٹامن

UrduDost Library UrduDost.com

کے علاوہ کئی دوسری دریافتیں بھی کی تھیں۔ وہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک رائل سوسائٹی کا صدر بھی رہا۔ اگرچہ کیمبرج یونیورسٹی کے طلباء، اساتذہ اور محققین کو ملنے والے زیادہ نوبل پرائز سائنسی تحقیق بالخصوص طبیعات کے میدان میں کارناموں کی وجہ سے ملے۔ لیکن یہاں کے تعلیم یافتہ افراد دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں بھی اس انعام سے نوازے گئے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں فلپ بیکر کو امن کا نوبل پرائز ملا تھا جو ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک کنگز کالج کیمبرج کا طالبعلم رہا ہے۔ اس نے لیگ آف نیشنز بنانے کے لئے جدوجہد کی تھی۔ کیمبرج کے ایک اور فرزند کا نام برٹرنڈ رسل ہے۔ ہر وہ شخص جسے بیسویں صدی کے فلسفہ اور سائنس سے دلچسپی ہے، وہ رسل کے نام سے ضرور واقف ہے۔ وہ ریاضی، منطق اور سماجیات کا وسیع علم رکھتا تھا۔ وہ جنگ کے وجود کے خلاف تھا۔ اسے ۱۹۵۰ء میں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ اس نے ۱۸۹۰ء میں ٹرینیٹی کالج میں داخلہ لیا۔ بعدازاں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں لیکچرار کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ وہ اپنے نظریات کے اعتبار سے مروجہ معاشرتی اقدار سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس کی نجی زندگی بھی عجیب وغریب رہی ہے۔ اس نے ایلس نامی خاتون سے پہلی شادی کی تھی۔ ایک دن وہ سائیکل چلا رہا تھا کہ اس پر منکشف ہوا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتا۔ اس نے فوراً ہی اس بات کا اظہار اپنی بیوی سے کر دیا۔ جس نے غصے میں آ کر طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ رسل کہتا ہے کہ پہلی بیوی سے علیحدگی کی دوسری وجہ اس کی ساس بھی تھی جو ہر وقت اعصاب پر سوار رہتی تھی۔۔۔ اگر یہی رویہ کسی کو نوبل پرائز دلوا سکتا ہے تو ہمارے ہاں کم از کم ننانوے فیصد لوگوں کو یہ انعام ضرور مل جانا چاہئے۔۔۔ اسے اپنے دورہ روس میں ایک اور خاتون سے الفت ہوگئی۔ جب وہ اور اسکی محبوبہ واپس برطانیہ پہنچے تو اس وقت اسکی محبوبہ چھ ماہ کی حاملہ تھی۔ اس نے نہایت عجلت میں پہلی بیوی کو طلاق دے کر اپنی محبوبہ سے شادی کر لی جس سے اس کے ہاں دو بچوں کی ولادت ہوئی۔ دوسری شادی کے بعد وہ مشہورِ زمانہ شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی بیوی سے بھی عشق کرتا رہا۔ چند سالوں بعد اسے معلوم ہوا کہ اسکی بیوی ایک امریکی صحافی کے عشق میں گرفتار ہے۔ اپنی بیوی کی اس حرکت پر اس نے فلسفہ ومنطق کا دامن چھوڑا اور دوسری بیوی کو بھی فارغ کر دیا۔ لیکن اب وہ خود بھی فارغ ہو چکا تھا۔ اس فراغت سے جان چھڑانے کی خاطر اس

UrduDost Library UrduDost.com

نے آکسفورڈ سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون سے تیسری شادی کر لی جو اس کے بچوں کی نگہداشت کیا کرتی تھی۔ بعدازاں اس خاتون سے بھی علیحدگی ہوگئی اور وہ 'بے چارہ' چوتھی شادی کے لئے مجبور ہوگیا۔ رسل اصلاً جنگ کے وجود سے نفرت کرتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں وہ جنگ کے تمام فریقین کی مخالفت پر کمر بستہ رہا۔ جس بناء پر اسے ٹرینیٹی کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ نیویارک کے ایک کالج میں بھی پڑھاتا رہا جہاں اسکے اخلاقی نظریات کے خلاف احتجاج ہونے پر اسے نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس نے جنگ کے بارے میں اپنے موقف میں قدرے نرمی کر لی اور اس صورت میں جنگ کو درست قرار دینے لگا کہ کہیں ہٹلر دنیا پر قابض ہوکر جمہوریت کا بستر ہی نہ گول کر دے۔ اس نے سائنسی فلسفہ، اخلاقیات، تجزیاتی فلسفہ اور منطق پر معرکۃالآرا کتابیں تحریر کیں اور مروجہ اخلاقی اصولوں کو کھلا چیلنج کیا۔ وہ کسی مذہب کا قائل نہ تھا۔ اس نے ۱۹۶۷ء میں عربوں کے خلاف اسرائیلی جارحیت کی مذمت بھی کی تھی۔ وہ ۱۹۷۰ء میں انفلوئنزا کا شکار ہوکر چل بسا اور اپنی وصیت کے مطابق اس کو جلا کر ویلز کے پہاڑوں پر اسکی راکھ کو بکھیر دیا گیا کیونکہ وہ اصلاً وہیں سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا 'خبیث' تھا۔

کیمبرج یونیورسٹی کا ادب کے میدان میں دوسرا نوبل پرائز پیٹرک وائٹ کو ملا تھا۔ اس نے بارہ ناول، دو افسانوں کے مجموعے اور آٹھ ڈرامے تحریر کئے۔ وہ واحد آسٹریلین ہے جسے آج تک ادب میں نوبل پرائز دیا گیا ہے۔ وہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کنگز کالج میں فرانسیسی اور جرمن ادب کا طالبعلم رہا۔ اس کے والدین کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ بچپن میں اپنی بہن اور خادمہ کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتا تھا جبکہ اس کے والدین ساتھ والے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس صورتحال نے اس کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کی تنہائی کا احساس پیدا کر دیا جو ساری عمر اس کے ساتھ رہا۔ وہ ہم جنس پرست تھا۔ جب وہ کیمبرج میں زیرِ تعلیم تھا تو اسے اپنے ایک دوست سے الفت ہوگئی لیکن وہ اس خوف سے اظہار نہ کر سکا کہ کہیں وہ دوست ناراض ہوکر اُس سے قطع کلامی نہ کر لے۔ لیکن ایک روز اس کے دوست نے خود ہی اس سے اظہارِ الفت کر دیا۔ اپنی عملی زندگی میں وہ ایک یونانی آرمی آفیسر کو دل دے بیٹھا جس کے ساتھ اس نے بطور پارٹنر آسٹریلیا میں اٹھارہ سال گزارے۔۔۔

UrduDost Library UrduDost.com

ان عاداتِ قبیحہ کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کے خوبصورت پہلو بھی ہیں۔اس نے ویت نام جنگ میں حصہ لینے پر آسٹریلیا کی سخت مخالفت کی۔ وہ بادشاہت کے خلاف تھا۔اس کے ایک ناول کی بنیاد پر سٹیج ڈرامہ بنایا گیا تھا۔جس کے پہلے شو کے موقع پر ملکہ الزبتھ کو بھی مدعو کیا گیا۔اس نے بادشاہت سے نفرت کی بناء پر اس ڈرامے کے پہلے شو میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔آسٹریلیا میں یورینیم کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ جہاں سے یورینیم نکال کر برآمد کی جاتی ہے اور خطیر زرِمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ یہ یورینیم ایٹمی مواد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اور اس سے تباہ کن ہتھیار بنائے جاتے ہیں۔ پیٹرک آسٹریلیا کے ان افراد میں شامل رہا ہے جو یورینیم کو نکالنے اور اس کی تجارت کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ تجارت دراصل انسانوں کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں مزید انعامات لینے سے انکار کر دیا تھا تاکہ اُس کے بعد آنے والے لوگوں کو اعزازات دے کر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جا سکے۔

حیاتیات کے میدان میں ڈی۔این۔اے کے ڈھانچے کے علم نے سائنس کو ایک نئی اور بھرپور جہت سے روشناس کروایا۔ یہ ۱۹۶۲ء کی دریافت ہے۔جس کا سہرا کیمبرج کے تین سائنسدانوں کے سر ہے۔ یہ سائنسدان کلئیر کالج کے جیمز واٹسن، چرچل کالج کے فرانسس کرک اور سینٹ جان کالج کے موریس ولکنز ہیں۔ان تینوں کی مشترکہ تحقیق کی وجہ سے ڈی۔این۔اے دریافت ہوا تھا۔جس نے آنے والے دنوں میں حیاتیاتی سائنس میں انقلاب برپا کر دیا۔اس تحقیق کو ڈورتھی ہوجکن نامی خاتون سائنسدان نے آگے بڑھایا تھا۔ڈورتھی کیمبرج کی پہلی خاتون ہے جسے نوبل انعام سے نوازا گیا۔اسے یہ انعام کیمیا میں اسکی شاندار تحقیق کے نتیجے میں ۱۹۶۴ء میں ملا تھا۔ڈورتھی ہی وہ سائنسدان ہے جس نے انسولین کی ماہیت دریافت کی اور ذیابیطس جیسی ضرر رساں بیماری کا علاج تلاش کیا۔اسے انسولین کی ماہیت دریافت کرنے میں پینتالیس سال شب و روز محنت کرنا پڑی۔ وہ کیمبرج کے علاوہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہی۔اس کے سٹوڈنٹس میں برطانیہ کی مایہ ناز سیاستدان اور وزیرِاعظم مارگریٹ تھیچر بھی شامل ہے۔تھیچر کو ڈورتھی سے بہت عقیدت تھی۔اس نے اپنے دورِحکومت میں ڈورتھی کی تصویر ۱۰۔ڈاؤننگ سٹریٹ میں

UrduDost Library UrduDost.com

لگوائی تھی۔ روایتی سائنسدانوں کے برعکس، ڈورتھی سائنسی تحقیق کے علاوہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ کیمونسٹ پارٹی کی سرگرم حامی تھی۔ اور روس کے ہنگری پر حملے سے پہلے وہ روسی حکومتوں کی پالیسیوں کی مداح تھی۔ اس کی کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے امریکی حکومتوں نے اس کے امریکہ داخلے سے پہلے سی۔ آئی۔ اے سے کلیرنس لازمی قرار دے رکھی تھی۔ ڈورتھی کے استاد کا نام پروفیسر جان تھا۔ ڈورتھی کی شخصیت پر جان کا گہرا اثر تھا۔ جان نے اس کی سائنسی اور سیاسی تربیت کی تھی۔ اُس نے برسوں پروفیسر جان کے ساتھ کام کیا۔ کبھی جان اس کے لئے علم وآگہی کا مینارہ ہوتا اور کبھی وہ اس کی جان ہوتا۔ کچھ عرصہ وہ پروفیسر سے علم وفن سیکھتی اور جب اسے اندازہ ہوتا کہ جان اپنے عہد کا بہت بڑا سائنسدان ہے تو وہ سائنس کی خشکی سے محبت ووارفتگی کے سمندر میں کود جاتی۔ لیکن ابھی اسے دو چار غوطے ہی آتے تو اسکی عقل ٹھکانے آجاتی اور وہ پھر قلزمِ محبت سے نکل کر علم وفن کی پجاری بن جاتی۔ اس کی عقل دل پر حاوی رہتی جس کی وجہ سے وہ سائنس میں نوبل پرائز اور عشق میں ناکامی کا تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلاسیکی شعرا نے عاشق کی ہر خوبی کا ذکر کیا ہے لیکن کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ عاشق علمِ سائنس میں بھی تاک ہوتا ہے۔

نوبل پرائز کی ایک صدی کی تاریخ میں چار افراد نے یہ انعام دومرتبہ حاصل کیا ہے۔ ان افراد میں سے صرف ایک شخص زندہ ہے۔ جس کا نام فریڈرک سینگر ہے۔ وہ ۱۹۳۶ء میں کیمبرج کے سینٹ جان کالج میں پڑھنے آیا تھا۔ اسے پہلی دفعہ ۱۹۵۸ء میں پروٹین بالخصوص انسولین کی ماہیت پر تحقیق کی وجہ سے علمِ کیمیا میں نوبل پرائز ملا تھا۔ اس نے یہ اعزاز پانے کے باوجود تحقیق جاری رکھی اور دوسری مرتبہ بائیس برس بعد ۱۹۸۰ء میں نیوکلیئک ایسڈ پر تحقیق کرنے پر دوبارہ کیمیا ہی میں نوبل پرائز حاصل کیا۔۔۔ حیرت ہے کہ اسے نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد محنت اور تحقیق کرنے جیسی بری عادت سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ پچاس برس پہلے، ہمارے ہاں پڑھائی لکھائی کی آخری منزل بی۔ اے ہوا کرتی تھی۔ اس سے آگے پڑھنے والے کا اُس کے اہل خانہ حقہ پانی بند کر دیتے تھے۔ کیونکہ عیاشی کی ایک حد ہوتی ہے جو اُس زمانے میں بی۔ اے ہوا کرتی تھی۔

UrduDost Library UrduDost.com

ایم۔اے کرنا گمراہی اور بدچلنی کے زمرے میں آتا تھا۔اور خدشہ ہوتا تھا کہ اس گمراہی کی اگلی منزل اشترا کی نظریات کی بدہضمی ہوگی جس سے جیل جانے کی راہیں کھلیں گی اور چکی پیسنے میں مہارت حاصل ہوجائے گی۔اب چونکہ بی۔اے کرنے سے پہلے اور بعد میں حکومت آپ کو جاب نہیں دے سکتی تو ایجنسیوں نے حکومت کومشورہ دیا ہے کہ بی۔اے کرنے والے تمام نوجوانوں کو پی۔ایچ۔ڈی تک پڑھنے کی تلقین کی جائے۔اس کام کے دو فائدے ہوں گے۔پہلا یہ کہ آپ کسی نہ کسی امتحان میں ناکام ہوئے تو آپ کو جاب نہ دینے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔اور اگر آپ انتہائی ڈھیٹ واقع ہوئے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اُس وقت تک حکومت تبدیل ہوچکی ہوگی اور اپنے کئے کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔۔۔

ترقی یافتہ اقوام اور بالخصوص یورپ میں علم اور تحقیق کی روایت پرانی ہے۔یہاں صدیوں سے تحقیق کا ماحول رہا ہے جس کی وجہ سے محققین نئی نئی ایجادات اور دریافتیں کرتے رہے ہیں اور نوبل پرائز سے نوازے جاتے رہے ہیں۔لیکن برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا نام بھی ہے جس نے ہندوستان میں تعلیم پائی اور وہیں پر تحقیق کرنے کے نتیجے میں نوبل پرائز بھی حاصل کیا۔یہ عظیم سائنسدان سی۔وی۔رامن ہے جو مدراس میں پیدا ہوا۔اس نے روشنی کے پھیلاؤ پر تحقیق کی تھی اور طبیعات میں معروف 'رامن ایفیکٹ' نامی تصور دریافت کیا تھا۔وہ کبھی کسی غیر ہندوستانی درسگاہ میں تعلیم و تحقیق کے لئے قیام پذیر نہیں رہا۔اسے ۱۹۳۰ء میں طبیعات میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔رامن پہلا غیر انگریز تھا جسے سائنس میں نوبل پرائز دیا گیا۔اس کو ایک اور بہت بڑا اعزاز حاصل ہے۔اسے روس کی جانب سے لینن امن انعام بھی دیا گیا تھا۔اس نے طبلے کی آواز کی لہروں پر بھی ریسرچ کی تھی۔وہ اپنی سائنسی دریافت کے حوالے سے بہت پر اعتماد تھا۔اسے کامل یقین تھا کہ وہ نوبل پرائز حاصل کرلے گا۔اس نے ۱۹۲۸ء میں نوبل انعام حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اعلان ہونے سے پہلے ہی اپنے یورپ کے سفر اور رہائش کے انتظامات مکمل کرلئے تھے۔لیکن جب ناموں کا اعلان ہوا تو اس کا نام انعام حاصل کرنے والوں میں نہیں تھا۔اس سے اگلے برس پھر یہی معاملہ ہوا۔جس کی وجہ سے رامن کافی مایوس ہوا تھا لیکن بالآخر ۱۹۳۰ء میں اسے

UrduDost Library UrduDost.com

نوبل انعام مل ہی گیا۔۔۔ہم نے آج تک بہت سارے دوستوں کو بہلا پھسلا کران کے امتحانات کے خاتمے پر دعوتیں اڑائی ہیں۔ کیونکہ ہم دوستوں کو یقین دلا دیتے کہ وہ ہر صورت میں معرکہء امتحان سر کرلیں گے۔ اکثر یوں ہوتا تھا کہ نتیجہ نکلنے پر ہمیں پُرسہ دینا پڑتا۔لیکن اس میں بھی ہمیں نہایت مسرت ہوتی کہ ہمارے دوست دوبارہ امتحان دیں گے اور پھر نتیجہ آنے سے پہلے دعوتِ طعام دیں گے اور بعد میں اپنی نادانی پر افسوس کریں گے۔ دنیا کا کاروبار بلا وجہ رواں دواں نہیں ہے۔۔۔رامن کے ایک بھتیجے کا نام سبرامنیم چندراشیکھر تھا۔وہ ۱۹۱۰ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ اسے ستاروں کے ارتقاء پر تحقیق کے صلے میں ۱۹۸۳ء میں طبیعات کا نوبل پرائز ملا تھا۔ اسکے خاندان کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا۔ اسکی پیدائش کے وقت ،اسکا باپ ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا۔وہ کیمبرج میں ٹرینیٹی کالج کا طالبعلم رہا۔اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ یونیورسٹی آف شکاگو میں بطور پروفیسر گزارا۔ وہ ۱۹۹۵ء میں شکاگو میں ہی فوت ہوا تھا۔ ہندوستان کے ایک اور ہونہار سپوت کا نام امرتیا سین ہے۔ اسے ۱۹۹۸ء میں معاشیات کے میدان میں نوبل پرائز ملا تھا۔ اس کی تحقیق کا موضوع ویلفیئر اکنامکس رہا ہے۔اس نے قحط اور خوراک کی کمی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کے تدارک پر بے حد مفید کام کیا ہے۔ وہ ۱۹۳۳ء میں مغربی بنگال میں پیدا ہوا۔اس کے نانا کا رابندر ناتھ ٹیگور سے گہرا تعلق تھا۔ ٹیگور نے ہی اس کا نام امرتیا رکھا تھا۔ وہ ہندوستان میں صرف تئیس برس کی عمر میں پروفیسر تعینات ہو چکا تھا۔ اس نے کلکتہ یونیورسٹی، دہلی سکول آف اکنامکس، آکسفورڈ یونیورسٹی ، انگلینڈ اور ہاورڈ یونیورسٹی میں بھی پڑھایا۔ وہ واحد ایشائی ہے جو کیمبرج کے کسی کالج کا ماسٹر یعنی سربراہ مقرر ہوا۔ اس نے بطور ماسٹر ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۴ء تک ٹرینیٹی کالج کی رہنمائی کی اور ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ معروف پاکستانی ماہر معیشت ڈاکٹر محبوب الحق سے متاثر ہے۔اس کی کتابوں کے تیس سے زائد زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ امرتیا سین کے علاوہ کیمبرج کے جیمز مرلیس نامی ماہر معیشت کو ۱۹۹۶ء میں سیاسی معاشیات پر تحقیق کے سلسلے میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔

UrduDost Library UrduDost.com

میوزیم اور آرٹ گیلریاں

انسان ہمیشہ سے اپنی تاریخ کی کھوج میں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں نادر اور قدیم اشیاء میں دلچسپی پائی جاتی ہے۔ لیکن شائد یورپ میں تاریخ سے انسیت باقی دنیا کی نسبت زیادہ ہے۔ کیمبرج میں تاریخ اور نوادرات سے دلچسپی اور مطالعے کی غرض سے کئی میوزیم اور آرٹ گیلریاں موجود ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے زیرِ انتظام آٹھ میوزیم ہیں۔ اور ان سب میں داخلہ مفت ہے یعنی کوئی براہِ راست آمدنی نہیں ہے۔ ان تمام عجائب گھروں کے اخراجات یونیورسٹی کے ذمے ہیں جو وہ اپنے ذرائع یا عطیات سے پوری کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے زیرِ انتظام عجائب گھروں کے علاوہ یہاں دیگر میوزیم بھی موجود ہیں۔ سب سے ممتاز 'فٹز ولیم میوزیم' ہے۔ فٹز ولیم دراصل آئر لینڈ کے ایک معروف خاندان کا نام ہے۔ اسی خاندان کے ایک ممتاز شخص، فٹز ولیم وسکاؤنٹ ہفتم نے اپنی وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ اسکی لائبریری اور آرٹ کی اشیاء سے ایک میوزیم بنا دیا جائے۔ اس میوزیم کی بنیاد ۱۸۱۶ء میں رکھی گئی تھی۔ فٹز ولیم ایک مالدار آدمی تھا۔ اس نے یہ میوزیم بنانے کے لئے ایک لاکھ پاؤنڈ کی خطیر رقم بھی عطیے میں دی تھی۔ اگر چہ یہ رقم آجکل بھی غیر معمولی ہے لیکن دو صدیاں قبل تو اسکی قیمت آج کی نسبت کئی گنا زیادہ تھی۔ اس میوزیم کی تعمیر میں ایک طویل عرصہ صرف ہوا اور اسے سیاحوں کے لئے ۱۸۴۸ء میں کھولا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میوزیم میں کئی نئی عمارات اور گیلریاں بنائی گئیں۔ سب سے آخری گیلری ۲۰۰۶ء میں پندرہ لاکھ پاؤنڈ کی لاگت سے مصری نوادرات رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

اس میوزیم کے مختلف شعبے ہیں۔ جن میں قدیم نودرات، اپلائیڈ آرٹ، سکے اور تمغے،

UrduDost Library UrduDost.com

قدیم مسودات اور شائع شدہ کتابیں اور پینٹنگز اور ڈرائنگز شامل ہیں۔ قدیم نوادرات میں مصر، سوڈان، یونان، روم، چین اور یورپ کی اشیاء موجود ہیں۔ اپلائیڈ آرٹ میں قدیم برطانوی اور یورپی برتن، فرنیچر، گھڑیال اور سامانِ حرب کے علاوہ چینی، جاپانی اور کوریائی آرٹ کے نمونے نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔ قدیم یونان و مصر اور افریقہ کے سکے اور تمغے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ نایاب ادبی اور تاریخی مسودات اس میوزیم کو دوسرے عجائب گھروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان مسودات میں قدیم موسیقی کی دھنوں پر مشتمل کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس میوزیم کا پینٹنگز اور ڈرائنگز کا شعبہ بہت عمدہ ہے۔ ایک گیلری میں برطانوی اور دوسری میں فرانسیسی مصوری کے اعلیٰ نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ ان پینٹنگز کو تاریخی ادوار کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اور ان کی موضوعات درباری اور شاہی زندگی سے مذہبی اور عام انسانوں کی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس میوزیم میں بہت سارے صفِ اول کے مصوروں، جن میں پکاسو بھی شامل ہے، کے شاہکار موجود ہیں۔

فٹز ولیم میوزیم کا بیرونی منظر

UrduDost Library UrduDost.com

فٹز ولیم میوزیم کی عمارت سہ منزلہ ہے۔ جس میں گراؤنڈ فلور، فرسٹ فلور اور تہہ خانہ شامل ہے۔ اسکے صدر دروازے سے گزر کر لابی کے ذریعے آپ فرسٹ فلور پر جا سکتے ہیں۔ جہاں وسیع ہال میں بہت سارے مجسمے موجود ہیں۔ یہ مجسمے مختلف مذہبی، سیاسی اور سائنسی شخصیات کے ہیں۔ اکثر سیاسی شخصیات پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان مجسموں کو دیکھ کر ہمیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان بے پناہ سیاسی اثر رکھنے والی شخصیات کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہوتے تھے یا ان کے لباس مجسمہ ساز کو پسند نہیں آئے اور اس نے موقع ملتے ہی اتار پھینکے۔ البتہ مشہور سائنسدان البرٹ آئن سٹائن کا مجسمہ چہرے اور سینے تک ہی محدود ہے۔ شائد اس لئے بھی کہ سائنسدانوں کے پاس قابلِ ذکر چیز دماغ ہی ہوتا ہے جس کے لئے اُن کا سر اور چہرہ بنانا ہی ضروری ہوتا ہے۔ اس میوزیم میں مصر سے لائی گئی ایک حنوط شدہ لاش بھی ہے۔ یہ کسی نوجوان کی لاش ہے جسکا قد پستہ تھا۔ اس کے علاوہ، قدیم مصری بادشاہوں کی حنوط شدہ لاشوں کے خول یا کفن بھی پڑے ہیں۔ جن پر مرنے والوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور ساتھ ہی قدیم زبانوں میں کچھ تحریر بھی ہے۔ جس کا الٹا سیدھا مطلب بنا کر آجکل کے پرانی زبانوں کے ماہر اپنی نوکریاں بچائے ہوئے ہیں۔ فٹز ولیم میوزیم میں قرونِ وسطیٰ کے سامانِ حرب کی نمائش کے لئے ایک شاندار گیلری بنائی گئی ہے۔ جسمیں جنگجوؤں کی تلواریں اور دیگر سامان کے علاوہ، پورے جسم پر پہننے والی زرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ زرہیں اسقدر بھاری ہیں کہ انہیں پہن کر تو انسان ایک قدم چل نہیں سکتا، معلوم نہیں میدانِ جنگ میں سورما لڑتے کیسے ہوں گے۔

چارلس ڈارون کے ایک قابل استاد کا نام جان ہنسلو تھا۔ وہ سینٹ جان کالج کا طالبعلم رہا اور بعد میں کیمبرج یونیورسٹی میں معدنیات کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ اسکی دلچسپی کا مرکز علمِ نباتات یعنی پودوں کے متعلق علم رہا۔ اس نے ۱۸۳۱ء میں کیمبرج میں ایک نباتاتی باغ کی بنیاد رکھی۔ یہ باغ کیمبرج شہر میں چالیس ایکڑ پر مشتمل ہے۔ اس میں آٹھ ہزار سے زائد پودوں کی اقسام پائی جاتی ہیں۔ یہ باغ کھیل وتفریح کے علاوہ تعلیم و تحقیق کے وسیع مواقع فراہم کرتا ہے۔ پودوں کے متعلق علم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ جگہ انتہائی اہم ہے۔ وہ یہاں مختلف موسموں، علاقوں، ملکوں

UrduDost Library UrduDost.com

اور برِاعظموں میں پائے جانے والے پودوں کا مطالعہ بآسانی کر سکتے ہیں۔ اگرچہ پودوں سے محبت دنیا کے ہر خطے میں پائی جاتی ہے لیکن شائد اس معاملے میں انگریزوں کا ذوق دوسری اقوام عالم سے بہتر ہے۔ انگریز، بطور قوم، پودوں سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کیمبرج کے نباتاتی باغ میں گورے، گوریاں اپنے خاندانوں کے ہمراہ گھومتی رہتی ہیں۔ اس نباتاتی باغ میں کرہ ارض کے مختلف حالات و موسموں میں پائے جانے والے حیران کن پودے موجود ہیں۔ یہاں ایک گلاس ہاؤس بنا ہوا ہے جس میں چکنی، ریتلی، بارانی، صحرائی خطوں میں پائے جانے والے پودوں کی نمائش کی گئی ہے۔ سمندر کے اندر پائے جانے والے پودے بھی موجود ہیں۔ ہم نے میٹرک میں پڑھا تھا کہ کچھ پودے ایسے بھی ہوتے ہیں جو مکھیوں، کیڑوں، پتنگوں وغیرہ کا شکار کر سکتے ہیں۔ یہ پودے ہم نے اسی باغ میں دیکھے۔ ان کی شاخوں پر مختلف رنگوں میں صراحیاں سی بنی ہوئی ہیں۔ جونہی کوئی کیڑا، پتنگا اس صراحی میں گھستا ہے، یہ بند ہو جاتی ہے اور پھر کیڑوں کی لاشیں اس پودے کو خوراک فراہم کرتیں ہیں۔۔۔ جانوروں سے باقی مخلوق کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انسان بھی درندگی میں کسی سے کم نہیں، لیکن پودوں سے کسی کمزور کو نقصان پہنچتے دیکھنا، حقیقتاً حیرانی کا باعث ہے۔۔۔ اس باغ کے ایک قطعے میں ان پودوں کی، تاریخی ادوار کی ترتیب کے ساتھ، نمائش کی گئی ہے جو انگلینڈ میں دنیا کے دوسرے خطوں سے لائے گئے۔ یہ معلومات اسقدر جامع ہیں کہ جو پودے صدیوں پہلے یہاں لائے گئے، ان کے اصل وطن اور جس عہد میں یہ سلطنتِ برطانیہ میں لائے گئے سب کچھ درج ہے۔ ایک قطعہ زمین انسانی جسم کے مشابہ بنایا گیا ہے۔ اور ہر عضو پر وہ پودے اور جڑی بوٹیاں اگائی گئی ہیں جن سے اُس عضو سے متعلق بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ یہاں پر کینسر اور دیگر انتہائی موذی بیماریوں کے علاج کے لئے معاون جڑی بوٹیاں بھی اگائی گئی ہیں۔ یہ مختصر قطعہ اراضی ہمارے یونانی حکیموں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس باغ میں انتہائی دور دراز کے علاقوں میں پائے جانے والے نایاب پودے بھی موجود ہیں۔ جن میں چین، افریقہ، ایشیاء، جنوبی امریکہ کے درخت شامل ہیں۔

کیمبرج میں کیٹل یارڈ نامی میوزیم ایک دلچسپ جگہ ہے۔ یہاں پر جدید آرٹ کا طریقہ کار

UrduDost Library UrduDost.com

دکھایا گیا ہے۔ پچھلی ایک صدی میں فلم کس طرح دکھائی جاتی رہی ہے۔ اس حوالے سے ہر دور کی ایجادات یہاں نمائش کی لئے رکھی گئی ہیں۔ اس میوزیم سے ملحق کیٹل یارڈ ہاؤس بھی ہے۔ یہ میوزیم دراصل ایک ایسے آرٹسٹ اور اسکی بیوی نے بنایا تھا جو لندن کے ایک میوزیم کا منتظم رہا تھا۔ اس نے اپنی ساری عمر آرٹ، سیاحت اور میوزیم کے انتظام وانصرام میں گزاری تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں لندن چھوڑ کر کسی پر سکون جگہ قیام کرنے کو ترجیح دی۔ وہ کیمبرج سے پڑھا ہوا تھا، اس لئے اُس نے یہیں رہنا پسند کیا۔ وہ ۱۹۵۶ء میں کیمبرج منتقل ہوا اور اس نے کیسل سٹریٹ پر ایک پرانے چرچ کے بالمقابل تین گھر لے کر رہائش اختیار کی اور ان تینوں گھروں کو ملا کر ایک میوزیم بنایا۔ وہ عام میوزیم اور گیلری سے مختلف طرز پر ایک میوزیم بنانا چاہتا تھا۔ وہ کیمبرج میں سٹوڈنٹس کے ساتھ آرٹ پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی رہائش گاہ پر مختلف پینٹنگز، فرنیچر، سکے، مسودے اور دیگر نادر اشیاء اکٹھی کر رکھی تھیں۔ اس نے ہر امتحانی ٹرم کے آخر پر اپنے گھر کو سٹوڈنٹس کے لئے کھولنے کا اہتمام کیا۔ اس طرح سٹوڈنٹس اس کے گھر آتے۔ اور وہ انہیں اپنی تمام چیزوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا۔ اس انتظام سے سٹوڈنٹس اُس ماحول اور گھر کو بھی دیکھتے جہاں آرٹ تخلیق کیا جاتا تھا۔ یہ ماحول اور آرٹسٹ کا رہن سہن، سٹوڈنٹس کو آرٹ کی طرف راغب کرنے میں مددگار رہوتا تھا۔ اس گھر میں ایک ہال نما کمرہ بھی ہے جہاں پر ایک بڑے سائز کا پیانو رکھا ہوا ہے۔ اس کمرے میں موسیقی کی محافل کا انعقاد کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں کیمبرج ٹاؤن میں سیوریج سسٹم اچھے طریقے سے کام نہیں کر رہا تھا۔ جب گٹر ابلنے لگتے تو گندے پانی کو بغیر صاف کئے دریائے کیم میں پھینکنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا گیا۔ جس کے تحت گندے پانی کے اخراج کے پائپوں کو کھلا اور گہرا کیا گیا اور پانی کو قریبی گاؤں ملٹن کے قریب موجود ایک بڑے فارم تک لے جایا گیا۔ اس نظام کو چلانے کے لئے ایک سیوریج ہاؤس بنایا گیا۔ جس میں کئی انجن نصب کئے گئے۔ یہ نظام ۱۹۶۸ء تک کامیابی سے کام کرتا رہا۔ بعدازاں سیوریج کا متبادل جدید نظام اپنا لیا گیا اور سیوریج ہاؤس کی ضرورت نہ رہی۔ اس سیوریج ہاؤس میں اپنے عہد کے نہایت جدید انجن

UrduDost Library UrduDost.com

نصب کیئے گئے تھے۔ چنانچہ اس کو انجنوں کے میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور اس کا نام کیمبرج میوزیم آف ٹیکنالوجی رکھ دیا گیا۔ اس میوزیم میں ٹیکنالوجی کے شاہکار وہ انجن موجود ہیں جب انگلینڈ بطور عالمی طاقت اپنے عروج پر تھا۔ اور اس میں پیدا کی گئی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں بہترین مانی جاتی تھی۔ اس میوزیم میں ایک صدی سے زیادہ پرانے بھاپ سے چلنے والے انجن موجود ہیں۔ یہ انجن آج بھی چل سکتے ہیں اور انہیں سال میں چند مخصوص دنوں میں چلایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں سٹیم انجنوں کی جگہ گیس انجن استعمال ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس سیوریج ہاؤس کے گیس انجن بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں الیکٹرک روم اور بوائلر روم بھی موجود ہے۔ یہاں انیسویں اور بیسویں صدی میں استعمال ہونے والی چھاپہ خانے کی مشینیں بھی رکھی گئی ہیں۔ اس میوزیم میں بچوں کے لئے ایک ٹرین بنائی گئی ہے۔ جس کی آٹھ دس بوگیاں ہیں۔ ہر بوگی میں چار بچے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس ٹرین کا چھوٹا سا انجن بھاپ کی طاقت سے چلتا ہے۔ اور بچوں کو میوزیم میں موجود ریلوے ٹریک پر سیر کرواتا ہے۔ یہ ریلوے ٹریک دواڑھائی فٹ چوڑا ہے۔ یہ میوزیم رضا کارانہ طور پر کام کرتا ہے۔ اس لئے یہاں با قاعدہ عملہ موجود نہیں ہے۔ چند ایک لوگ رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے ہیں اور مہینے میں دو چار دن چند گھنٹوں کے لئے یہاں کام کرنے آتے ہیں۔ اس طریقہ کار کی وجہ سے یہ میوزیم سال میں چند مخصوص دنوں کے لئے ہی عوام کے لئے کھولا جاتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر کا نام ایڈم سجوک تھا۔ اس نے ۱۸۰۸ء میں ریاضی کی تعلیم مکمل کی اور ۱۸۱۸ء میں ایڈورڈ ین چیئر آف جیالوجی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس انتخاب سے قبل، اسے جیالوجی کے مضمون کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ لیکن اس چیئر کے انتخاب کے بعد اُس نے جیالوجی کے مضمون میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اس میدان میں انتظامی اعتبار سے اہم خدمات سرانجام دیں۔ اس نے یونیورسٹی میں ایک بڑے جیالوجی سکول کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ اس نے جیالوجی میوزیم بنانے کے لئے تگ ودو شروع کی اور اپنی ذاتی آمدنی سے کئی اشیاء خرید کر ایک چھوٹے جیالوجی میوزیم کی بنیاد رکھی۔ اس

UrduDost Library UrduDost.com

کی وفات کے بعد اس کے دوستوں نے چندہ جمع کر کے اس میوزیم کو وسعت دی اور ۱۹۰۴ء میں جیالوجی میوزیم کا افتتاح کنگ ایڈورڈ ہفتم نے کیا۔اس میوزیم کو جیالوجیکل ٹائم یعنی ارضیاتی ادوار کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔اور یہاں موجود اشیاء اور نوادرات زمین کی تاریخ کے پانچ سو ملین سالوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔زمین پر موجود ہر خطے کی نمائندگی کرنے والی اشیاء موجود ہیں۔ برفانی ادوار، کم گہرے اور زیادہ گہرے سمندر، گرم پانیوں والے سمندر، جھیلیں، دریا، جنگل، صحرا، ساحل، خشکی، آتش فشاں علاقے غرضیکہ پانچ سو ملین سالوں تک ہر زمینی خطے کے بارے میں معلومات کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔یہاں پر قریباً پندرہ لاکھ فوسل، معدنی ذخائر اور دھاتوں کے نمونے نمائش کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔اس میوزیم کا ایک حصہ نظریہء ارتقا کے بانی چارلس ڈارون کے ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۶ء کے بحری سفر سے متعلق ہے۔اور وہ ارضیاتی نمونے بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں جو ڈارون نے اُس سفر کے دوران اکٹھے کئے تھے۔اس کے علاوہ، ڈارون کی ڈائری، جس میں وہ اپنی سائنسی و تحقیقی یادداشتیں لکھتا تھا، تحقیقی مقالہ جات، کتابیں، اور وہ رسائل و جرائد جن میں اس کے تحقیقی مضامین شائع ہوئے تھے، بھی موجود ہیں۔

کیمبرج میوزیم آف زوالوجی کرہ ارض پر پائے جانے والے جانوروں اور انکی تخلیق، تاریخ اور ارتقاء کے بارے میں قابلِ قدر معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ میوزیم انیسویں صدی کے اوائل میں بننا شروع ہوا تھا۔لیکن اس میں پائی جانے والی زیادہ اشیاء ۱۸۶۵ء سے ۱۹۱۵ء کے درمیانی عرصے میں اکٹھی کی گئی ہیں۔ یہ میوزیم مختلف ادوار سے گزرتا ہوا، اپنی موجودہ عمارت میں ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ منتقل ہوا تھا۔اس میوزیم میں پائے جانے والے جانوروں اور پرندوں کے ڈھانچے اور نمونے دنیا کے تمام براعظموں سے اکٹھے کئے گئے ہیں۔اور عہدِ حاضر میں پائے جانے والے جانوروں اور پرندوں کی اکثریت کے ماڈل یہاں دستیاب ہیں۔ دنیا میں پائے جانے والے پرندوں کو سائنسی لحاظ سے ۱۴۰ اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ان میں سے زیادہ تر اقسام کے پرندوں کے نمونے یہاں رکھے گئے ہیں۔سائنسی اعتبار سے چھپکلی اور سانپ ملتے جلتے

UrduDost Library UrduDost.com

رینگنے والے جانور ہیں۔ چھپکلی کی سولہ میں سے تیرہ اقسام یہاں نمائش کے لئے موجود ہیں۔ سانپ کو ساری دنیا میں ایک خطرناک اور زہریلے جانور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ہمیں میوزیم آف زوالوجی دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ سانپوں کی زیادہ تر اقسام زہریلی نہیں ہوتیں۔ بلکہ یہ کسی قدر مظلوم مخلوق بھی ہے کیونکہ یہ ٹانگیں نہیں رکھتی اور رینگنے پر مجبور ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کان ہوتے ہیں نہ پپوٹے۔ یعنی یہ آواز سن نہیں سکتے اور آنکھیں جھپک نہیں سکتے۔ اور جو مخلوق ان دو صفات سے محروم ہو اور پھر اسکی اکثریت کے پاس کاٹنے کی صلاحیت بھی نہ ہو، تو اسے مظلوم ہی کہنا چاہیے۔ اس میوزیم میں چھوٹے اور بے حد بڑے ڈائنوسار کے نمونے اور اصلی ڈھانچے بھی رکھے گئے ہیں۔ دو ٹانگوں والے، چار ٹانگوں والے، سبزی خور، گوشت خور ڈائنوسار۔ اس عجائب گھر میں چین سے ملنے والے ڈائنوسار کے اصلی انڈے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندر میں تیرنے اور رینگنے والے جانور بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر ایک مردہ وہیل مچھلی بھی ہے جو ۱۸۶۵ء میں برطانیہ کے علاقے سسکس میں ساحلِ سمندر پر مردہ حالت میں ملی تھی۔ اس کو میوزیم آف زوالوجی کے لئے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اس کا وزن اسّی ٹن اور لمبائی اکیس میٹر ہے۔ ڈالفن مچھلی کے نمونے یہاں انڈیا سے لائے گئے ہیں۔ یہ ڈالفن قریباً اندھی ہوتی ہے کیونکہ یہ صرف اندھیرے میں روشنی کا ادراک کرتی ہے اور اسے باقی اشیاء دھندلی سے دکھائی دیتی ہیں۔

زمین کے شمالی اور جنوبی قطب ایسی جگہوں پر واقع ہیں جہاں موسمی حالات انتہائی شدید ہیں۔ انتہائی کم درجہ حرارت اور تیز آندھیوں کی وجہ سے یہ خطے تقریباً ناقابلِ رہائش ہیں۔ ایک صدی قبل ان قطبین کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لیکن تجسس سے مجبور کچھ لوگ ان خطوں کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں انگلینڈ کے کیپٹن رابرٹ سکاٹ اور اس کے چار ساتھی زمین کے جنوبی قطب کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی غرض سے وہاں گئے۔ اس مہم سے واپسی پر ان کا جہاز حادثے کا شکار ہو گیا اور اس مہم میں شریک تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ جب اس حادثے کی خبر انگلینڈ پہنچی تو لوگ ان کی مہم جوئی سے بے حد متاثر ہوئے اور ان مہم جوؤں کو ہیرو کا درجہ دیا جانے لگا۔ ان بہادروں کو خراج تحسین پیش

کرنے اور قطبین کے بارے میں تحقیق کرنے کی غرض سے کیمبرج میں ۱۹۲۰ء میں سکاٹ پولر ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس انسٹیٹیوٹ کے زیرِ انتظام ایک پولر میوزیم بھی قائم کیا گیا۔جسمیں قطبین کی زندگی کے بارے میں اہم اور قیمتی اشیاء نمائش کے لئے رکھی گئی ہیں۔ یہاں موجود اشیاء دو اقسام کی ہیں۔ایک وہ جو قطبین، بالخصوص شمالی قطب کے رہنے والے لوگوں کے روزمرہ استعمال سے متعلق ہیں اور دوسری قطبین کی زندگی کی عکاسی کرتی ہوئی پینٹنگز ہیں۔ روزمرہ کی اشیاء میں گھریلو ساز وسامان، ذرائع نقل وحمل، کھانے پکانے کے برتن، بچوں کے کھلونے، جانوروں کے شکار میں استعمال ہونے والے ہتھیار وغیرہ شامل ہیں۔ پینٹنگز کے موضوعات میں تاحدِ نظر پھیلے ہوئے برف کے میدان اور پہاڑ۔ برفانی ریچھ اور دیگر جانور اور پرندے، برفانی میدانوں میں کھیلے گئے کھیل اور دیگر مہمات وغیرہ شامل ہیں۔یہ میوزیم دیکھنے کے بعد آپ کو قطبین کی زندگی کے بارے میں نہ صرف معلومات میسر آتی ہیں بلکہ پینٹنگز اور تصاویر کی وجہ سے وہاں کے شدید حالات کا احساس بھی ہوتا ہے۔

مجسمہ سازی ایک قدیم فن ہے۔اس فن کے ذریعے تاریخ اور زندگی کے مختلف مظاہر دکھائے جاتے ہیں۔ دنیا میں پائے جانے والے بہترین مجسمے مختلف خطوں اور براعظموں میں موجود ہیں۔انیسویں صدی کے اواخر تک فوٹوگرافی کا فن موجود نہ تھا جس کی مدد سے دنیا میں پائے جانے والے مختلف شاہکار مجسموں کی تصاویر بنائی جاسکیں۔اوران تصاویر کی مدد سے مجسمہ سازی کے فن کا مطالعہ کیا جا سکے۔اس صورت حال میں شائقینِ مجسمہ سازی دور دراز کا سفر اختیار کر کے ان مجسموں کو دیکھنے جاتے تھے۔لیکن سفر کرنے کے حوالے سے بھی مسائل تھے۔ذرائع نقل وحمل محدود اور کم رفتار تھے۔جن کی وجہ سے کسی دوسرے ملک یا براعظم کا سفر کرنا بے حد دشوار ہوتا تھا۔ اور پھر یہ کہ شاہکار مجسمے کسی ایک جگہ موجود نہ تھے۔ بلکہ یہ پوری دنیا اور خصوصاً مختلف یورپی ملکوں میں بکھرے ہوئے تھے۔اس ساری صورتحال میں مجسمہ سازی کے فن کی تعلیم وتربیت کے لئے مختلف خطوں میں موجود بہترین مجسموں کے ماڈل بنائے جاتے تھے۔ یہ ماڈل زیادہ تر پلاسٹر میٹریل سے بنائے جاتے تھے۔لیکن بہترین ماڈل کے لئے ضروری تھا کہ وہ اصل مجسمے کی ہو بہو

UrduDost Library UrduDost.com

نقل ہو۔اس طرح کے ماڈل تیار کرنا بے حد مشکل ہوتا تھا۔رفتہ رفتہ مجسموں کے ماڈل بنانے کا کام بھی ایک فن کی شکل اختیار کر گیا۔کیمبرج یونیورسٹی کی فیکلٹی آف کلاسکس میں ایک میوزیم اس فن کی تعلیم و تحقیق کے لئے بنایا گیا۔جس کا نام 'میوزیم آف کلاسیکل آرکیالوجی' رکھا گیا۔اس میوزیم میں قریباً چھ سو مجسموں کے ماڈل رکھے گئے ہیں اور یہ شائد دنیا میں کسی ایک جگہ پر موجود مجسماتی نمونوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔زیادہ تر ماڈل یونان سے متعلق مجسموں کے ہیں۔ جن کا تعلق سیاست، بادشاہت سے لے کر عام زندگی تک ہے۔یہاں اولمپیا کے قدیم شہر میں شروع ہونے والی کھیلوں یعنی اولمپک گیمز کے قدیم مقابلوں کے مجسماتی نمونے قابلِ دید ہیں۔ کچھ نمونے دیوہیکل جسامت کے حامل ہیں جن میں ہرکولیس کا مجسماتی نمونہ بھی شامل ہے جس نے اپنی پشت پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھوں میں گولڈن سیب پکڑ رکھے ہیں۔ ہرکولیس کے چہرے اور آنکھوں سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہیں۔

سائنس کی تاریخ ایک انتہائی دلچسپ موضوع ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں تاریخ، سائنس اور دیگر متعلقہ حلقوں میں اس موضوع پر زیادہ مواد میسر نہیں ہے۔سائنسی تاریخ زمانہ قدیم سے عہدِ حاضر تک ہونے والی سائنسی پیش رفت کی داستان ہے۔ایجادات، دریافتیں، سائنسی نظریے اور قوانین اور ان سب چیزوں کو بنانے والے لوگ اور حالات۔ یہ سب کچھ سائنسی تاریخ کا موضوع ہیں۔کیمبرج میں ۱۹۴۴ء میں وِپل نامی شخص نے یونیورسٹی کو اپنی پرانی سائنسی اشیاء عطیہ کی تھیں۔ان اشیاء سے ایک عجائب گھر جس کا نام 'وِپل میوزیم آف ہسٹری آف سائنس' ہے کی بنیاد رکھی گئی۔۔زیادہ تر نوادرات اور سائنسی آلات جو اس میوزیم میں موجود ہیں، ان کا تعلق سترھویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے ہے۔اس میوزیم میں علم فلکیات کے حوالے سے پرانی اشیاء کی نمائش کی گئی ہے جن میں دوربینیں، کائنات کے ماڈل، فلکیات کے میدان میں کئے جانے والے حساب کتاب سے متعلق آلات اور اسی نوع کے دوسری بے شمار اشیاء موجود ہیں۔ یہاں چار سو سے زائد خوردبینیں بھی موجود ہیں۔اِن میں وہ خوردبینیں بھی شامل ہیں جو نظریہ ارتقاء کے بانی چارلس ڈارون کے زیرِ استعمال رہیں۔اس میوزیم میں تعلیم دینے کی غرض سے بنائے

UrduDost Library UrduDost.com

جانے والے ماڈل بھی پڑے ہوئے ہیں۔ جن میں انسانی جسم کے پرانے ماڈل، ارضیاتی ماڈل اور دیگر سائنسی مظاہر کی تشریح کے لئے درکار ماڈل بھی شامل ہیں۔ موسیقی کے آلات اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ ہی سائنسدانوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ آواز کی خصوصیات جاننے کے لئے گذشتہ صدیوں میں جن آلات کا استعمال ہوتا رہا ہے، اس کے کچھ نمونے بھی یہاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کرہِ ارض کے مکمل اور تراشیدہ نمونے بھی اہم ہیں۔ جن کی مدد سے طلبا کو جغرافیے کا علم سکھایا جاتا رہا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کا میوزیم آف آرکیالوجی اینڈ اینتھروپالوجی ایک قابلِ دید عجائب گھر ہے۔ اس عجائب گھر میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے۔ وہ اس میوزیم میں موجود ہے۔ یہ میوزیم ۱۸۸۴ء میں بنایا گیا تھا۔ اس میوزیم میں تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور تحقیقی لحاظ سے انتہائی اہم اور بیش قیمت آٹھ لاکھ سے زائد نوادرات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف برِ اعظموں سے متعلق تین لاکھ سے زائد تاریخی کاغذات اور دستاویزات اور ایک لاکھ سے زائد تصاویر بھی موجود ہیں۔ یہاں پر بحرالکاہل کے ساحلی علاقوں کے تیس ہزار سے زائد نوادرات نمائش کے لئے رکھے ہوئے ہیں جو پوری دنیا میں کسی اور میوزیم کے پاس موجود نہیں ہیں۔ ان میں کیپٹن جیمز کک کی تینوں تاریخی مہمات، جن کے دوران اس نے برِ اعظم آسٹریلیا دریافت کیا تھا، کی لائی ہوئی اشیاء بھی سیاحوں کے لئے کشش کا باعث ہیں۔

UrduDost Library UrduDost.com

کیمبرج سے تعلیم یافتہ پاکستانی افراد

برصغیر ہندوستان و پاکستان کے لوگوں کا کیمبرج کے ساتھ پرانا تعلق ہے۔ انیسویں صدی عیسوی سے ہندوستانی افراد کیمبرج تعلیم و تحقیق کی غرض سے جاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ جنہوں نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ اُن میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جو وقت کی دھول میں دھندلاتے جارہے ہیں۔ کیا ستم ہے کہ ہمارے عہد کے اکثر نوجوان علامہ عنائت اللہ خاں مشرقی کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ وہی علامہ مشرقی جن سے اتفاق اور اختلاف کرنے میں ایک عہد گزرا۔ وہ ۱۸۸۸ء میں امرتسر میں ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خاں عطا محمد خاں تھا۔ ان کے اجداد مغل دور میں اہم درباری عہدوں پر تعینات رہے۔ علامہ کے والد کے مسلمان مشاہیر کے ساتھ قریبی روابط رہے۔ ان مشاہیر میں سرسید احمد خاں، شبلی نعمانی، جمال الدین افغانی اور غالب جیسے لوگ شامل ہیں۔ وہ اپنے عہد میں ایک شمارہ نکالتے تھے جس کا نام 'وکیل' تھا۔۔۔ آج کل یہ شمارہ ہر روز دوپہر کے وقت مال روڈ پر نعرے لگاتا ہوا نکلتا ہے۔۔۔ علامہ شبلی نعمانی نے عطا محمد خاں سے سفارش کی تھی کہ وہ ابوالکلام آزاد کو اس شمارے کی ادارت کی ذمہ داری دیں۔ اور یوں ابوالکلام وکیل کے مدیر بنے تھے۔ اس طرح علامہ مشرقی کو بچپن سے ہی علمی ماحول میسر رہا۔ علامہ کو ریاضی سے عشق تھا۔ انہوں نے انیس برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے ریاضی کیا اور امتحان میں نمبروں کے سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔ ۱۹۰۷ء میں وہ کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج آئے۔ جہاں انہوں نے ریاضی اور مکینیکل انجینئرنگ میں ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ انہیں کیمبرج میں ریاضی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری طلائی تمغے کے ساتھ دی گئی تھی۔

UrduDost Library UrduDost.com

وطن واپسی پر انہیں ریاست الور کے وزیرِ اعظم کے عہدے کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ وہ محض پچیس برس کی عمر میں اسلامیہ کالج پشاور کے نائب پرنسپل مقرر ہوئے جہاں وہ پرنسپل بھی رہے۔ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں انڈر سیکرٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ انہیں افغانستان میں سفیر اور برطانوی حکومت کی طرف سے 'نائٹ' بنانے کی آفرز بھی ہوئیں، لیکن انہوں نے یہ آفرز قبول نہ کیں۔

۱۹۲۴ء میں، جب ان کی عمر چھتیس برس تھی، انہوں نے قرآن مجید کی سائنس کی روشنی میں توضیع کے موضوع پر اپنی معرکتہ الآراء کتاب 'تذکرہ' تصنیف کی۔ اس کتاب کو ۱۹۲۵ء میں نوبل پرائز کے لئے نامزد کیا گیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ اس کتاب کا کسی یورپی زبان میں ترجمہ کروایا جائے۔ علامہ نے یہ شرط مسترد کر دی اور یوں وہ نوبل پرائز سے بال بال بچ گئے۔ علامہ کو مذاہبِ عالم کے اختلافات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے نظریہ کے مطابق، چونکہ مختلف ادیان کے پیغمبر خدا کی طرف سے مبعوث کئے گئے ہیں تو یہ ممکن نہیں کہ ایک خدا مختلف پیغمبروں کو مختلف یا متضاد تعلیمات دے۔ پس، جو اختلافات مختلف ادیان میں نظر آتے ہیں ان کا سرچشمہ خدا اور اسکے پیامبر نہیں ہیں بلکہ یہ ان مذہب کے پیروکاروں کی غلط فہمی و کج روی ہے۔ وہ مذاہب کی سائنس کو انسانی نسل کے مجموعی ارتقاء کی سائنس سمجھتے تھے۔ ان کی شخصیت کا نظریاتی اور علمی حوالوں سے زیادہ معتبر حوالہ ان کی سیاست ہے۔ انہوں نے خاکسار تحریک جیسی منظّم سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جو رنگ، نسل، زبان حتیٰ کہ عقیدے کے تعصب سے بھی پاک تھی۔ اس تحریک کے پیروکار خاکی وردی پہنتے اور بیلچہ ہاتھ میں اٹھائے رہتے۔ اسی وجہ سے خاکسار تحریک کو بیلچہ پارٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علامہ تقسیمِ ہندوستان کے خلاف تھے۔ لیکن آزادیِ ہندوستان کے لئے ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا کم ظرفی ہوگا۔ علامہ نے ساری عمر قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ ان پر الزامات بھی لگے۔ اُن پر سب سے کڑا الزام قائداعظم پر قاتلانہ حملے کا لگا۔ کیونکہ ان کی پارٹی کے ایک رکن نے ۱۹۴۳ء میں قائد پر حملہ کیا تھا۔ بعد ازاں بمبئی ہائی کورٹ نے انہیں اس الزام سے بری کر دیا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پانچ مرتبہ قید کئے

UrduDost Library UrduDost.com

گئے۔ان پر ایوب خان کی حکومت گرانے کا الزام بھی لگا۔وہ ۱۹۶۳ء میں کینسر کے مرض کی وجہ سے لاہور میں انتقال کر گئے۔

ذکر کیمبرج،تحریکِ آزادیِ برصغیر اور پاکستان کا ہو تو چوہدری رحمت علی یاد آتے ہیں۔ وہ ۱۸۹۷ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد،انہوں نے ایچی سن کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔وہ پنجاب یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔۱۹۳۰ء میں وہ انگلینڈ چلے گئے اور تحصیلِ علم کی غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کے عمانویل کالج میں داخل ہوئے۔انہوں نے یہاں سے ۱۹۳۳ء میں بی۔اے اور ۱۹۴۰ء میں ایم۔اے کیا۔بعد ازاں ۱۹۴۳ء میں انہوں نے لندن سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔۱۹۳۰ء میں چوہدری رحمت علی نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے موضوع پر غور وخوض شروع کیا۔ وہ گاہے بگاہے تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے۔۱۹۳۳ء میں انہوں نے اپنا مشہورِ زمانہ کتابچہ 'ابھی یا کبھی نہیں' شائع کیا۔جس میں کھلے لفظوں میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے لئے آواز اٹھائی۔اس کتابچے کو تاریخ میں پاکستان ڈیکلیئریشن کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تنہا چوہدری رحمت علی نے لکھا تھا۔لیکن وہ اس پر دوسرے ہندوستانی افراد بالخصوص طلباء کے دستخط کروانا چاہتے تھے تا کہ یہ تاثر دیا جاسکے کہ اس ڈیکلیئریشن کو لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔اس زمانے میں انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلباء انڈین نیشنلزم کے پکے حمایتی ہوتے تھے۔ چنانچہ چوہدری صاحب کو ایک مہینے کی تلاش اور جدوجہد سے لندن میں صرف تین ایسے طلباء ملے جو اس ڈیکلیئریشن پر دستخط کرنے پر راضی ہوئے تھے۔۱۹۳۲ء میں چوہدری رحمت علی کیمبرج میں ہمبرسٹون روڈ کے مکان نمبر ۳ میں منتقل ہو گئے۔ اور اسی مکان کے ایک کمرے میں انہوں نے لفظ 'پاکستان' تخلیق کیا تھا۔اگر چہ لفظ پاکستان کے حوالے سے دوسری روایات بھی موجود ہیں۔جن کے مطابق چوہدری رحمت علی دریائے تھیمز ،لندن کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ لفظ 'پاکستان' ان کے ذہن میں آیا۔کچھ دوسرے لوگ بھی لفظ پاکستان کے خالق ہونے کے دعویدار رہے ہیں جن میں خواجہ عبدالرحیم بھی شامل ہیں۔لیکن تحریک

UrduDost Library UrduDost.com

مکان نمبر 3، ہمبرسٹون روڈ۔کیمبرج میں چوہدری رحمت علی کی قیام گاہ جہاں پر لفظ 'پاکستان' تخلیق کیا گیا۔

پاکستان کے معروف محقق کے۔کے۔عزیز کے خیال میں چوہدری رحمت علی نے ہی یہ لفظ وضع کیا تھا۔تیس کی دہائی کے شروع میں ابھی ایسی صورت حال نہ تھی کہ مسلمانانِ ہندوستان علیحدہ وطن اور صرف علیحدہ وطن کے مطالبے کے لئے جدوجہد کرتے۔اُس وقت مسلمان زعماً صرف اپنے حقوق کی بات کرتے تھے۔اس لئے لفظ 'پاکستان' فوری طور پر مسلم لیگی حلقوں میں مقبول نہ ہوا۔۔ ۱۹۳۴ء میں چوہدری رحمت علی نے کچھ نوجوانوں کے ساتھ محمد علی جناح سے ایک ملاقات کی تھی جس میں انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا موقف اختیا کیا تھا۔جس کے جواب میں قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ آپ کو جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور واقعات اور وقت کو اپنی رفتار سے چلنے دیں۔ حالات اپنا رخ خود متعین کریں گے۔ اگلے دس برسوں میں کانگریس اور ہندوؤں کی اکثریت نے جس شدومد کے ساتھ مسلمانوں کی بطور قوم مخالفت کی،اس تناظر میں علیحدہ وطن کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ہندو مسلمانوں کو پاکستان نامی ایک علیحدہ وطن بنانے کے طعنے دیتے تھے۔اور حالات ایسے ہو گئے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے اسی طعنے کو عملی جامہ پہنانے پر سنجیدہ غور وخوض کرنا شروع کر دیا اور لفظ 'پاکستان' مقبول ہوتا گیا۔قائدِ اعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء میں دہلی میں منعقدہ اجلاس میں یہی موقف اختیار کیا تھا۔

UrduDost Library UrduDost.com

چوہدری رحمت علی نے صرف لفظ پاکستان بنانے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں اور خطوں کی بات بھی کرتے تھے۔ مشرق میں بنگستان اور جنوب میں عثمانستان اور یہ تینوں یعنی پاکستان، بنگستان اور عثمانستان ایک فیڈریشن کے تحت ایک ہی ملک کا حصہ ہونے کا منصوبہ بھی انہوں نے ہی پیش کیا تھا۔ بنگستان وہ علاقہ ہے جو اب بنگلہ دیش ہے جبکہ عثمانستان سے ان کی مراد حیدر آباد دکن تھی۔ اسی طرح انہوں نے غیر مسلم قوموں کے خطوں کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اس سارے منصوبے کو اُس وقت ایک خیالی تصور قرار دیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے غیر مسلم حلقے انکے نظریات و خیالات کی وجہ سے اُن سے ناخوش تھے جسے بہرکیف ایک فطری امر سمجھا جانا چاہیئے۔ لیکن معاملہ اس سے بھی پیچیدہ تھا۔ وہ یہ کہ چوہدری صاحب کے تعلقات مسلم لیگی حلقوں کے ساتھ بھی دوستانہ نہ تھے۔ چوہدری صاحب کی شخصیت کے حوالے سے مسلمان دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک وہ جو ان کے حامی اور دوسرے ان کے مخالف۔ یہ بحث قیام پاکستان کے بعد بلکہ کبھی کبھار آجکل بھی چھڑتی رہتی ہے۔ ان کے حامیوں کا کہنا ہے کہ پاکستان بنانے میں ان کا کردار سب سے اہم تھا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ انہوں نے جو 'ستان' منصوبہ یعنی، پاکستان، عثمانستان وغیرہ، بنایا تھا وہ ایک حماقت کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ دونوں حلقوں میں سے کس کی رائے درست ہے؟ دراصل یہ دونوں آراء انتہائی نکتہ نظر کی حامل ہیں۔ چوہدری رحمت علی کا پاکستان بنانے کی جدوجہد میں کردار مسلمہ امر ہے لیکن ایک مملکت کی تشکیل جیسا عظیم کام کسی ایک شخصیت کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ اس میں بے شمار لوگوں کی جدوجہد اور قربانیاں شامل تھیں۔ ہر کسی نے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد چوہدری صاحب پاکستان کے جغرافیے سے مطمئن نہ ہوئے۔ وہ اسے ادھورا پاکستان تصور کرتے تھے۔ لیکن یہ تصور صرف انہی کا نہ تھا۔ لاتعداد دوسرے لوگ بھی یہی نکتہ نظر رکھتے تھے۔ ادھورے پاکستان کے نظریے کی وجہ سے وہ پاکستان کی ابتدائی حکومتوں سے ناراض تھے۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں بالآخر انہوں نے پاکستان واپس آنے کا ارادہ کیا اور وہ جناب لیاقت علی خان کے دورِ حکوت میں پاکستان تشریف لے آئے۔ وہ اپریل میں تشریف لائے۔ وہ حکومتِ سے اور حکومت ان سے خوش نہ تھی۔ اور جلد ہی حکومت نے انہیں ملک چھوڑنے

UrduDost Library UrduDost.com

کا حکم دے دیا۔ اور وہ بے یارو مددگار، خالی ہاتھ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں واپس انگلینڈ آ گئے۔ یہاں ان کی صحت اچھی نہ رہی اور وہ ۳ فروری ۱۹۵۱ء کو اپنے رب سے جا ملے۔ یہاں کوئی شخص نہ تھا جو خالقِ لفظِ 'پاکستان' کے جسدِ خاکی کی تجہیز و تکفین کرتا۔ بالآخر اسی کالج، جہاں وہ کبھی طالبعلم رہے تھے یعنی عمانویل کالج، کے ماسٹر نے ان کی تکفین کا بندوبست کیا۔ اُن کے اپنے کالج کے ماسٹر کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ اور بالآخر انہیں کیمبرج کے نیو مارکیٹ روڈ قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ جہاں آج بھی ان کی لوح مزار پر انگریزی اور اردو میں ان کا نام، مختصر تعارف اور 'خالق لفظ پاکستان' کندہ ہے۔۔۔

نومبر کے آخری دنوں کی ایک سہ پہر ہم چوہدری رحمت علی کی قبر دیکھنے نیو مارکیٹ روڈ پہنچے۔ رات کو گرنے والی برف ابھی بھی سڑکوں پر موجود تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور درجہ حرارت نقطہ انجماد کے قریب ہوگا۔ نیو مارکیٹ روڈ قبرستان کافی بڑا ہے۔ اسمیں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے لئے جگہ مخصوص ہے۔ عام لوگوں کے لئے ایک قطعہ زمین، کٹڑ کیتھولک افراد کے لئے دوسرا۔ یہودیوں کے لئے ایک علیحدہ قطعہ۔ مسلمانوں کے لئے ایک کونے میں اندازاً ایک کنال جگہ ہوگی۔ وہاں ایران، ہندوستان، پاکستان، مصر اور نجانے کن کن ممالک کے مسلمانوں کی قبریں موجود ہیں۔ ہر صاحبِ قبر کا نام انگریزی اور اس کی ملکی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ ہمیں سہولت یہ ہے کہ اردو لکھنے، پڑھنے والا ہر شخص عربی اور فارسی بھی پڑھ سکتا ہے۔ چاہے عبارت کا مطلب سمجھ آئے یا نہ آئے۔ اتنے سارے غریب الدیار لوگوں کی قبریں دیکھ کر طبیعت اداس سی ہوگئی۔ سب کے لئے اجتماعی دعا کی۔ اس قطعہ میں چوہدری رحمت علی کی قبر نظر نہ آئی۔ ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں موجود تمام قبریں پچھلے بیس، تیس برسوں کے دوران بنائی گئی ہیں کیونکہ ہر قبر پر مرنے والی کی تاریخ وفات درج تھی۔ خیال آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ قطعہ اراضی غالباً زیادہ پرانا نہیں ہے اور جب چوہدری رحمت علی فوت ہوئے تھے، شائد اس وقت مذہب کی بنیاد پر قطعوں کی تقسیم نہ ہوئی ہوگی۔ اور وہ عام قبرستان میں ہی دفن کر دیے گئے ہوں گے۔ بات دل کو لگی۔ اب ہم نے قبر کی تلاش شروع کی۔ چونکہ قبرستان بہت وسیع ہے، اس لئے ایک ایک قبر

UrduDost Library UrduDost.com

ڈھونڈنا کافی مشکل معلوم ہوا۔ ہم نے قبرستان کے احاطے میں موجود دفتر سے رابطہ کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ دفتر بند ہے۔ ہم پریشانی کے عالم میں قبروں کے بیچوں بیچ چوہدری صاحب کی قبر تلاش کرنے لگے۔ اتفاقاً پانچ سات افراد کی ایک ٹولی سامنے نظر آئی۔ سوچا، ان سے پوچھتے ہیں۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ وہ صاحبان تو پاکستانی ہیں اور پنجابی بول رہے ہیں۔ ہم نے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ ہم ایک قبر کی تلاش کر رہے ہیں۔ ٹولی میں سے ایک صاحب گویا ہوئے۔ آپ چوہدری رحمت علی کی قبر تو نہیں ڈھونڈ رہے۔ ہم نے فوراً ہاں کہا۔ وہ صاحب کافی عرصہ سے کیمبرج میں مقیم تھے، انہوں نے قبر کی نشاندہی کر دی۔ قبر کے سرہانے ایک نہایت قد آور اور خوبصورت سرو ایستادہ ہے۔ قبر پر کشادہ تختی لگی ہوئی ہے، جس کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تختی چوہدری رحمت علی کے بھائی نے لگوائی ہے جو لائل پور کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔ ہم نے ارادہ باندھا کہ وطن واپسی پر فیصل آباد جانا ہوا تو چوہدری رحمت علی کے خاندان کے لوگوں سے ملاقات کرنے کی کوشش کریں گے۔

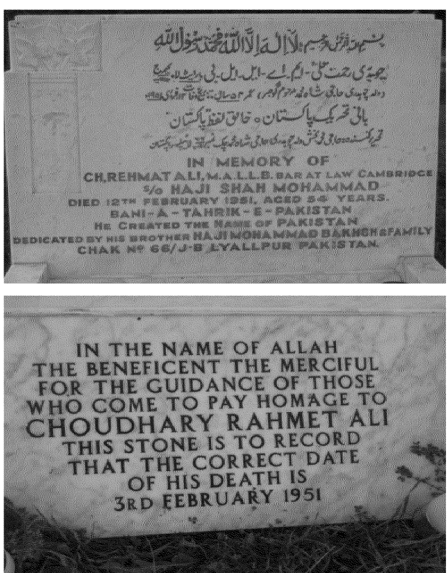

چوہدری رحمت علی کی قبر پر نصب دو (2) کتبے

ردرفورڈ کا شمار کیمبرج ہی نہیں پوری دنیا کے اہم سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے ایک شاگرد معروف پاکستانی ماہر طبیعات اور سائنسدان ڈاکٹر نذیر احمد تھے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے طبیعات میں بی۔اے کی سند حاصل کی۔ اور پھر کیمبرج تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ یہاں انہیں ردرفورڈ کی سرپرستی میں تحقیق کرنے کا موقع میسر آیا۔ انہوں نے یہاں سے ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ہندوستان چلے گئے۔ پاکستان بننے کے بعد منسٹری آف اکنامک افیئرز اور پاکستان ڈویلپمنٹ بورڈ کے جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی بنیاد رکھی۔ وہ ۱۹۶۰ء تک اس ادارے کے سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ بعد ازاں انہیں ایوب حکومت میں اس ادارے سے ہٹا کر سائنس اور ٹیکنالوجی کی وزارت میں بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے بنائے ہوئے ادارے، پاکستان اٹامک انرجی کمیشن، نے اگلے پچاس برسوں میں زندگی کے بہت سارے شعبوں میں نمایاں ترقی کی اور قومی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا۔ ردرفورڈ کے ایک اور پاکستانی شاگرد کا نام پروفیسر ڈاکٹر رفیع چوہدری ہے۔ وہ پاکستان میں نیوکلیئر فزکس کی تعلیم و تحقیق کے بانی ہیں۔ وہ ۱۹۰۳ء میں ضلع روہتک میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے طبیعات میں بی۔ایس۔سی۔ اور ایم۔ایس۔سی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انہیں وزیرِ اعظم برطانیہ نے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے لئے وظیفہ دیا اور وہ کیمبرج یونیورسٹی کی کیوِنڈش لیبارٹری آ گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۳۲ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کیونڈش لیبارٹری میں قیام کے دوران، انہوں نے ردرفورڈ ایٹمی ماڈل بنانے میں ردرفورڈ کی ٹیم کے ساتھ مل کر تحقیق کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں طبیعات کے پروفیسر اور صدر شعبہ بن گئے۔ تقسیمِ ہندوستان کے موقع پر جواہر لال نہرو نے انہیں ہندوستان میں ہی رہنے کی ترغیب دی اور لیبارٹری آف فزکس کی ڈپٹی ڈائرکٹر کی پوسٹ آفر کی۔ اسی دوران قائدِ اعظم نے انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ کی خبر ہندوستانی حکومت کو ہوگئی اور نہرو نے ایک مرتبہ پھر ان سے ہندوستان

UrduDost Library UrduDost.com

میں ہی رہائش پذیر رہنے کی استدعا کی۔لیکن انہوں نے قائد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان آنے کو ترجیح دی۔ پاکستان میں انہیں ریسرچ کونسل کی ڈائرکٹر شپ کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر بننے کو ترجیح دی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انہوں نے ہائی ٹینشن لیب کی بنیاد رکھی اور ملک کے بہت سارے نوجوانوں کو طبیعات کے میدان میں تعلیم و تربیت دی۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ انہوں نے پاکستان میں طبیعات کے میدان میں مستقبل کی نسل تیار کرنے کے سلسلے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔گورنمنٹ کالج سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے۔انہوں نے اپنے اکیڈیمک کریئر میں سینکڑوں تحقیقی مقالہ جات لکھے۔ان کی قائم کی ہوئی ہائی ٹینشن لیب کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ یہاں سے بھیجے گئے تحقیقی مقالہ جات دنیا کے صفِ اول کے تحقیقی جریدے 'نیچر' میں شائع ہوئے۔ پروفیسر رفیع چوہدری کا ذکر آیا تو ہمیں برسوں پرانا واقعہ یاد آرہا ہے۔غالبًا اسّی کی دہائی میں پاکستان ٹی وی پر ان کے ساتھ ایک نشست منائی گئی تھی جسے ہم نے ٹی وی پر ہی دیکھا تھا۔نشست کی میزبانی اس وقت کے نہایت ہردلعزیز کمپیئر نعیم بخاری کر رہے تھے۔نشست میں پروفیسر چوہدری کے علاوہ طبیعات کے کئی معروف پروفیسر بھی شریک گفتگو ہوئے تھے۔ وہ ایک تاریخی نشست تھی جسمیں رفیع چوہدری نے اپنی اکیڈیمک زندگی پر سیر حاصل گفتگو کی تھی۔ایسی مجالس صاحبانِ علم وفن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے علاوہ نئی نسل میں علوم کا ذوق اجاگر کرنے میں بیحد معاون ہوتی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں ایسی روایات بہت توانا ہیں۔ ہمارے ہاں ادیبوں، شاعروں کے ساتھ تو پھر بھی کبھی کبھار کوئی نشست منعقد ہو ہی جاتی ہے لیکن دوسرے شعبہ ہائے زندگی اور خصوصاً سائنسدانوں کے ساتھ گفتگو کے مواقع کم ہی میسر آتے ہیں۔ پروفیسر چوہدری کے نو بیٹے، بیٹیاں ہیں۔ اور وہ سارے طبیعات کے میدان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور مختلف قومی و بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں تعلیم و تحقیق میں مشغول ہیں۔ان کے ایک صاحبزادے کا نام ڈاکٹر منور چوہدری ہے جنہوں نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کیمبرج کی کیونڈش لیب ہی سے ۱۹۷۰ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور آجکل کیمبرج کی اسی لیب میں شعبہ طبیعات کے تحت

UrduDost Library UrduDost.com

ریڈر یعنی ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

سائنس، طبیعات، کیمبرج اور پاکستان۔ ان سے ایک بہت بڑا نام یاد آتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام۔ پاکستان کے واحد اور دنیائے اسلام کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنسدان۔ وہ ۱۹۲۶ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیے۔ ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم۔اے کی ڈگری لینے کے بعد انہیں کیمبرج کے سینٹ جان کالج سے سکالرشپ آفر ہوا۔اور وہ پی۔ایچ۔ڈی کرنے روانہ ہوگئے۔ انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرنے سے پہلے کیمبرج میں طبیعات کے میدان میں 'سمتھ پرائز' حاصل کیا۔ بعد میں انہیں 'ایڈم پرائز' سے بھی نوازا گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ پاکستان واپس آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک ریاضی کے پروفیسر تعینات رہے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ کیمبرج واپس چلے گئے اور ریاضی کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں انہیں امپیریل کالج لندن میں تھیوریٹیکل فزکس کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک امپیریل کالج، لندن کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ محض تینتیس برس کی عمر میں رائل سوسائٹی کے فیلو بنے۔ شائد ہی کوئی اور آج تک اتنی کم عمری میں یہ اعزاز حاصل کر سکا ہو۔ ساٹھ کی دہائی میں انہوں نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور خلائی تحقیقاتی ادارہ، سپارکو، بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ پاکستان میں انتہائی اعلیٰ درجے کے پانچ سائنس کالج بنانا چاہتے تھے جہاں سے عالمی سطح کے سائنسدان پیدا کیے جا سکیں۔ انہوں نے ایوب خاں کو کراچی کا ایٹمی بجلی گھر بنانے کے لئے قائل کیا۔ وہ پاکستان کی سائنس پالیسی بنانے کے سلسلے میں حکومت کی معاونت کرتے رہے۔ انہوں نے پاکستانی سائنسدانوں کی ایک کھیپ تیار کی جس نے آنے والے وقتوں میں انتہائی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ بین الاقوامی سطح پر انہوں نے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کی تشکیل کی۔ جو آج ایک توانا ادارہ بن چکا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے اٹلی میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کی بنیاد رکھی جس کا نام اب عبدالسلام انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس رکھ دیا گیا ہے۔ ان کی طبیعات کے میدان میں اعلیٰ تحقیق کے اعتراف کے طور پر انہیں ۱۹۷۹ء

UrduDost Library UrduDost.com

میں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اُن سے پہلے پوری اسلامی دنیا میں کسی کو سائنس کے کسی شعبے میں یہ انعام نہیں ملا تھا۔ پروفیسر عبدالسلام کی بین الاقوامی ساکھ کے ایک واقعے کے ہم عینی شاہد ہیں۔ کئی برس قبل ہم جاپان میں بغرضِ تعلیم قیام پذیر تھے۔ ایک دن یونیورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے نوٹس بورڈ کے سامنے سے گزرے۔ چلتے چلتے بورڈ پر نظر پڑی۔ ایک پوسٹر آویزاں تھا جس پر لکھا تھا۔ سلام فیلوشپ۔ ہمیں لفظ 'سلام' سے جھٹکا لگا۔ ذرا قریب ہوکر غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ امپیریل کالج، لندن ڈاکٹر عبدالسلام کے نام سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے جاپانی اور دوسرے ملکوں کے طلبا کو وظیفہ دے رہی ہے۔ اس طرح کے وظائف کے لئے ایک خطیر رقم مختص کرنا پڑتی ہے۔ اور پھر ایسی فیلوشپ کو پوری دنیا میں مقابلے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ ہمارے ایک ہم وطن کے نام سے منسوب یہ فیلوشپ ہر سال پوری دنیا کے بہترین طلباء کو پیش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انکی بین الاقوامی شہرت کے اعتراف کے طور پر جنیوا میں ایک سڑک کو بھی ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

بدقسمتی سے ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی تھے۔ لیکن وہ پاکستان کے سچے بہی خواہ تھے۔ ان میں پاکستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے نوبل پرائز حاصل کرتے ہوئے جو مختصر تقریر کی تھی، اس میں قرآن پاک کی آیات پڑھیں تھیں۔ اُن کی تحریریں قرآن کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں۔ وہ عالمِ اسلام کی سائنسی و علمی پس ماندگی سے پریشان رہتے۔ ہمارے ایک دوست کے والدِ گرامی عرب میں پاکستانی سفارت خانے میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالسلام وہاں تشریف لے گئے اور انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں بطور سرکاری مہمان قیام کیا۔ ہمارے کرم فرما جو ان کے سرکاری میزبان کے طور پر خدمت پر مامور رہے، راوئت کرتے ہیں کہ انہوں نے کافی وقت پروفیسر عبدالسلام کے ساتھ علیحدگی میں گزارا۔ فارغ وقت میں عبدالسلام زیادہ تر مسلمان ممالک میں سائنس کی ترویج و ترقی پر ہی گفتگو کرتے رہتے۔ بھٹو دور میں جب قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا گیا تو وہ دلبرداشتہ ہوکر ترکِ وطن کر گئے۔ وہ ۱۹۹۶ء میں آکسفورڈ میں انتقال کر گئے۔ ان کی میت پاکستان لائی گئی اور ربوہ کے قبرستان میں انہیں دفن کر دیا

UrduDost Library UrduDost.com

گیا۔ان کی لوحِ مزار پر' پہلے مسلم نوبل انعام یافتہ' کے الفاظ درج تھے۔مقامی مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ ان کے نام کے ساتھ مسلم نہیں لکھا جا سکتا۔ چنانچہ لفظ مسلم مٹا دیا گیا۔اور موجودہ تحریر میں' پہلے نوبل انعام یافتہ' کے لفظ باقی رہ گئے ہیں۔ جو ایک بے معنی بات ہے کیونکہ ان سے پہلے بہت سارے لوگوں کو اس انعام سے نوازا گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے جو پاکستانی افراد طبیعات کے میدان میں تیار کئے ، ان میں دو نام نہایت قابلِ ذکر ہیں۔ یہ پروفیسر ڈاکٹر ریاض الدین اور پروفیسر ڈاکٹر فیاض الدین ہیں۔ یہ دونوں بھائی ہیں۔ ان دونوں کو ڈاکٹر عبدالسلام کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دونوں بھائیوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم پائی اور پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے ڈیزائن بنانے کے منصوبے میں ان کی خدمات شاندار ہیں۔ یہ دونوں اٹامک انرجی کمیشن سے منسلک رہے۔ طبیعات کے میدان میں ایک انتہائی معتبر نام ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا ہے۔وہ ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھی رہے۔انہوں نے کیمبرج سے ایم۔اے کرنے کے بعد جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کی تھی۔ وہ آئن سٹائن کے بلاواسطہ شاگرد رہے۔انہوں نے آئن سٹائن کی سرپرستی میں نظریہ اضافت پر تحقیق بھی کی۔قیامِ پاکستان سے پہلے وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں بطور استاد فرائض سرانجام دیتے رہے۔ایک روائت کے مطابق ، علامہ اقبال نے انہیں اردو میں نظریہ اضافت پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی۔اُس کتاب کی تکمیل سے پہلے علامہ فوت ہو گئے۔قیامِ پاکستان کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے۔ وہ بیک وقت سندھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وہ قائداعظم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بھی مقرر ہوئے۔ جہاں یونیورسٹی لائبیریری کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ وہ اپنے قیامِ یورپ کے دوران، برطانوی اور فرانسیسی ایٹمی پروگرام سے بھی منسلک رہے۔انہوں نے دنیا کے پہلے ایٹم بم بنانے والے منصوبے، مین ہیٹن پراجیکٹ، میں بھی کام کیا تھا۔ جوہری توانائی کے ان سارے تجربات کو انہوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے استعمال کیا اور ملک کے جوہری پروگرام کی بنیادیں استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

UrduDost Library UrduDost.com

طبیعات کے علاوہ دوسرے سائنسی میدانوں میں بھی کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ لوگوں نے پاکستان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیمیا کے میدان میں پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کا نام نہایت معتبر ہے۔ وہ ۱۹۶۵ء میں کیمیا میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے کیمبرج آئے۔ انہوں نے کیمبرج میں آٹھ سال قیام کیا۔ پاکستان میں چند ادارے ایسے ہیں جن کی سائنسی تحقیق کی دنیا بھر میں دھوم ہے۔ ان میں سرفہرست ایچ۔ ای۔ جے۔ ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف کراچی یونیورسٹی ہے۔ اس ادارے کو موجودہ مقام تک لانے میں اس کے بانی پروفیسر سلیم الزمان صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کا کردار بہت اہم ہے۔ بین الاقوامی طور پر ان کے کام کو بے حد سراہا گیا ہے۔ وہ رائل سوسائٹی کے فیلو ہیں۔ وہ پہلے مسلمان سائنسدان ہیں جنہیں یونیسکو سائنس ایوارڈ عطا کیا گیا۔ انہیں آسٹریا کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ بھی ملا۔ وہ کنگز کالج، کیمبرج یونیورسٹی کے تاحیات فیلو ہیں۔ پروفیسر عطاء الرحمٰن کا سب سے اہم کام جس کی اہمیت ان کے باقی تمام کاموں سے زیادہ ہے، وہ پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی سیکٹر کی تعمیر نو ہے۔ ان سے پہلے، پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی ادارے جمود بلکہ تنزلی کا شکار تھے لیکن ان کی شبانہ روز محنت سے اب یہ ادارے نئے سرے سے منظّم ہو رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ اگلے دس برسوں میں پاکستان اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ایک اہم مقام حاصل کر لے گا۔

کیمبرج سے پڑھنے کے بعد آدمی کسی کام کا بھی رہتا ہے یا صرف سائنس کا ہی ہو جاتا ہے؟ کچھ لوگ یہاں سے تعلیم پانے کے بعد عقل اور فطرت سلیم بچانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔۔۔ پطرس کے مضامین۔۔۔ ہے کوئی ایسا جو گذشتہ پچاس برس میں اردو زبان سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہو اور پطرس کے مضامین سے ناواقف ہو۔ سید احمد شاہ جنہیں دنیا پطرس بخاری کے نام سے جانتی ہے۔ ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور چلے آئے۔ یہاں سے ایم۔ اے کرنے کے بعد یہیں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے عمانویل کالج تشریف لائے۔ یہ وہی عمانویل کالج ہے جہاں چوہدری رحمت علی بھی زیرِ تعلیم رہے۔ یہاں پطرس کا میدانِ تعلیم انگریزی تھا۔ ان کے عمانویل کالج سے واپس

UrduDost Library UrduDost.com

جانے کے کئی برس بعد، یہاں ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے پطرس انگلش پرائز کا اجراء کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں پطرس واپس گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے اور انگریزی کے پروفیسر تعینات ہوئے۔ وہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج میں پڑھانے والے پطرس اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم جیسے اساتذہ اور پڑھنے والے فیض صاحب، اشفاق احمد اور بانو آپا۔ پطرس بعد میں ریڈیو کے ڈائرکٹر بن گئے اور پھر اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ ان کا انتقال بھی اقوامِ متحدہ میں کام کرنے والے عہد میں ہوا تھا۔ وہ نیویارک میں دفن ہوئے۔ اردو مزاح میں اگر صرف ایک نام لینا ہو تو وہ بلاشبہ پطرس ہی ہیں۔

سندھ کی دھرتی اور علم و ادب کے حوالے سے ایک معتبر نام عمر بن محمد داود پوتا ہے۔ وہ ۱۸۹۷ء میں دادو میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے فارسی اور عربی ادب میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھی۔ بعدازاں وہ وطن واپس آ گئے۔ انہوں نے شاعری، تنقید، تاریخ، مذہب اور سندھی ادب پر گرانقدر کام کیا اور دو درجن سے زائد کتب تصنیف کیں۔ وہ ۱۹۵۸ء میں انتقال کر گئے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئے۔ عہد حاضر میں اکبر۔ ایس۔ احمد ایک معروف سکالر ہیں۔ وہ آجکل امریکن یونیورسٹی، واشنگٹن میں اسلامیات کی ابنِ خلدون چیئر کے عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان میں بیوروکریسی کا حصہ رہے ہیں۔ انہوں نے بھی کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ انہیں مغربی دنیا میں اسلامی دنیا کے معاملات و مسائل پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ امریکی لیڈرشپ اسلامی ممالک سے متعلق پالیسیاں بنانے میں ان سے مشاورت کرتی رہتی ہے۔ وہ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہیں دستاویزی فلمیں بنانے سے بھی شغف ہے اور انہوں نے بابائے قوم پر ایک یادگار فلم بھی بنائی تھی۔ وہ صفِ اول کے امریکی تھنک ٹینک بروکنگز انسٹیٹیوٹ کے فیلو بھی ہیں۔ صحافت اور ابلاغ کے شعبے میں احمد رشید کا نام اہم ہے۔ وہ ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے فٹز ولیم کالج سے وابستہ رہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں وہ انقلابی سوچ رکھتے تھے۔ انہوں نے بلوچستان کے پہاڑوں سے ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے خلاف باغیانہ تحریک بھی چلائی

لیکن بعد میں وہ مسلح جدوجہد سے مایوس یا تائب ہو گئے ۔انہوں نے صحافت کو ذریعہء اظہار بنایا۔ وہ بی۔بی۔سی، سی۔این۔این، وال سٹریٹ جنرل، فار ایسٹ اکنامک ریویو، ڈیلی ٹیلی گراف جیسے ممتاز ذرائع ابلاغ سے منسلک رہے ہیں۔ وہ عراق پر امریکی حملے کے ناقد کے طور پر بھی معروف ہوئے۔

قانون اور سیاست کے حوالے سے موجودہ دور کا ایک اہم نام اعتزاز احسن ہے۔ جناب اعتزاز احسن ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں گورنمنٹ کالج اور ایچی سن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیمبرج چلے گئے۔ وہ ڈاوننگ کالج کے ساتھ منسلک رہے۔انہیں اس کالج کا اعزازی فیلو ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ اگر چہ وہ میدانِ سیاست میں کئی معرکے سر کر چکے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا سب سے اہم تعارف، گذشتہ دور میں معزول عدلیہ کی بحالی ہے۔ عدلیہ بحالی تحریک میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب جدوجہد کرنے والے اکثر حلقے،اس تحریک کی کامیابی کے حوالے سے متذبذب ہو گئے لیکن اعتزاز احسن کی جدوجہد جاری رہی اور بالآخر وہ عدلیہ بحالی کے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ قانون کے حلقوں کا ایک معتبر نام جسٹس (ریٹائرڈ) ناصر اسلم زاہد ہیں۔ وہ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ سٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین کے صاحبزادے ہیں۔انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے۔کیا۔ وہ قانون کی تعلیم کے سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی کے فٹز ولیم ہاؤس تشریف لے گئے۔ قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، وہ پاکستان آ گئے۔اور وکالت کی پریکٹس کرتے رہے۔ بعد میں وہ سندھ ہائیکورٹ کے جسٹس اور چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ وہ سپریم کورٹ آف پاکستان میں جسٹس کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ان کی شہرت ایک ماہر قانون اور ایماندار جسٹس کی ہے۔ایک ایسا جسٹس جو حکمرانوں کے عتاب اور جزا کی پرواہ کئے بغیر انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔انہوں نے گذشتہ حکومت میں پی۔سی۔او کے تحت حلف نہ اٹھا کر عدلیہ کے حلقوں کے لئے ایک شاندار مثال قائم کی۔ وہ آجکل ہمدرد یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ڈین کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

ایک روز کیمبرج یونیورسٹی کے پاکستانی طلباء و طالبات کی انجمن نے ناشتے کی دعوت کا

UrduDost Library UrduDost.com

اہتمام کیا۔ہمیں بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔اس تقریب میں شرکت کے لئے سرما کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح، یعنی دوپہر بارہ بجے، ہم سڑکوں پر پڑی برف کوروندتے، پھسلتے، گرتے، سنبھلتے ہوئے سائیکل پرسوار دریائے کیم پرواقع جیسس لاک پہنچے۔دریا پر موجود پُل، سائیکل سے اتر کر، عبور کیااور جیسس گرین نامی وسیع میدان میں داخل ہوئے۔میدان کے فٹ پاتھ نمارا ستے کوسائیکل چلاتے ہوئے عبور کیا۔سردی اسقدر شدید تھی کہ موٹی اونی پتلون، جیکٹ، کنٹوپ اور دستانے پہننے کے باوجود کانپ رہے تھے۔جیسس گرین میں گھاس پر تین چار انچ موٹی برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہ ایک قابلِ دید نظارہ تھا۔سردی سے کانپنے کے باوجود جی یہی چاہتا تھا کہ یہیں رک جائیں اور موسم اور تاحدِ نظر پڑی برف سے لطف اندوز ہوں۔لیکن زکام اور نمونیا کا خوف بھی کچھ کم ستم گر نہیں ہوتا۔نمونیا تو خیر ایک سکہ بند بیماری ہے،لیکن زکام کی تباہ کاریوں سے کوئی صاحبِ زکام ہی آگاہ ہوسکتا ہے۔اور ہماری صورتِ حال تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی زکام زدہ دوست ای۔میل بھی کرے تو محض اِسی کے توسل سے زکام لاحق ہوجاتا ہے۔تو ہم نے جیسس گرین میں اتنا ہی وقت گزارا جہاں پر زکام کی 'تھریش ہولڈ' ہوسکتی تھی۔ یہاں سے نکلے تو سامنے ایک تنگ سی گلی ہے جس کا نام پرتگال سٹریٹ ہے۔ہم اپنا سائیکل تھامے اس گلی میں پیدل جارہے تھے کہ ذرا فاصلے پر ایک انگریز جوڑے کوگلی میں کھڑا پایا۔وہ انگریز اور اسکی 'انگریزنی' منہ اوپر کئے ایک گھر کی بالائی منزل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پاس پہنچ کر ہم نے بھی مکان کی بالائی منزل کی طرف دیکھا۔دیکھتے ہی ایک ہائی وولٹیج جھٹکا لگا۔مکان کی بیرونی دیوار پر ایک تختی آویزاں تھی۔جس پر لکھا تھا کہ یہ وہ مکان ہے جہاں علامہ محمد اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء کے دوران قیام پذیر رہے۔ہم تصویرِ حیرت بنے تختی کو بار بار پڑھتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہوش بحال ہوئے تو انگریز جوڑے کواپنی جانب متوجہ پایا۔ پوچھنے لگے،آپ پاکستان سے ہیں۔عرض کیا، جی ہاں۔ کہنے لگے تو پھر یہ گھر تو آپ کے قومی ہیرو کی قیام گاہ رہا ہے۔اگر آپ چاہیں تو دستک دے کر صاحبِ خانہ سے گھر دیکھنے کی استدعا کرسکتے ہیں۔ہم نے اُن کی تجویز سے اتفاق کیا۔دستک دی۔تھوڑی دیر بعد ایک نہایت خوبرو خاتون دروازے پر آئیں۔ہم نے اپنا نام بتایا اور گھر پر لگی ہوئی تختی کے

UrduDost Library UrduDost.com

حوالے سے اپنی کیفیتِ شوق عرض کی۔ خاتون بڑے نستعلیق لہجے میں انگریزی بول رہی تھیں لیکن ان کا چہرہ، خوبروئی کے باوجود، چغلی کھا رہا تھا کہ وہ گوری نسل سے نہیں ہیں۔ پوچھنے لگیں، آپ پاکستان سے ہیں۔ جواب دیا، جی۔ آپ نے درست پہچانا ہے۔ اس لمحے ہم پر گہری مشرقیت چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے ہمیں کیا سوجھی۔ بغیر سوچے سمجھے دریافت کیا۔ کیا آپ بھی پاکستان سے ہیں۔ جواباً مسکرائیں اور گویا ہوئیں۔ میں تو انگلینڈ میں ہی پیدا ہوئی تھی، البتہ میرے ڈیڈی پاکستان سے ہیں۔ ہمیں ایک خوشی محسوس ہوئی۔ ہم نے جھٹ اپنا مدعا بیان کیا کہ ہم گھر کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت خوش ہوئیں۔ گرمجوشی سے اندر لے گئیں۔ پورے گھر میں قالین بچھا ہوا ہے۔ بیرونی دروازے کے سامنے ایک پتلی سی گلی ہے۔ جس کے آخر میں بالائی منزل پر جانے کے لئے سیڑھی بنی ہوئی ہے۔ گراونڈ فلور پر آگے پیچھے دو کمرے ہیں۔ پہلا کمرہ چھوٹے سائز کا ہے۔ جس میں سنگل بیڈ پڑا ہوا ہے، یہ گیسٹ بیڈ ہے۔ پچھلا کمرہ نسبتاً کشادہ ہے۔ اسمیں ڈبل بیڈ، وارڈ روب، کتابیں۔ دو کرسیاں، ایک چھوٹی میز پڑی ہوئی ہے۔ یہ صاحبِ خانہ کا بیڈ روم ہے۔ اس گھر میں ایک تہہ خانہ بھی ہے۔۔ خاتونِ ہمیں تہہ خانہ دکھانے لگیں۔ جہاں کچن اور ڈائننگ ٹیبل سلیقے سے پڑے ہوئے ہیں۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل لے آئیں۔ ساتھ ہی انہوں نے بلند آواز میں پکارا ’جان‘۔ ایک ادھیڑ عمر کا انگریز سامنے آ دھمکا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ گورا نہایت تپاک سے ملا۔ بالائی منزل میں ایک کمرہ ہے جسے سٹڈی روم اور فیملی لاؤنج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسمیں صوفے پڑے ہیں۔ الماریاں کتابوں سے لدی ہوئی ہیں۔ خاتون خانہ نے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا اور اپنا تعارف کروانے لگیں۔ میرا نام اقصیٰ ہے۔ پورا نام اقصیٰ ڈار ہے۔ میں مانچسٹر میں پیدا ہوئی۔ میرے ڈیڈی گوجرانوالا سے ہیں۔ میں یہاں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہوں۔ جب آپ نے دستک دی تو میں اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے کی پروف ریڈنگ کر رہی تھی۔ برا نہ مانئے گا، مجھے علامہ اقبال کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ غالباً وہ شاعر تھے اور شائد فلسفی بھی۔ اچھی طرح سے معلوم نہیں ہے۔ لیکن میرے ڈیڈی علامہ اقبال سے خوب آگاہ ہیں۔ ان کے شعر بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی کہتے ہیں، تم بھی

UrduDost Library UrduDost.com

پڑھا کرو مگر فی الحال میں مصروف ہوں۔ پی۔ایچ۔ڈی کے بعد پڑھوں گی۔دراصل میں اس گھر میں کرائے پر رہتی ہوں۔کئی مرتبہ آپ کی طرح ، باہر لگی ہوئی تختی پڑھ کر لوگ اندر آجاتے ہیں۔دراصل یہ گھر اب تقسیم ہو چکا ہے۔پہلے ساتھ والا گھر بھی اسی میں شامل تھا لیکن اب درمیان میں دیوار بنا کر اس کو دو گھروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔۔۔اوہ، میں جان کا تعارف کروانا بھول گئی۔ یہ میرے دوست ہیں۔آکسفورڈ میں رہتے ہیں۔اب جان بھی شریک گفتگو ہوا۔علامہ اقبال کو اقصیٰ سے زیادہ جانتا تھا۔اور پاکستان کو اس سے بھی زیادہ۔پاکستان کے مشاہیر کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔آپ 'لنکنز ان' بھی گھوم کر آئیں۔مسٹر جناح وہیں پڑھے تھے۔اس نے ہمیں مشورہ دیا، جس سے ہمیں بھی اتفاق تھا۔کہنے لگا۔آپ آکسفورڈ کے بارے میں بھی لکھیں۔ دراصل آکسفورڈ سیاستدانوں، شاعروں، دانشوروں، اور بادشاہوں کی درسگاہ رہی ہے۔۔۔اور کیمبرج سائنسدانوں کی، ہم نے لقمہ دیا۔۔۔اور باغیوں اور منحرفوں کی بھی، اس نے جواب لِقمہ سے نوازا۔

کیمبرج میں حضرت علامہ اقبال کی قیام گاہ

UrduDost Library UrduDost.com

حضرت علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو کیمبرج پہنچے۔ ان کے کیمبرج آنے کا بنیادی مقصد تعلیم حاصل کرنا تھا۔ ان کے ایک بے حد شفیق استاد تھے جنہیں اقبال کے جاننے والے آرنلڈ کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ان کا پورا نام تھامس واکر آرنلڈ تھا۔ وہ ۱۸۶۴ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ لندن سکول سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد، وہ کیمبرج یونیورسٹی کے ماڈلین کالج پڑھنے کے لئے آئے۔ برطانیہ سے تعلیم کی تکمیل کے بعد، وہ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں بطور استاد فرائض انجام دینے لگے۔ ان کا شمار سر سید کے رفقاء میں کیا جاتا ہے۔ وہ شبلی نعمانی کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ بعد ازاں، وہ علی گڑھ سے لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ حضرت علامہ کے علاوہ سلمان ندوی کے بھی استاد تھے۔ اپنے گورنمنٹ کالج کے قیام کے دوران، اقبال کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تھے۔ اور وہ استاد کے علاوہ علامہ کے دوست بھی تھے۔ علامہ نے آرنلڈ کے صحبت سے بہت کچھ سیکھا اور وہ اس کا اعتراف بھی کیا کرتے تھے۔ بعد میں آرنلڈ لندن یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ وہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے علامہ کو مغربی فلسفہ سے متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی آرنلڈ تھے جنہوں نے علامہ کی کیمبرج میں رہائش کا بندوبست ۱۷۔ پرتگال سٹریٹ پر کیا تھا۔ علامہ نے فرمائش کی تھی کہ اُن کی رہائش گاہ پر ذبیحہ گوشت کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس بناء پر انہیں ایک یہودی گھرانے میں رہائشگاہ لے کر دی گئی تھی کیونکہ یہودی ذبیحہ گوشت کھاتے ہیں۔ علامہ کے اپنے لینڈ لارڈ اور میزبان کے ساتھ بڑے عمدہ دوستانہ مراسم رہے۔ گاہے، علامہ اپنے میزبانوں کے ساتھ یہودی مذہب اور اسلام کے بارے میں گفتگو بھی کرتے۔ وہ یہودیوں کے ساتھ نماز بھی ادا کر لیتے۔ اُن کی ایک عادت اُن کے میزبانوں کے لئے حیرت کا باعث تھی۔ وہ جب ٹائلٹ جاتے تو اپنے ہمراہ ایک لوٹا بھی لے جاتے۔ ایک دن ان کی میزبان یہودی خاتونِ خانہ نے تجسس سے تنگ آ کر بالآخر اس حرکت کی وجہ پوچھ ہی لی۔ جواباً علامہ نے وضاحت کی کہ مسلمانوں کے ہاں پاکیزگی کے لئے ٹائلٹ پیپر کا استعمال کافی نہیں ہے۔ بلکہ پانی کا استعمال ضروری ہے۔ اس لئے وہ پانی بھرنے کے لئے

UrduDost Library UrduDost.com

لوٹا استعمال کرتے ہیں۔۔۔وقت بدلنے کے ساتھ اب یہ ہوا ہے کہ لوٹے کو کٹڑ ملاؤں کو طنز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔حالانکہ اسی لوٹے کا استعمال علامہ جیسے وسیع المشرب بھی کرتے تھے۔ٹائلٹ پیپر ہماری تہذیب اور مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ہمیں اپنے ملک سے باہر قیام میں جن چیزوں سے چڑ ہے۔ٹائلٹ پیپر اُن میں سرفہرست ہے۔ہمارے ہم وطن اکثر گوروں اور دوسرے غیر مسلموں کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ ٹائلٹ پیپر استعمال کرتے ہیں اور صفائی کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے لیکن کیا ہمارے مذہب اور تہذیب میں صفائی کا تصور صرف ٹائلٹ اور لوٹے تک ہی محدود ہے۔اگر صفائی کے ظاہری اور لفظی مفہوم پر بھی اصرار کیا جائے، تب بھی یہ ایک وسیع چیز ہے۔ہم گوروں کو گندا رہنے کے طعنے دیتے ہیں۔لیکن ہمارے وطن کا شائد ہی کوئی گلی محلّہ ایسا ہو جسے غلاظت سے پاک کہا جا سکے۔ہم سارا زور لوٹے والی طہارت پر ہی کیوں دیتے ہیں۔گندگی کے ڈھیر،ابلتے ہوئے گٹر،گندے پانی کے جوہڑ۔۔۔کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت علامہ اور ان کے میز بانوں کے تعلقات اتنے اچھے نہ رہے۔۔۔اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ علامہ کرایہ ادا نہیں کرتے تھے یا بلند آواز میں موسیقی سنا کرتے تھے۔۔۔ہوا یہ کہ حضرت کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔وہ اپنے میز بانوں کو پیسے دیتے اور میز بان بازار سے وہ چیز لا کر انہیں دے دیتے۔کچھ دیر بعد علامہ پر یہ راز کھلا کہ ان کے یہودی میز بان جب بازار سے کوئی چیز لاتے ہیں تو اس میں سے کمیشن رکھ لیتے ہیں۔یہودیوں کو ہر معاملے میں کاروبار اور منافع خوری کا چسکا ہوتا ہے۔اس بات پر علامہ کا دل کھٹا ہو گیا۔

علامہ نے کیمبرج میں رہ کر فلسفہ پر تحقیق کی۔وہ کیمبرج کے ٹرینیٹی کالج سے وابستہ تھے۔ اپنی تعلیم و تحقیق کے دوران، وہ جن مضامین پر زیادہ توجہ دیتے۔ان میں عربی، فارسی، فلسفہ اور معاشیات شامل ہے۔انہوں نے ہیگل اور کانٹ جیسے سکالرز کی فکر کو بھی اپنے قیامِ کیمبرج میں ہی پڑھا تھا۔عربی و فارسی کے مشہور استاد پروفیسر براؤن اور نکلسن ،اُس زمانے میں کیمبرج میں پڑھاتے تھے۔علامہ نے ان سے بھی اکتساب کیا۔نکلسن کے ساتھ اُن کا تعلق آرنلڈ کی طرح دوست کا بن گیا تھا۔بعد میں نکلسن نے ہی علامہ کے مجموعہ 'اسرار خودی' کا انگریزی میں ترجمہ کیا

UrduDost Library UrduDost.com

تھا۔ قیامِ کیمبرج میں علامہ کے ایک استاد کا نام میک ٹیگرٹ تھا۔ علامہ اُن سے تصوف پر بحث کیا کرتے تھے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ وہ میک ٹیگرٹ سے تصوف کے اسرار سیکھا کرتے تھے۔ علامہ اپنے قیامِ کیمبرج میں اپنی پڑھائی میں منہمک رہے۔ ان کے دوست فوق نے اسی زمانے میں ایک رسالہ چھاپنا شروع کیا تھا۔ اوران سے درخواست کی کہ وہ رسالے کے لئے اپنا مضمون بھیجیں۔ انہوں نے جواباً کہا کہ میں پڑھائی میں اسقدر مصروف ہوں کہ مضمون لکھنے کے لئے وقت ہی نہیں بچتا۔ البتہ شاعری ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ کبھی ارادتاً اور کبھی فی البدیہ شعر موزوں ہوتے رہتے۔ پارٹیاں، موسیقی، علمی موضوعات پر مباحثے، فقرے بازی، چٹکلے، مزاح بلکہ طنز۔ یہ سب کچھ وہ چاہتے تو بھی نہ چھوڑ سکتے تھے۔

علامہ نے ۱۹۰۷ء میں شعبہ فلسفہ واخلاقیات میں اپنا مقالہ پیش کیا جس پر انہیں بی۔ اے کی ڈگری دی گئی تھی۔ علامہ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تحقیق کا موضوع 'ایران میں فلسفہ مابعدالطبیعات کا ارتقاء' تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر تحقیق کیمبرج میں کی لیکن اپنا مقالہ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ علامہ کیمبرج سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اہل نہیں تھے۔ بلکہ اُن کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی منصوبہ بندی ہی ایسی تھی کہ وہ تحقیق کیمبرج میں کرتے اور امتحان دینے اور ڈگری لینے کے لئے میونخ یونیورسٹی سے رجوع کرتے۔۔ اسی زمانے میں علامہ نے تصوف کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی غرض سے خواجہ حسن نظامی کو ایک خط لکھا تھا۔ جس میں استدعا کی تھی کہ قرآن مجید میں تصوف کے حوالے سے جتنی بھی آیات اور دوسرا مواد آپ کے علم میں ہیں، وہ مجھے لکھ بھیجیں۔ انہوں نے اپنے قیام کیمبرج میں لندن کے مشہور 'لنکنز ان' میں بارایٹ لاء کرنے کے لئے بھی رجسٹریشن کروارکھی تھی۔ یہ وہی ادارہ ہے جس میں بابائے قوم نے اس لئے داخلہ لیا تھا کہ اس میں جنابِ ختمی مرتبت ﷺ کا نام نامی اسم گرامی بطور قانون دان موجود تھا۔ بارایٹ لاء کرنے کے لئے امتحانات دوحصوں میں منعقد ہوتے ہیں۔ علامہ نے پہلے مرحلے کے امتحانات کیمبرج میں اپنے قیام کے دوران ہی دیے تھے جبکہ دوسرے حصے کے لئے وہ لندن منتقل ہوگئے تھے۔ بارایٹ لاء کرنے کے لئے لنکنز ان میں کلاسز پڑھنا لازمی نہیں

UrduDost Library UrduDost.com

ہوتا۔ تاہم وہاں کچھ عرصہ قیام ایک لازمی شرط ہے۔ اس قیام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ امیدواران کو اس ادارے کے عشائیوں میں شرکت کرنا لازمی ہوتا ہے۔ علامہ بھی اِن عشائیوں میں شرکت کرنے لندن جایا کرتے تھے۔۔۔ سائنسی مضامین پڑھنے والے سٹوڈنٹس بلاوجہ باقی طلبا و طالبات پر رشک نہیں کرتے۔ بارایٹ لاء کرنے کے لئے عشائیے میں شرکت کرنا دراصل نصاب پڑھنا ہے۔ تو پھر قانون کے سٹوڈنٹس عیاشی کے لئے کیا کرتے ہیں۔۔۔

علامہ کے قیامِ کیمبرج کے دوران معروف سکالر سید علی بلگرامی کیمبرج یونیورسٹی میں استاد تھے۔ علامہ کے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے اور وہ اکثر ان کے ہاں جایا کرتے۔ بلگرامی اور ان کی اہلیہ نہایت ملنسار تھیں۔ ان کے ہاں، ہندوستان سے تعلق رکھنے والے سبھی سٹوڈنٹس آیا کرتے اور وہ سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ بلکہ یوں ہوتا کہ سارا دن ایک جاتا تو دوسرا چلا آتا۔ یورپ میں ایک عام طریقہ یہ ہے کہ سب لوگ چھٹیوں کے دوران دوسرے یورپی ملکوں میں گھومنے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس لئے ممکن ہے کہ یورپی مما لک کا ایک دوسرے سے فاصلہ کم ہے اور ایک ملک سے دوسرے میں جانا بالکل مہنگا نہیں ہوتا۔ علامہ کے بارے میں فرزندِ علامہ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے قیام کیمبرج کے دوران کسی دوسرے یورپی ملک نہیں گئے اور شائد اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں تھے۔ البتہ ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ دورانِ تعطیلات وہ اپنے ایک انگریز ہم سبق کے ہمراہ اس کے گاؤں، جو سکاٹ لینڈ کے کسی دور افتادہ علاقے میں تھا، تشریف لے گئے۔ وہاں ایک دن انہیں خبر ملی کہ کوئی مشنری ہندوستان سے واپس آئے ہیں اور مقامی ہال میں ہندوستان کے بارے میں ایک لیکچر دیں گے۔ علامہ بھی اپنے انگریز دوست کے ساتھ لیکچر سننے چلے گئے۔ انگریز پادری نے لیکچر میں کہا کہ ہندوستان میں رہنے والے لوگ اسقدر پسماندہ ہیں کہ وہ انسان کے درجے سے نہایت پست اور جانوروں سے ذرا سا بلند ہیں۔ ان ہندوستانی انسانوں یا جانوروں کو انسانی تہذیب تک لانے کے لئے بے حد محنت کی ضرورت ہے جو بلاشبہ وسائل کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے حاضرین سے التماس ہے کہ وہ اس عظیم کام کے لئے چندہ دیں۔ لیکچر کے ساتھ ہی اس نے بڑی سکرین پر ہندوستان کے انتہائی پسماندہ

UrduDost Library UrduDost.com

علاقوں کے جنگلی جانور نما انسانوں کی تصاویر بھی دکھائیں تا کہ حاضرین کو معاملے کی شدت کا احساس ہو۔لیکچر ختم ہوا تو علامہ نے پادری کا بھری محفل میں انگریزی زبان میں جواب دیا۔ فرمانے لگے۔میں ہندوستان سے ہوں۔میں آپ کی طرح انگریزی بول رہا ہوں۔میری وضع قطع بھی آپ ہی جیسی ہے۔آپ ہندوستان کے کسی شہر جائیے۔آپ کو میری طرح کے انسان ہی ملیں گے۔یہ کہنا بالکل لغو ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے لوگ جانوروں جیسے ہیں۔علامہ کی اس تقریر نے حاضرین پر اثر کیا اور انہوں نے انگریز پادری کو چندہ نہ دیا۔۔اسے ہی رنگ میں بھنگ ڈالنا کہتے ہیں۔۔۔

اگر آپ علامہ کے قیام یورپ سے واقف ہیں تو یقیناً آپ کھوج میں ہوں گے کہ ہم کچھ چیزیں چھپا رہے ہیں۔لیجئے،سن لیجئے۔۔۔عطیہ فیضی۔۔۔جی بیگم عطیہ فیضی کے خاندان کا تعلق بمبئی سے تھا لیکن انکی پیدائش استنبول میں ہوئی تھی۔وہ ۱۹۰۶ء میں لندن پڑھنے کے لئے آئی تھیں۔انہوں نے فرانس،اٹلی،جاپان،چین کی سیاحت بھی کی۔آج کے دور میں یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔لیکن ایک صدی پیشتر ایک ہندوستانی خاتون کی یہ سیاحت ایک غیر معمولی واقعہ تھی۔ انہیں علوم وفنون سے بے حد دلچسپی تھی۔بڑی پُرکشش شخصیت کی حامل تھیں۔انہی خصوصیات کی بناء پر علامہ کے ان کے ساتھ مراسم استوار ہوئے تھے۔یہ مراسم دوستانہ تھے یا محبوبانہ۔اس پر علامہ کے جاننے والے حلقوں میں بہت لے دے ہوئی ہے۔لیکن چسکا لینے والوں کے ہاتھ کچھ نہیں لگا۔علی گڑھ کالج کے ایک پرنسپل کا نام بیک تھا۔ان کی بہن مس بیک لندن میں رہتی تھیں۔ وہ ہندوستان سے آنے والے طلباء وطالبات سے بڑی شفقت سے پیش آتیں۔ان کے ہاں ایک تقریب میں علامہ کی ملاقات عطیہ سے ہوئی تھی۔علامہ کے علم وفضل اور حاضر جوابی سے عطیہ متاثر ہوئیں۔علامہ نے انہیں کیمبرج آنے کی دعوت دی۔اُن دنوں میں علامہ لندن میں تھے۔چند روز کے بعد عطیہ نے بھی علامہ کو عشائیے کے لئے مدعو کیا۔دعوت میں چند انگریز لڑکے لڑکیاں بھی آئیں۔موسیقی بھی ہوئی اور علامہ نے فی البدیہ مزاحیہ اشعار بھی سنائے۔پھر علامہ کیمبرج واپس آ گئے۔چند دنوں کے بعد عطیہ کو لندن سے کیمبرج لینے پھر گئے۔واپسی پر شیخ عبدالقادر بھی ہمراہ

UrduDost Library UrduDost.com

آئے۔مہمانوں نے قیام حضرت بلگرامی کے ہاں کیا۔ چند ماہ بعد آرنلڈ نے دریائے کیم کے کنارے ایک دعوت کا انتظام کیا جس میں کئی اہلِ علم مدعو کئے گئے۔عطیہ فیضی اس دعوت میں بھی تشریف لائیں۔ یہاں موت و حیات پر بحث چھڑ گئی۔سب نے اپنی اپنی رائے دی مگر علامہ خاموش رہے۔۔۔عطیہ موجود تھیں، نجانے گفتگو سن بھی رہے تھے یا نہیں۔۔۔کسی نے علامہ کو چھیڑا کہ آپ نے کوئی رائے نہیں دی۔فرمایا۔حیات موت کی ابتداء ہے اور موت حیات کی۔بس اسی جملے پر بحث تمام ہوگئی۔۱۹۰۷ء کے وسط میں علامہ اپنی تحقیق مکمل کر چکے تو کیمبرج سے لندن منتقل ہوگئے تھے۔وہاں ان کی عطیہ فیضی سے ملاقاتیں معمول بن گئیں۔پھر علامہ جرمنی تشریف لے گئے۔کہتے ہیں کہ علامہ نے جو وقت جرمنی میں گزارا، اس میں جتنا وہ خوش رہے شائد زندگی کے کسی اور حصے میں نہیں رہے۔انہوں نے عطیہ فیضی کو جرمنی آنے کی دعوت دی۔اور عطیہ انہیں وہاں ملنے بھی گئیں۔کچھ عرصہ بعد علامہ ہندوستان چلے گئے۔ان کے بعد ان کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی فلسفہ میں ہی کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی اور ۱۹۵۶ء میں لنکنز ان سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔کیمبرج میں آج بھی علامہ کی خوشبو آتی ہے۔

UrduDost Library UrduDost.com

ضمیر نقوی کی نوکِ قلم جدید ہے، مگر روشنائی کلاسیکیت میں گندھی ہے۔ نقوش نئے مگر رنگ ابدی اور لافانی — اُس کی روداد میں تہذیب، تمدن، تعلّم، تکلّم، بناوٹ اور لگاوٹ کے نئے مظاہر سے روشناسی کے سمے، بکھرتی، بچھڑتی روایات چلمن کے پیچھے کھڑی نظر آتی ہیں۔

جاوید اقبال اعوان

نگہِ دیدۂ تصویر

کلاسیک
42- دی مال، لاہور

اے جے کے لندن

لندن

علم و ہنر کا شہر،
تہذیب وثقافت کا میوزیم،
رنگ ونسل کا گلدستہ، بے مثال
انجینئرنگ کا شہکار، تجارت، صنعت اور
سیاست کا مرکز، [illegible] کا آئینہ

اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جسے پڑھ کر آپ

UrduDost Library
UrduDost.com